

میں اعلیٰ درجے کا شاعر نہیں ہو سکتا۔ بے شک انکا ایسا سمجھنا یورپ کی شاعری کے لحاظ سے بالکل صحیح معلوم ہوتا ہے کیونکہ یورپ کی شاعری درحقیقت نیچر کی ترجمانی ہے۔ اسکا میدان اُسی قدر وسیع ہے جس قدر نیچر کی فضا۔ اس کے فرائض مادری زبان کے سوا دوسری زبان میں جیسے کہ چاہئیں۔ ادا نہیں ہو سکتے؛ بلکہ ایشیائی شاعر جو اس طریقہ شاعری سے نااہل ہیں وہ اپنی مادری زبان میں بھی اسکی مشکلات سے عہدہ برا نہیں ہو سکتے۔ بخلاف ایشیائی شاعری اور خاص کر متاخرین کی فارسی شاعری کے کہ یہاں انھیں معمولی تیالات کو جو قدما سیدھے سادے طور پر بیان کر گئے ہیں نئے نئے اسلوبوں اور نئی نئی تراکتوں کے ساتھ باندھنا یہی کمال شاعری سمجھا جاتا ہے۔ اگرچہ یہ بھی فی نفسہ ایک بڑا کمال ہے لیکن ایسی شاعری میں زبان کا صرف ایک محدود حصہ مستعمل ہوتا ہے جبکہ غیر زبان والا آسانی سے سیکھ سکتا ہے اور بشرطیکہ اُنہیں شاعری کی اعلیٰ قابلیت ہو اسکو شعرا کے اہل زبان کی طرح بلکہ بعض صورتوں میں اُن سے بہتر استعمال کر سکتا ہے۔

مرزا کا موازنہ نظیری و عوفی کے ساتھ صرف قصیدے اور غزل میں ہو سکتا ہے؛ کیونکہ مشنوی میں نظیری محض صغریٰ آسنے اس صنف کو چھوڑا گیا نہیں۔ عوفی نے بیشک چند مثنویاں لکھی ہیں؛ مگر صاحب آتشکدہ نے اُن میں سے صرف ایک کی نسبت لکھا ہے کہ ”دوبہ نگشتہ است“ اور باقی کی نسبت اسکا یہ قول ہے کہ ”بسیار بد گفتہ“ حکیم جام کا بیٹا حکیم حاوق عوفی کی مثنوی کی نسبت لکھتا ہے۔

یہ نسبت اہل زبان کے، ایک کم علم بہ نسبت فاضل متبحر کے، اور ایک دیہا
 بہ نسبت خواص اہل شہر کے برابر تہ افضل اور اعلیٰ درجے کی رکھتا ہو۔ دوسرے
 اگرچہ بظاہر اہل زبان کے ساتھ مخصوص معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اُس میں بھی مثلاً
 ہندی نثر اور اکتساب کے ذریعے سے خاص کر اُس حصہ زبان میں جو فارسی کی محاور
 شاعری میں مستعمل ہے اہل ایران کی برابری کر سکتا ہے۔ علامہ ابن خلدون عربی
 کی نسبت۔ جو بقاء فارسی کے نہایت وسیع زبان ہے۔ لکھتے ہیں کہ وہ ایک عجیب و
 غیر عربی (غیر عربی) فصحاے عرب کے کلام کی مہارت سے اہل زبان میں شمار ہو سکتا ہے۔
 پس فارسی زبان جو نسبت عربی کے نہایت تنگ اور مختصر زبان ہے اس بات۔
 زیادہ قابل ہے کہ ایک ہندی نثر اور فصحاے ایران کے کلام کی مزا و امت سے اہل زبان
 میں شمار کیا جائے۔

مذکورہ بالا اصول کے موافق کچھ شک نہیں کہ ہم اس بات کا حق رکھتے ہیں کہ
 کو ملکہ شاعری کے لحاظ سے اکیڑی دورے کے تمام شاعروں پر ترجیح دیں یا ان سے
 کم سمجھیں یا ان کے برابر قرار دیں۔ یہی دوسری لیاقت سوائے نسبت پہلے حصے میں جا بجا
 کیا گیا ہے کہ مرزا نے ایک نہایت مستند صاحب زبان کی تعلیم و تلقین اور اپنے ذاتی مختصر
 اور کثرت مطالعہ اور خواصی فکر اور شوق سخن اور خاص کر اپنی خدا داد لٹریچر قابلیت سے
 یقیناً وہ مرتبہ حاصل کر لیا تھا جس سے ایک زبان دان مثل اہل زبان کے مستند سمجھا جاسکتا
 لاڑ و مکالمے نے اس باب میں جو کچھ لکھا ہے اُس سے پایا جاتا ہے کہ کوئی شخص غلام و نو

ذوق و وجدان کے سوا کوئی چیز اسکا فیصلہ نہیں کر سکتی۔ یہاں ذوا و سوال پیدا ہوتے ہیں؛ اول یہ کہ ایک زبان ان آدمی شاعری میں اہل زبان کے برابر ہو سکتا ہے یا نہیں؟ دوسرے یہ کہ ایک پیر و اپنے پیشروں کے ساتھ مساوات کا درجہ حاصل کر سکتا ہے یا نہیں؟ سو دوسرے سوال کا جواب تو بالکل صاف ہے۔ دنیا میں ابتداء سے آج تک نہ صرف شعر و شاعری میں بلکہ ہر علم اور ہر فن اور ہر پیشہ میں اکثر پیر و اپنے پیش روؤں کے صرف برابر ہی نہیں بلکہ ان سے فائق اور افضل ہوتے رہے ہیں۔ فردوسی رزمیہ شہنوی میں اسدی اور دہقانی کا پیرو ہے؛ مگر دونوں سے گوے سبقت لے گیا ہے۔ خواجہ حافظ غزل میں سعدی کے قدم بقدم چلے ہیں مگر سعدی سے بہت آگے نکل گئے ہیں۔ قافانی قصیدے میں تمام قدما سے بڑھ گیا ہے۔ میر تقی نے تمام اگلے رنجتہ گوئیوں کو۔ جو یقیناً اسکے پیش رو تھے۔ غزل میں اپنے سے بہت پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ میر انیس تمام مرثیہ گوئیوں کے۔ جو ان سے پہلے ہوئے۔ بازی لے گئے ہیں۔ پس اگر مرزا غالب کو فارسی شاعری میں نظیری و عرفی سے افضل نہیں بلکہ صرف ان کا ہم پلہ قرار دیا جائے تو اس میں کون سی تعجب کی بات ہے۔

رہا پہلا سوال سو ظاہر ہے کہ شاعری کا ہنر دو مختلف یا قوتوں سے مرکب ہے؛ ایک مخیضہ یعنی قوت تخیل کی بلند پروازی، دوسرے مناسب الفاظ کے استعمال پر قدرت۔ انہیں سے پہلی لیاقت۔ جیسا کہ ظاہر ہے۔ ممکن ہے کہ ایک زبانداں

طرز اختیار کی۔ ظاہر ہے کہ ایک ہندی تراذ شاعر۔ جو ایسے ناپرسا زمانے میں پیدا ہو
اور جس نے فارسی شاعری میں نظیری و عرفی وغیرہ کے کلام سے بہتر کوئی ممکن انقلاب
نمودہ نہ دیکھا ہو۔ وہ سوا اسکے کہ ان کا اتباع اختیار کرے اور کیا کر سکتا تھا۔ یہی بات ا
سنے اس طرز شاعری میں کس قدر کامیابی حاصل کی ہے اور ان لوگوں کی پیروی
کا کہاں تک حق ادا کیا ہے۔ سوا اسکو اس طرح ثابت کرنا تو ناممکن ہے جیسے دو اور ذرا
چار؛ البتہ جو لوگ شعر فارسی کا صحیح مذاق رکھتے ہیں وہ اکبری دورہ کے شعرا اور مرزا
کے کلام کا مقابلہ کرنے کے بعد امید ہے کہ مرزا کی اعلیٰ درجے کی قابلیت و استعداد
کا اعتراف کریں گے اور اس بات کو تسلیم کریں گے کہ زمانے کا اقتضا اور سوسائٹی کا دباؤ
شخص کو جس روش پر ڈال دیتا وہ ضرور انہیں کامیاب ہوتا۔ چنانچہ اخیر عمر میں جب
حبیب قاآنی کے قصائد مرزا کی نظر سے گزرے تو اسکے کلام کی روانی اور بیباختہ
دیکھ کر انکو قاآنی کی روش پر چلنے کا خیال پیدا ہوا تھا؛ اور اسی لئے انکے سب سے
پچھلے قصیدوں اور قطعوں میں بہ نسبت پہلے قصائد اور قطعات کے زیادہ روانی
اور بیباختگی پائی جاتی ہے۔ لیکن چونکہ اب دوسری چال چلنے کا وقت نہیں رہا
اس لئے اس روش کی تکمیل ہونی ناممکن تھی۔

اس کتاب میں۔ جیسا کہ ناظرین کو معلوم ہے۔ مرزا کو شاعری کے لحاظ سے جا
نظیری و عرفی وغیرہ کا۔ جنکو خود مرزا اپنا پیش رو تسلیم کرتے ہیں۔ ہم تلخ قرار دیا گیا ہے
سو قطع نظر اسکے کہ کوئی قطعی دلیل اس دعویٰ پر قائم نہیں ہو سکتی، اور ناظرین کے

طبیعت کے اقتضا سے نہ کہ عقل کی نواہد پر سے سرانجام کیا جائے اُس سے لوگوں کو بواسطہ یا بلاواسطہ کسی طرح کچھ فائدہ نہ پہونچے؛ ہوا جو اپنی موج میں چلتی ہے، اور دریا جو اپنے جوش میں بہتا ہے۔ گواں کو خود خیر نہیں کہ ہم کہاں جا رہے ہیں اور کیوں جا رہے ہیں۔ لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ انکی سعی محض بے حاصل اور انکی کوشش سراسر بے سود ہے۔ اسی طرح کوئی ذرہ ذراتِ عالم میں ایسا نہیں جو اپنی اعظاری حرکت سے نظامِ کُلّی میں کچھ نہ کچھ دخل نہ رکھتا ہو۔

اے تو کہ سچ ذرہ را جزیرہ تو دوست
در طلبت تو اں گرفت باد یہ را پر مہی

یادگارِ غالب کو ہمنے دو حصّوں پر منقسم کیا ہے۔ پہلے حصّے میں مرزا کی لائق یعنی انکی زندگی کے حالات اور انکے اخلاق و عادات کا بیان ہے اور دوسرے حصّے میں انکے کلام کا انتخاب ہے۔ اگرچہ مرزا کی لائق میں۔ جیسا کہ ہم بار بار لکھ چکے ہیں۔ کوئی مستمّ بانسان واقعہ انکی شاعری و انشا پر داری کے سوا نہیں پایا جاتا؛ باہمیں انہیں بہت سی مفید نصیحتیں بھی اہلِ وطن کے لئے موجود ہیں۔

ماظرین کو یاد ہو گا کہ مرزا پانچ برس کے تھے جب باپ کا، اور نو برس کے تھے جب چچا کا انتقال ہوا۔ انکی تنہالی۔ جہاں انہوں نے پرورش اور نشوونما پائی۔ اسودہ حال تھی۔ باپ اور چچا کے مہینہ سن چھوڑ جانے سے مانا اور نانی کی لائق اور بھی زیادہ بڑھ گئی ہو گی۔ خود مرزا کی طبیعت میں گرمی اور جودت کی ایک آگ بھری ہوئی تھی جسکے بھڑکانے کے لئے تھوڑی سی اشتعال کافی تھی۔ باپ اور چچا کا

حاشیہ

مرزا غالب مرحوم کی لائف اور اُنکے کلام کا انتخاب جس قدر کہ یہاں اُسکا دکھانا مقصود تھا۔ ختم ہو گیا، مگر ابھی چند ضروری باتیں لکھنی باقی ہیں۔
ہم اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ یہ کتاب اُن تصنیفات میں شمار نہیں ہو سکتی جنکی اصل ملک میں ضرورت سمجھی جاتی ہے؛ اور جو اہل وطن کی موسمی بیماریوں کے لئے براہِ راست دوا اور علاج کا کام دے سکتی ہیں۔ کیونکہ اس مضمون کے لکھنے پر ہکو اس اندھی اور پُری دیوی نے مجبور کیا ہے جسکی زبردستی اور حکومت کے اگے مصلحت اندیشی کے پر چلتے ہیں۔

مسانہ سخن میر سدا ز دل بہ لب ما
عشق ست کہ بر بستہ زبانِ ادب ما
راقم کو مرزا کے کلام کے ساتھ جو تعلق بدو شعور سے آج تک برابریا جاتا ہے اُسکو چاہو اُس معتقدانہ جوشِ غضبیت کا نتیجہ سمجھو جو انسان کو اندھا اور بہرا کر دیتا ہے، اچر ہو اُس یقین کا ثمرہ خیال کرو جو نہایت زبردست شہادتوں سے حاصل ہوتا ہے؛ بہر تقدیر یہی وہ چیز تھی جس نے ہکو اس کتاب کے لکھنے پر آمادہ کیا۔ پس نہ ہکو یہ دعویٰ ہے کہ ہم نے اس تالیف سے پبلک کی کسی بڑی ضرورت کو رفع کیا ہے؛ اور نہ یہ خیال ہے کہ محض نلک کی خیر خواہی اُسکے لکھنے کا باعث ہوئی ہے۔ لیکن یہ ضرور نہیں کہ جو کام محض

اکیرنامه

مهرنخیز

بجای کار دانی رسیدند ملک خود را
 به دو حصه بخش کرد یک نصف را به
 مغل داد و نصف دیگر را بتاتار
 و چون پدر بزرگوار ایشان فوت
 حیات سپرد و فرزندان با یکدیگر
 موافقت نموده هر کدام در ولایت
 خویش خود آرائی می کردند.

هر دورا نیاز پرورد و چون به برنائی رسید قلم و خویش
 را دو نیم کرده نیمه به مغل و نیمه به تاتار نامزد کرد و خود یکصد
 و شصت و هفت سال در گیتی درنگ و در زنده بمانی
 رفتگان برداشت الله اش دایم را نیز چون روز
 فرود رفتگان دیگر روز فرود رفت
 ریزد آن برگ و این گل افشانند
 هم خراش هم بهار در گذرست

اکبر نامہ

مہر نمبروز

و سپا چچی بعد از غلبت پدر
و اشارت عالیش فرماں روا
شد. کیوک خاں فرزند رشید
اوست. پدرش در هنگام پدر
کردن جہاں سریر غانی باو عنایت
فرمود. او قدر سلطنت را دانستہ
و رولوازم آل اہتمام بجای آورد
النجہ خاں پسر اوست و در
آخر عمر پدر و لیعہ شد. داد
داد و دہش را از اندازہ بیرون
برد. و ترکاں در زمان دولت او
مست و دولت شدہ از راہ خوردن
عدول نمودند. و چون بدتے
براں بگذشت اوراد و سپہ
بیک شکم آمد. یکے را مغل
نام کرد و دیگر را تمار. و چون

راہ نعلے تازه آراستہ اما پادشاں دانشوری و دادگری
کہ جز دانش نہ حبست و جز داد نہ کرد. روزنامہ عمرش چیل
رقم یک صد و ہشتاد و شش سالگی پذیرفت و نوشتند،
و بارنامہ کجکلی و گروکشی بنام سپہ فرخ اخترش کیوک خاں
نوشتند. ستودہ ستایش در خور بکار آگاہی آبروی پادشاہی
افزود. و یک صد و چیل سال از مرگ اماں یافت. و فرزند
تا از شاہی نشان یافت جہاز انجوشی و خشنودمی جہانیاں را
بہر و از مرگ نگاہداشت. سر انجام کار جہان و جہانیاں را
بفرزند خویش النجہ خاں گذاشت. بہر دستوری دریا گفت، و
بہریدر بخشی ابر کردار بودہ دہش را برداشتہ داد. و فرودستان
(زیر دستان) را بہ دہش از خواہش بے نیاز ساخت. بسکسراں باو
بروت دینی بہر و غور. از جارتقتند. و از دائرہ کنیش و
لش بدزدند. آراشداد دینی انتظام کنار گرفت،
و بت پرستی صورت پذیرفت. بانوی این فرمانروا کے
باہرگ و نواد و سپہ توام نداد. اورنگ نشین دینی النجہ خاں
یکے را مغل خاں و دیگرے را تمار خاں نام نہاد.

اکبرنامه

تہر تہر دہ

یاد خانہ اختراع کرد، و خرگاه
 پدید آورد. و از پوست بپاشم و سباع
 لباس پوشیدنی و دخت. و نمک در
 زمان او ظاهر شد. و در آئین او آن
 بود که پسر را از شمشیر میراث میدادند
 و تمام خواسته دختر را باشد. و گویند که
 او معاصر کبیر مرث اول بلوک عجم است
 و او اول سلاطین ترکستان است.
 و عمر او دویست و چهل سال بود
 آنچه خاں بہترین فرزندان ترکی
 بود. چون پیانہ زندگی ترکی پریشان
 گرفت. او را بمشورت بزرگان بر
 تخت سلطنت نشاندہ. او خرد
 و ورہیں را پیشواے خود ساخت
 و در عدالت گستری روزگار گذرانید
 چون پیر شد عزت اختیار نمود

بزرگوار و قرار داد آن بود کہ ازاں ہمہ برگ و سار کہ از در
 مردی (میراث) یا از اندر شمشیر پسر نہ ہند و ہمہ بدختہ یا از در
 کہ ہر آئینہ تیغ جوہر دار فرد و ہرست گنجینہ سیم و زر بلکہ کلید فتح
 ہفت کشور است. اگر بریں پلارک الماس گول و دسترس
 ست فرد را دست مایہ نازیں ست. بالجلہ این ہمہ رسم و
 آئین نہاد و پایان کار پس از دویست و چهل سالہ بیداری
 بخوابد عدم سر بر زمین نہاد. بزرگان دودہ پس از یافتن
 او غلام بہ فرزند بخت بلندش الیچہ خاں چشم روشنی
 گفتند. کلکج نہاد و راستی پیشہ گزیدہ ہی پیرامون دلش
 نگذشتہ، و بابدان ہمراہان گشتہ. آزادہ رو بود و دل بیادیراہ
 در گرد داشت. تاج و تیغ و گیس در زندگانی خویش، بہ نو باوہ
 باغ کامرانی خویش و سیاچی خاں جوان بخت نوجوان سپرد
 خواندیں خازنار و امن برچیدہ. و با فرین خانہ کہ توآن را صومع
 گوئی آرمیدہ دو صد و پنج سال پارہ نموداری اقبال پارہ پیاری
 ذوالجلال در جہان گذراں ماند، و ہنگام ناگزیر در گذشتہ
 و سیاچی خاں کہ ہم در نظر گاہ پیرا و رنگ ای بود. و از یک خسروئی

مرزا اور ابو الفضل کی طرزیان کا مقابلہ

مرزا نے مہر نیروز میں اکثر تاریخی واقعات وہی لکھے ہیں جو شیخ کے اکبرنامہ میں مذکور ہیں؛ مگر چونکہ مرزا نے اُن واقعات کو کسی قدر کمی بیشی اور تقدیم و تاخیر کے ساتھ اپنی خاص طرز میں لکھا ہے اس لئے دونو کتابوں کی طرزیان میں بہت فرق پایا جاتا ہے۔ ہم یہاں ایک سیدھا سادہ واقعہ دونو کتابوں سے نقل کرتے ہیں۔

اکبرنامہ

مہر نیروز

ترک بزرگترین فرزند ان یافت بود	ترک ابن یافت نشان جہانگیری یافت و ترکاں ایں
ترکاں اور یافت او غلاں گویند	والا شکوہ را۔ ازاں رو کہ بترکی شہر پار جواں را او غلاں
وہو شیار دلی و کارگزاری و عیت پڑی	گویند۔ یافت او غلاں گفتند۔ داد و دانش آئیں دشت،
از ہنہمہ برادران امتیاز داشت۔	و دریں ہر دو شیوہ روشہا کے گزین دشت۔ خانی و فرزانی
بعد از حلت پدر بخت فرمانروائی	را فرہنگ با پدید آورد، و فرمانہی و فرمانبری را اندازہ
نشت، و داد و مدی و مردانگی و	بر نہاد۔ از تہگاہ سیلول با سلیقا را کہ چشمہ ہاے رواں
مظلوم پرستی داد و در جائے ترکاں	و گل و میوہ فرواں داشت۔ از بہر آراش گزیدہ از نے و
اور اسیلول با سلیکا کی میگفتند، و	علت و چوب و گیاہ نشین با افزائے، و پوست دام و دودرا
چشمہ ہاے آب سرد خوشگوار و گرم	پوشش تن ساختے۔ گویند نمک بر روزگار وے پدید آمد؛
عاقبت بخش و مرغزار ہاے دلکش	ور نہ ازاں پیش ترہ و گوشت پہناں بے نمک ہی خوردند۔
داشت۔ اقامت فرمودہ۔ از چوب	ترکاں شمشیر زن را بقربان فرزانہ شیر افکن (یعنی یافت او غلاں)

خریں

یوسف تانے ست از گل پیرہناں در موج ،
 نگارستانے ست سیمیں بدنانش فوج در فوج ۔
 سہی پکیرا تندر خیابان سطور و شاد و شہ ،
 آنہاں شیوہ دلبر انداز بادۂ ناز گرم نوشا نوش
 نازک بدن اند حجاب پرورد ، گل پیرہنا تندر
 تہا گرد بختہ مقرر اند بر شستہ پوست ،
 بیگانہ نقر اند آشتا دوست ۔ صوفیا تندر
 وحدت خانہ عشق مست سماع ، سوخا تندر
 سپند آسا ست وداع ۔ درویشا تندر
 تہجد و کیش ، فرو کیشا تندر ہمہ در پیش ۔
 سیر صولتا تندر از جوشن خط پلنگینہ پوش ،
 دریا دلا تندر از شورش عشق در جوش و
 خروش ۔ آئینہ پکیرا تندر آئینہ تاب ،
 پاکیزہ گوہر اند کیسہ خوشاب ۔ گلبرگہاے
 شبنم زدہ بہاری ست ، خراشیدہ نالہاے
 بیل شاخسار ست ۔

غالب

چوں پیکر تصویر از حیرت واقعہ خاموش (یعنی
 اپنی بے قدری سے حیران ہیں) مشعل کھنکھاتے
 (یعنی فریاد دیتے) چوں آفرزد و دل سے پوش
 گویم دود و چراغست یا لالہ و دغ ؛ اما سوختگی را
 سرگزشت است و خستگی را رویداد ۔ گویم تجلی و طوبی
 یا جنت و حور ؛ اما نازش را قلمروست و آرایش
 را سود (نواح) طلسم شعلہ دودست باز بستہ زرد
 خیال ؛ شعلہ پناں ، دود و پیدا ، دل لوج طلسم
 و زبان طلسم کشا ۔ ہنگامہ ابر و بادست بر انگیزتہ جادوی غم
 ابر گریزش ، و باد الماس فشاں ، اندیشہ طومار نیزنگ
 و لبافسوں خواں ۔ دود و کبابیت بانڈیچ و ما بے کار
 شعلہ و دل افتادہ است ۔ براہو اتق بستہ جیل غواست
 بسا مان خستہ کہ در کیس گاہ رودادہ است
 دام بدر بستہ ۔ جمالیست در پردہ نمایش خوش نشاط
 حقیقی را ستایش نگار نہاے ست در سایہ و مندی
 خوشی نخل بند ازل را سپاس گزار ۔

شیخ علی حزنیں اور مرزا کے طرزِ بیان کا مقابلہ

شیخ نے جو اپنے دیوان کا دیباچہ لکھا ہے اسیں وہ فخریہ فقرے جو اپنے دیوان اور اپنے کلام کی شان میں لکھتے ہیں اُسی قسم کے فقرے مرزا نے بھی دیوانِ فارسی کے دیباچے میں انشائے کئے ہیں۔ سو دونو دیباچوں میں سے ہم ملتے جلتے فقرے انتخاب کر کے اس مقام پر مقابل یکدگر لکھتے ہیں۔

غالب

حزین

ہمایوں خطہ است لبالب از جو اہر کلم و جو اہر کلم
روح پرور ہویش ربی اعتدال و جد اول
سطور ش ازما یعیس مالا مال خاکش شکلیں
و شمیمش عنبر اگیں، آبش خمار شکن و شمیمش
سیح آئیں از صبو حی فیضی کہ ساقی کلکش ہویدہ
سیاہ متساں حروف سر در کنار ہم غنودہ اند، و از
نشہ ہوش پردازے کہ دستِ فکر ت در جام و سبو
انفاسش ریختہ خردستان معنی نشید شوق سرودہ
بنام از حسن لیلی ست کہ از طرف خیام الفاظ
سر بر زوہ در جلوہ گری ست یا شور مجنون ست
تراویدہ کاغذی پیر نہا مند (یعنی داد خواہا مند)

۴۱ الفاظ کو اس لئے کہ وہ کاغذ پر مرقوم ہیں کاغذی پیر نہا کہا
ہے اور کاغذی پیر نہا داد خواہ کو کہتے ہیں دوسرے فقرے میں
معانی کو اس لئے کہ انکی روغن حروف کی سیاہی میں پوشیدہ ہے
مضلل کتب اور سیاہ پوش کہا ہے ۱۲

۴۲ کہ از وادی تفسیدہ دل برخاستہ در پردہ درست

طهوری

در دلش این دآں نمنے گنج
 هیچ جز حق در آن نمنے گنج
 بت شکن گشت چون قلیل خست
 بادش از زانی اعتقاد دست
 کفر در فکر حکمت عسرفاں
 شرک در شکر نعمت ایناں
 طینتش باج خواہ طینت با
 نیتش پاوشا و نیت با
 در عبادت زہے تو مندی
 بندگی در خو رح خداوندی
 سر وحدت بمنزبرد از پوست
 ہمہ آؤ کرد و خویش را ہمہ اوست

غالب

در طریقت بہمناسے بہرواں
 در خلافت پیشواے خسرواں
 آنکہ چوں از راز وحدت دم زند
 و فقر کون و مکاں برہم زند
 آنکہ چوں در نئے نوار اسرودہ
 نے شود تخلص کہ شبلی بردہ
 شبلی از منبر دہد آواز عشق
 شاہ ما بر تخت گوید راز عشق
 عشق دارد پایہ ہر کس نگاہ
 منبر از شبلی و تخت از پادشاہ
 انچہ ابراہیم ادم یافتست
 بعد ترک مسیحیم یافتست
 شاہ ما دارد ہسم در بہروی
 خرقہ پیری و تاج خسروی
 شاہی و درویشی اینجا باہمست
 پادشاہ و عہد قطب عالمست

ظہوری

بائے نہ پیوندیت کہ گینختنش پر کش
کشیاں (یعنی قیتیاں) نہ خند و کفر
بایاں نہ سرسیت کہ صداعش صد چارہ
از پیشانی بر ہنماں نہرو۔ از صد توجہ
دوئی در کی گرختہ، و بہ علاوہ تجربہ پیش خودی
در تونی آویختہ، گوشے حق شنو، چشمے حق ہیں،
و کے حق جو، خاطر کے عرفاں ترا، سینہ
معرفت خیز تار کے آسماں سا، جیت
سجدہ ریز۔

شعوی

پا کے رفعت بر آسماں دارد
سر خدمت بر آسماں دارد
در عبادت پہ گشتن و دین
طرز او طرز حق پرستین
خلوت دیگران و صحبت او
و حدت این دآن و کثرت او

غالب

رسانستہ است، بیکد گردن این دو قبح یعنی
فقر و سلطنت مجمع البحرینے پیدا آورد، و سر ہم آوردن
این دو قوس نقش دائرہ پیدا کرد، از سر جوش فروغ
مہر و بافتن درون و باپودن و شستن یکے ساقتند
و بہر فرج گزین چشم بد از پروین پرن براں یکسند فتند
سرش را تاج شاہی افزاقتند، و دلش را بنور الہی افزاقتند
..... نہ ہے در انجمن خلوت نشین، و پاؤ شاہی کا رنگی
گزیں، پاؤ شاہاں در انجمن انراں کا گاہ آداب موقتہ
و کارا گاہاں در خلوت انراں پاؤ شاہ فیض اندوختہ۔

شعوی

اے کہ از راز نہاں آگہ نہ
دم مزن از رہ کہ مرد رہ نہ
در ہزاراں مرد مرد رہ کیست
آومی بسیار آماشتہ یکے ست
ور توئے پرسی کہ مرد راہ کیست
جز سراج الدین بہاؤ شاہ کیست

۱۱ یہ شعر شعوی شعوی کا شعر ہے اسی سے راز ظہور و اس کے ہاں کھدیا ہے اور شعر کے فقرے میں انابت طبع پیدا کر دیا ہے

جامع قرار دیا ہے اور مثل ظہوری کے نظم و شرد و نویں میں یہ مضمون ادا کیا ہے۔ چنانچہ ہم دو دو کتابوں سے وہ مقامات مقابل یکدگر نقل کرتے ہیں۔

ظہوری

غالب

آجا خداری لفظ و معنی بہشت شنائی تارکارت
 کہ ستمی خلیل خود یعنی برابریم عادل شاد را مراد است
 بہ نہ صفت یگانہ و ممتاز گردانیدہ اول معرفت
 کہ با وجہ و حجب کثرت در شاہد شاہد وحدت
 معنی کا ہم معجز نظام دو گوشت لفظ را از دو
 یقیناً، و صحت حال او ساخته، گلستانیت
 و بوستان عقیدتش از حسن و خاشاک شک و شبہ
 پر داختہ مجموعہ عرفان موحداں فردے از
 و فقر شناسائش، عفت و استقامت ماسوسے
 پسندیدہ طبع موائسائش، بہ توضیح بیانش
 نشانہاے بے نشان یعنی ذات بی نشان
 ہمہ دلنشیں و خاطر نشان، بہ آقا جہاں گرد
 تاکید نظر بر دو بیناں نینداختن، و مقصود
 تمہید بہ احوال احوال نپرداختن، زمارا
 از انجا کہ بعد ہر دو بطورے دیگر است، و پس از ہر انجام
 سر انجامے جداگانہ ہر ہر عہد عہد اسے دیگر است
 یعنی اسے دیگر از اسماء آئی و در ہر وقت و ہر
 کشائش طلسم دیگر قرۃ ایزدی (شان آئی) کہ چند
 را بنام آوری شکوہ و غوغا از سیما و خشیہ، و آند
 را بہ نشانندی فقر و قافروغ بخشیدے۔ منظرے
 کامل و مراتے روشن خواست تا در اں منظر ظہور
 بہر درونگ، و در اں مرات رؤیت بہر دو صورت یکبارہ
 رودند۔ اورنگ و منبر کی شد، و وسادہ و سجادہ را
 دوئی از میاں رفت۔ درفش کاویانی درک نشان پادشاهی
 است، از عصا و ردا کہ ہر دو شعار و نشان ہر دو
 درفش جمع آمدہ) منت پذیرفت کہ پدائی من بہ پیوند
 اس و جزو باز بستہ است، و عصا و ردا درفش را سپا
 گفت کہ دریں صفحہ (یعنی در درفش) نقش جمعیت ما

عزمتہ میدارم کہ چوں من صد و چوں عرفی صد ہزار را بہ سخن پرورش تواند کرد، و پایہ ہر یک بہر یک تواند نمود۔ والسلام

یہاں تک ہم نے مرزا کے مکاتبات میں سے جو بجاے خود ایک دفتر طویل الذیل ہے کسی قدر صاف اور سلیس عبارتیں انتخاب کر کے لکھی ہیں اگرچہ اس قسم کی اور بہت سی عبارتیں اور خطوط مرزا کے مکاتبات میں سے انتخاب ہو سکتے ہیں مگر کتاب کا حجم بہت بڑھ گیا ہے اس لئے ہم اسی قدر قلیل پر اکتفا کرتے ہیں۔

اس انتخاب کے بعد ہکو مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ناظرین کی دلچسپی کے لئے ان مشہور آسادوں اور نثاروں میں سے جن سے ہندوستان کے لوگ بخوبی واقف ہیں چند شخصوں کی نثر کا مقابلہ مرزا کی نثر سے اس طرح کیا جائے کہ جو عبارتیں مرزا اور دیگر اشخاص کی نثروں میں متحدہ المضمون پائی جائیں انکو ایک دوسرے کے محاذی لکھ دیا جائے اور اس بات کا اندازہ کرنا۔ کہ کون سا بیان کس پایہ کا ہے اور کون سا کس درجے کا۔ ناظرین کے ذوق و وجدان پر چھوڑ دیا جائے۔

سب سے پہلے ہم دو متحدہ المضمون مقام سہ نثر اور مہر نیروز سے نقل کرتے ہیں۔ خطوبی نے دوسری نثر میں ابراہیم عادل شاہ والی بجا پور کی نو صفتیں الگ الگ بیان کی ہیں جن میں سب سے اول معرفت الہی کا ذکر کیا ہے اور شاعرانہ میالنے کے ساتھ اپنے مدح کو اس صفت سے موصوف کیا ہے۔ مرزا نے نیروز کے دیباچے میں حمد و نعت کے بعد بہادر شاہ مرحوم کی مدح کے موقع پر اپنے شاعرانہ انداز میں انکو پادشاہی اور درویشی کا

بے تمامہ و بہتان بر کس ترا سہم و یکدار دہ، آنروزش را دریں پرده رافیتہ، و اگر گویند
 بست، ہر آئینہ سے تو انم گنت کہ نیست، اگر تہنیتی و ہمزانی آئینہ کار، و ہر بر بدن روزگار
 در سہرہ کردن گفتار، چوں بہت صبر متاذا رود، و گنتہ آمد کہ ہر تہیہ بہر لحظہ گنتہ اندنہ غلط گنتہ اندر
 ان، بایہ تاتہ بہ در دل نزد، و بہت از بہ آقیاض در یوزہ کرد، یکشرب مشق، و فراوانی در ش
 و سپیدی را ہر دان راہ دان، کشایش ہر وسعہ خواہد نمود، و اندیشہ را دستہ گاہ و گفتار
 را سہراییہ خواہد افزود۔

بر نامہ تشل بق مزوم کو ایک خدایں خط نہ بچینے کی شکایت لکھی ہے اور ایک قصیدہ
 جو حمد میں عربی کے سب سے پہلے قصیدے پر لکھا ہے خط کے ساتھ بھیجا ہے اور اسکی
 اواد چاہی ہے وہ خط بخینہ لکھا جاتا ہے "سبحان اللہ! بآنکہ از فراش گشتگانم، و دامن
 کہ دوست مرا بہ دو تہو بلکہ بنیم نش بزگیرد۔ ہر گاہ باز داؤن آہنگ گلہ رو سے آرم، و ہنم
 کہ این پرده یعنی نقہ) را بے پردہ (یعنی بے تکلف) می توانم سرود، و از قہر ماں اندیشہ
 دور رہائے (یعنی امناسے) در میاں نیست۔ ہر آئینہ بدیں شادمانی کہ ہندوزم با دوست
 رو سے سخنے بست۔ آنچناں بر خوشیتن سے بالکم کہ غم جاں گداز فرا موشی فراموش، و لب باز
 ز فرمہ کہ دل در بند سرودن آنست (یعنی شکایت) خاموش می گردد۔

انزوشتن بدوق جنا با تو ساقیتم با ما اگر ساز کہ ما با تو ساقیتم
 دیں روز با ہوا سے اں در سر افتاد کہ بتیہ چند در توحید جمعیاً لہرئی گنتہ آید چوں
 کوشش اندیشہ بجائے رسید کہ نہ عربی را محل ماندا، و نہ مرا چائے۔ ناگزیراں ابیات را بر کسے

چشمِ براہ داشت کہ کے نویسند، و درین گاہ هیچ گاہ نتوشند کہ خوش شگین زمینِ اسپ شگین
کہ دراکبر آباد معروف است) دعا کے مراکد ام او پذیرفت؛ و دریا پیا سنج سلام من زبانِ مخرج
چہ گفت؟

نواب عبداللہ خاں صدر الصدیر میرٹھ برادرِ نواب محمد سعید خاں مرحوم رئیس رام پور نے
مرزا کو لکھا ہے کہ رئیس مروج کی شان میں قصیدہ لکھو مگر اس زمانے میں مرزا پریشاں بہت ہیں اس لیے
انکے جواب میں لکھتے ہیں دو خدام بلند مقام کہ سرانجام قصیدہ از غالب بے نوا چشم داشتہ اند
مگر آن فرسودہ رواں افسردہ دل را کہ ہنوز نہ ٹمردہ است - زندہ پنداشتہ اند۔

گمانِ زسیت بود بر منتِ زبید روی بہت مرگ ولے بتر از گمانِ تو نیست
کاش کشائش ایں کارچوں صنعتِ نقاشی و گلدستہ بندی تنہا بکوشش دست و بازو صورت
بستے، تا چشم از خشکی دل پوشیدے، و فرماں پذیرانہ در پردازش کار کو شیدے، چہ کچھ چوں ہر اس
رشتہ در دستِ دل ست - تا دل بر جا کے نباشد زباں سخن سرا کے نباشد دیدہ و ران
صاحبِ دل دانند کہ چہ قدر ما دیدہ و دل بہم آئینہ شود، تا نقشے - ہواں شگرفی کہ بالغ نظر اں
پسند نہ آئینہ شود۔ ایں دل شکستہ بہم نہ پیوستہ کہ در سینہ من، و ہمانا دشمنِ دیرنیہ من ست -
ز ہمارے کار سخن گسری نیاید، و معنی اکفرنی را نشاید + + +

قاضی عبدالجلیل بریلوی نے کچھ غزلیں اول ہی مرتبہ اصلاح کے لیے بھیجی ہیں انکے
جواب میں اصلاح کے متعلق لکھتے ہیں دو خواہشِ حکت و اصلاح مہر افروز و چنداں کہ دیدہ بدل
سواد و ختم نازیبا صورت کے بغیر دنیا میں ہنجا و روش خود از نیر و ہاے درونی ست۔ آرے

نامہ بیاں رسید، و شرم پر گندہ گوئی و دراز نفسی بر من آستلم کرد۔ دیدہ وراں دانند
 کہ گفتنی فراواں بود، و افسانہ پریشاں؛ تا کجا اندک گفتے، و گفتار را از درازی نگاہداشتے
 مراد را آنچه رفت گناہے نیست۔ و اگر خود گناہ است، دوست کریم ست و کرم غدر خواہ۔ و استلام
 نشی جو اہم سنگہ جو تہر تخلص کے باپ راے چھچھل دہلوی نے مرزا کو جبکہ وہ کلکتے
 میں ہیں ایک رئیس کی نسبت جو اپنے باپ کی جگہ مسند نشین ہوا ہے۔ لکھا ہے کہ وہ حکیمانہ
 طریقہ رکھتا ہے اور سخاوت اسکی جبلت میں ہے۔ اسکے جواب میں مرزا لکھتے ہیں۔ دایکہ
 گفتی فلانی روش حکیمانہ دارد، و دنیا را کار آہا گانہ می گذارد۔ بایں ہمہ اندوہنا کی خندہ ام
 در گرفت، و عنان ضبط خویش از کفم بدر رفت۔ نہانی کہ بر اسپان با در قمار پر نشستن، و
 گروہا گروہ مردم را پیشاپیش دو انیدن، تن را بلباس زنگارنگ بر آراستن، و معدہ را
 بہ الوان خوردنیہا ممتلی گردانیدن، شہوہ از اندازہ بیرون راندن، و عجبہ معصیت برفق
 افشاندن، از حکمانیاد؛ و زشتکاں را نشاید۔ کار و انشوراں چیست؟ و دراز آبادی و برین
 کوہے نشستن، و از شش جہت در بروے خلائیق بستن، تن را بر ریاضت فرسودن، و
 بجاں را بہ بخودی پا لودن۔ ہر کہ حکیم خرد گزین ست کار و بارش این ست۔ بے برگ و نوائے
 از شکیمہ گوناگوں حسرت بدرختہ بہ فراخ ناے سرخوشی (مستی) رسیدہ است؛ از کجا کہ آزادہ رُو
 و بالطبع کریم بُود۔ ہنوز او عیہ منی از ریح غلیظہ صالحہ کبدیہ ممتلی وارد؛ ہر آئینہ بفرمان باد
 ست۔ روزے چند بایش تا بنگری گرہ بر کیستہ زر زناں، و در حسرت زرت تلف کردہ زاری
 کنماں۔ ایں کہ فلاں و بہاں را از تزویر خویش تن رانندہ است۔ حقا کہ روے در مصلحتے

کرد، و بلا هوَرِ همراهِی معین الملک گزید چون بساطِ دولتِ معین الملک در نشسته -
 بر می آمد، و با ذوالفقار الدوله میرزا نجف خاں بهادر پیوست. زان پس پدرم عبداللہ بیگ
 خاں شہابجہان آباد بوجہ آمد، و من بہ اکبر آباد. چوں پنج سال از عمر من گذشت - پدر از
 سترم سایہ برگرفت. غم من نصر اللہ بیگ خاں چوں خواست کہ مرانہ ناز پر دزد ناگاہ گرش
 فراز آمد. کما بیش پنج سال پس از گذشتن برادر پیغمبرم برادر برداشت، و مرادیں
 خرابہ جاتما گذاشت. و این حادثہ کہ مرانہ جان گدازی و گردوں را کینہہ با زنی بود
 در سال ہزار و ہشت صد و شش عیسوی ہنگام ہنگامہ لشکر آرائی و کشور کشائی مصمام الدولہ
 جنرل لارڈ لیک بہادر بروئے کار آمد چوں غم مرحوم از دولتیان دولت اہل فرنگ، و بلا
 انبوی چار صد سوار بر کاب مصمام الدولہ، با سرکشاں سرگرم جنگ بود، و ہم از بخشش ہای
 سرکار انگریزی دو پرگنہ سیر حاصل از مضافات اکبر آباد بہ جا گیر داشت - سپہ سالار سرکار
 انگلتیستہ بہ خون بہا ہای آفتاب (یعنی نصر اللہ بیگ خاں) کلہ تار گدایاں را چراغ، و ما
 بینوایاں را بعض جاگیر شہرہ از خار خا حیتجوئے وجہ معاش فراغ بخشید تا امروزہ
 کہ شمارہ نفس شماری زندگانی بچل و چار میرسد - ہاں رات بہ خر سدم، و ہاں تیرہ قانع
 در سخن از پرورش یافتگان مبداء فیاضم، و سواد معنی را بقدر غوغا ہر خویش روشن کہ ہم
 از بیچ آفریدہ حق آموزگاریم بہ گردن، و بارشت بہ چلیخیم بر دوش نیست
 غالب بہ گزند دودہ زاد ~~شکستہ~~ زان و بعضای تویم نیست و غم
 چوں فت پہبندی ز دم چنگ شعر شد تیر شکستہ دنیا گان قتلیم

و پیودہ خامہ را (یعنی کلام خود را) پارہ پارہ بہم بستہ و ریزہ ریزہ یکجا کردہ، یکمان نام آوری
کہ دل از تاب اندوہنا روائی آپ خوں ست۔ دیوانے ترتیب دادہ جا بجا بنظر گاہ التفات
یاراں فرستادہ ام۔ بزرگانے کہ پہ پیش غالب مستند روئے آزد۔ سواد ہر غزلے کہ
خواہند از اں اوراق بردارند؛ کہ انتخاب و التقاط اشعار حوالہ ہر اسے نامہ گرد آور (یعنی
مؤلف مذکرہ) است بانہ باشارہ و ایما سے مخمور۔ + + + + + آنا اگر گزارش حال مخمور
ہوس ست، خود ایں مایہ بس ست کہ چوں در جریۃ آں فن از من سخن راتند سخن را
در ستایش من بدیں گوئے بہ گری نشاند کہ از نا کسان روزگار و بیکیان دہلی و یارسلانان
ایست کافر ماجرا، و گریست مسلمان نما، کہ از غلط نمائی غالب مخلص میکند و بدیں برگ
تراش می نماید۔

خرسندی غالب نبوز نہ گفتن یک بار بفرماے کہ اے سچکس ما
پنہاں ناماد کہ در اصل آفرینش از دودہ روز فروز قشکاں، و حلقہ بخت برگشتگاں ستمسیدہ
و بروے ہی نادیدہ کسم؛ آرا ایش سخن بیشکیش۔ (یعنی بر طرف) ترک ترا دم، و نسب من
بافراسیاب و تنگ مے پیوندہ بزرگان من از انجا کہ با سلجوقیاں پیوند ہم گوہری داشتند
و بعد دولت ایناں رایت سردری و سپہبدی افراشتند۔ بعد سپری شدن و رگا جاہندی
آں گروہ (یعنی سلجوقیاں) چون ناروائی (کساد بازاری) و بنیوائی روئے آورد۔ جمعے را
ذوق رہنری و غارتگری از جاے برد؛ و طائفہ را کشاوزری پیشہ گشت۔ نیاگان مرا بہ
توراں زیں۔ شہر سمرقند آرا تشگاہ شد۔ ازاں میانہ نیاے من از پدر خود رنجیدہ آہنگ بند

گنجینہ خسروان پارس را از ہر علم و فن ترے بود، و ہر فن تر از گرانمایگی گنج گوہرے۔ چوں
دولت ازاں طائفہ روئے ترافت، و سکندر ابن فیلقوسن ایراں دست یافت، کتب خانہ
خسروی تبارج رفت۔ اما انچہ پراگندہ بود و گنماں بہر گوشہ و کنار داشتند۔ ہر جامدہ تبارج
پیروزی تازیان، در اں کشتش و کوشش از ہر جا گرد آمد (فرام آید) و بفرمان خلیفہ۔ افروزنیہ کلجن
گرایا سہ (حامیہ) بقادوشد۔ ہانا احکام آذر پستی ہم با دوز بازگشت۔ زباں آذران
عرب پارسی را بہ تازی آہنختند، و زبانے تازہ برنگینختند۔ اکنون کیست تا ہاں زبان کس
سخن درست تواند گفت، و ازاں دیریں آئیں راستی خبر تواند داد۔ پڑ و ہندہ ایں راز را
کام دل بر نیاید، و من عناسن کہ ہر چہ پس از فراداں جستجو فرام آرد۔ نہ انچہاں باشد کہ
دل ہاں توان نہاد۔

دیگر انچہ کلک شکبار ہاں رفتہ کہ تنجہ از گفتار نار و اسے خود بر نگارم، و نختہ از ماجرا
خود بر گزارم۔ اندیشہ را بہ لب گردین و خرد را بہ سنگفت زار (و محل تعجب) انگند۔

چگونیم از دل و جانے کہ در باطن ستم رسیدہ یکے نا امید واریکے

انچہ ہاں از زم و مرا ایں پایہ از کجا باشد کہ ستودگاں مرا ستایند، و گفتار مرا دزد کردہ
شعرا جاو بند۔ از فرجام فرہمندی ہستی (یعنی از شان و شکوہ ہستی) و سرور بگ پیدائی۔
کہ نزد آشکارا بنیاں نزد زوال، و بوالا دید یکتا گزیناں (یعنی قائلان وحدت وجود) نمود
بے بودست۔ انچہ بمن دادہ اند زبانے ست یا فرام آست پیوہہ پوسے۔

من ہم از بے یارگی چوں کو دگاں کہ در زم از سفال سازند و یہ گنجینہ واری تازند۔ سرودہ زباں

لوالہ یافتہ، لاجرم دانش من (علم من)، اندازہ سر انجام پانچ آں بہت داشت (کمل نکرد) چون دوبارہ
گفتند کہ خواہش چنین است۔ ناچار تہر خوشی از دہاں در پردہ شرم نمودانی از میاں برداشتہ میگویم کہ
روانی این خواہش از یکس چہم نتوان داشت، و خود را بہ نیرای شہروش (تلاش) خستہ نتوان
نگارند۔ دبستان مذاہب با اینہ لاف آشمارونی (واقفیت) آنچه میگوید نہ ہمہ است و نہ ہمہ بر جای خود
رہی نہ تکمل است و نہ سراپا صبح است) پارسیانیکہ در صورت پھلہی آشیان دارند۔ زمینارگیاں ہمیری
کہ از آں گروہ یعنی از شہرگان پارس) جز نام نشان دارند۔ آں پو پیہ و آں ہنجار (یعنی آں روش
و آں طریق) و آں نگارش و آں گفتار ندانند، و جز تخمہ و ترا داز و بے شیوہ پارسیان
نمانند۔ پارسیان از گرانایگان روزگار، و برگزیدگان دادار بوده اند، و بہ روزگار فرمانروائی
خوش داشتہ اسے سودمند (علوم مفیدہ) و کنشمانے خرد پسند (اخلاق پسندیدہ) داشتند۔
کشایش را از خراش ہفت سپہر، و نمایش اندازہ گردش ماہ و مہر، پدید آوردن خشنود گہرا
از تہر خاک، و بدر کشیدن بادہ ناب از رگت تاک، پڑوش اسباب خستگی و رنجوری، و گزارش
احکام پزشکی (طبابت) و چارہ گری، پردہ کشائی فرست اسرار گیائی (سلطنت) و فرمانہای
و رصد بندہی تقویم آثا بہ بندگی و فرمانبری، عنوان یک دگر بستن رنگ رنگ گہرا، و ہنجار
سہ کردن گونہ گون ہنر، دارو گیاہ فراخو بہر درد بکار اندر آوردن، و پرندگان ہوا
و درندگان دشت را بشکار اندر آوردن، با کوتاہی سخن۔ والائی اندازہ ہر گونہ بینش، و پیرائی
اندازہ کمال آفرینش، ہمہ در آئینہ اندیشہ میں فراگان روے نمودہ۔ و انگیزش
بایشکی گفتار و کردار کہ اکثوں بہ اندکے انراں بسیار نازند۔ از مغرورانش این فرہنگیان بہت۔

خشست می شوم۔ مرا۔ جزانیکہ بپذیریم۔ گزینہ نیست۔ آما از دودنا دانند کہ لفظ دوداع از دل نہاں
 نمی رسد الا بصدر جبر ثقیل، تنہا اینجا سخن ولیعهد بہادرست۔ غالب مستہام از شہامی خود
 کہ واقعہ تو دویج مولوی فضل حق، داندوہ ناکہ ولیعهد بہادر، ویدر آمدن دہما کے اہل شہر
 بعبارتے روشن و بیانے دلاوہ زور آئینہ سکتدر بقالب طبع در آرید، و مرادیں تفقہ
 منت پذیر انگارید۔ والسلام

مولوی سراج الدین احمد نے خط اس مضمون کا بھیجا ہے کہ مرزا صاحب کچھ حالات
 پارسیوں کے اسلاف کے لکھیں اور کوئی ایسی کتاب نشاں دیں جس سے آئینے مفصل
 حالات معلوم ہوں۔ نیز کسی تذکرے میں درج کرنے کے لئے مرزا کے اشعار کا انتخاب
 خود مرزا کا ترجمہ طلب کیا ہے اسکے جواب میں مرزا لکھتے ہیں۔

”ہر نیمے کہ ز کوئے تو بخت الم گذرد یادم از دلولہ عشر یکما ز وہد
 رسیدن مہر افزا نامہ دل برد، و جاں بخشید۔ اگرچہ آں جاں با من نماند، و ہم بر سر آں نامہ
 نقشاندن رفت؛ لیکن سپاس دلربائی و جاں بخشی باقی ست۔ امید کہ تا جاں بخشیدہ
 یزداں در تن ست گزاردہ آید۔“

مخدوم من در رسیدن نامہ پیشیں دودل (مترد) چاست؛ ہنوزم نشاط و دود
 آں نیکہ در دل، و سواد سطور آں صحیفہ در نظر جا دارد۔ چوں فرماں چاں بود (یعنی ڈارمہ
 پیشیں) کہ غالب خوشنیتن شناس۔ لختے از رسم و راہ شہرگاں پارس بر گوید، و کتابے
 ازاں کردہ نشاں دہد کہ رازاں دیریں کشیں، و سازاں باستانی زباں۔ ازاں اوراق

ایک اور خبر کے درج کرنے کی درخواست اس طرح کی ہے دو گناے رانا مور
 ساختن، ویسچے راہمہ پنداشتن، غایتے ست شرگ و مرتجے ست بزرگ، خاصہ کہ
 اس شرگ غنایت بے ابرام داعی روسے نماید، و اس بزرگ مرتجے بے استغناء
 سائل بظہور آید۔ مگر غزہ اگر دیدہ حق میں وارد۔ نگرہ کہ واجب تعالیٰ شائے اجزائے ممکنہ
 را کہ در کتب عدم متواری بودہ اند۔ محض غنایت پیرایہ وجود بخشیدہ، و براں معدومات منت
 نہادہ۔ حقا کہ اگر تاملے بسزا کردہ شود رقم گشتن قطوعہ تاریخ در آئینہ سکندر ازین عالم خبر
 می دہد۔ و چون نا خواستہ انجین نوازش بمیاں آمد۔ ہر آئینہ روانی خواہش را چگونه
 چشم نتوان داشت۔ لاجرم در گزارش مدعا فصلے بمیاں نہادہ آرزو را سرانجام گفتگو
 دادہ می شود۔

ہفتہ مباد کہ قدر شناسی حکام رنگ آں رحمت کہ فاضل بے نظیر و لعلی یگانہ مولوی
 فضل حق از سر رشته داری عدالت دہلی استغفا کردہ خود را از تنگ و عار و بار بماند۔ حقا کہ
 اگر از پایہ علم و فضل و دانش و کنش مولوی فضل حق آں مایہ بکاہند کہ از صد یک و اماند،
 و باز آں پایہ را بسر رشته داری عدالت دیوانی سینچند، ہنوز ازین عمدہ دوں مرتبہ ہی خواہ بود
 بالجملہ بعد ازین استغفا نواب فیض محمد خاں (رئیس مجھڑ) پانصد روپیہ ماہانہ برائے مصارف
 خدام مخدومی معین کرد و تر خود خواند۔ روزیکہ مولوی فضل حق ازین دیار می رفت و چند روز
 دہلی صاحب عالم مرزا ابو ظفر بہادر مولانا را تا پیرود کند۔ سوے خود طلبید، و دو سالہ بطوس
 خاص بدوش و سے نہاد، و آب در دیدہ گردانند، و فرمود کہ دو ہر گاہ شامی گوئید کہ من

در نظر م تیرہ و تار شد. نخست انچہ بنظر درآمد خود آشوب خبر کے بود کہ دل تا جگر خوں کرد۔
یعنی از جہاں رفتن خواہم عزیز نشا۔ ہے ہے! ایں مخدومہ مرحومہ ہماں ست کہ تا در ملکستہ
خبر رنجوری دے شتودہ بودید دل از دست رفتہ بود، و سر ایگی سراپا کے خاطر را فرو گزشتہ
در نظر دارم کہ از مردنش بر شاہ قیامت گذشتہ باشد۔ تو انا ایزد پاک شمارا شکیب عطا
فرماید، و تنومندی دل و توفیق ثبات ارزانی دارد، و ایں سانچہ را در روزنامہ عمر شہ
خاتمہ مکارہ و مقلع مصائب گرداند۔

آتشکارا شد کہ مخدوم مرا از علاقہ تازہ خشتودی نیست۔ ہر آئینہ انکشاف ایں معنی
بخار بلال بر دل فرو رخت۔ خدا را دلنگ تو اں شد، و کلکتہ را غنیمت باید پنداشت۔
شارستانے (معمورہ) بدیں تازگی و گیتی کجاست۔ خاک نشینی اں دیار از اوزنگ آرائی
مرز بوم دیگر خوشتر من و خدا کہ اگر متاہل نہ بودے، و طوق ناموس عیال بگردن نہ داشتے،
وامن بر ہرچہ ہست افشانڈے، و خود را در اں بقعہ رسانڈے۔ تازہ بستے در اں مینو کہہ بوئے،
وازر بخ ہوا ہاے ناخوش آسودے۔ زہے ہوا ہاے سرو، و خوشا آبہاے گوارا،
فرخا بادہ ہاے ناب، و خرتا ثمر ہاے پیش رس۔

ہمہ گرمیہ فردوس بخوانت باشد غالب ایں انبہ بنگالہ فراموش مباد
مولوی سراج الدین کو مرزا صاحب نے کسی واقعے کا قطعہ تاریخ لکھ کر بھیجا ہے
اور انھوں نے بغیر خواہش مرزا صاحب کے وہ قطعہ بہت سی مرصع و تائش کے ساتھ خبر
آئینہ سکندر میں چھپوایا ہے۔ جب وہ پرچہ مرزا کی نظر سے گذرا ہے تو اس کا شکریہ اور

نیست، و قرار داد نیز ہاں ست۔ لاجرم دیوانہ پودے اگر میں کشور یاز آمدے، و با
 ایک قبیلہ (یعنی با جمیع کثیر) کہ خوشیاں و برادران من اند۔ بہ ستیزہ برخاستے۔ وہ
 باطل ستیزی نام برآوردے۔ + + + + +

چکنم کہ کار برگشت، و روزگار برگشت۔ خدا را بنگر، وہ درودل من وارس کو لیرگ
 توسط کرنیل ہتری اٹلاک برن مہرباں شود، و پوٹے کہ خوشتر ازاں متواں اند نشید۔
 بصدر فرستد، و جوابے کہ سودمند تر ازاں متواں سنجید۔ از صدر حاصل نماید، ہنوز
 آں جواب در راہ باشد کہ کو لیرگ مغزول گردد۔ و ہاکش کہ بجایے کو لیرگ نشیند۔
 آنچه بہم زدوں ہنگامہ سلطنتے رابس باشد۔ از بہر من بصدر نوید، و من وراں دوری
 (معاملہ) از ستر استر لنگ چشم یازی داشتہ باشم، ہنوز آں رپوٹ بصدر ز رسیدہ باشد
 کہ ستر استر لنگ رہو راہ عدم گردیدہ باشد۔ چوں از ہمہ گیسلم، و بدامن جارج سوٹین
 بہا در آدیزم، گرم از جا برخیزد، و دامن بر شغل جہان بینی افتاند۔ بجان اللہ!
 مغزول نگردد مگر کو لیرگ، برگ ناگاہ نہیر و مگر استر لنگ بولایت نزد مگر جارج سوٹین،
 و زخوہ رابس صدمہ ہاے جاں گاہ نباشد مگر اسد اللہ وادخواہ + + + + +

مولوی سراج الدین احمد کے نام ایک اور خط دہ دلتوا از نامہ پس از عمرے
 رسید، و عمرے دیگر بخشد؛ تا عمر باندوہ سپری شدہ راتلانی تو اند کرد۔ اما شاد کردن
 کہ نداشت بہ عم سرشتہ باشندہ آسانست۔ منم کہ چوں نامہ شمار سیدے متانہ از جاے
 برحستے، و جہاں جہاں نشاط اند وختے۔ انیک تا چشم بسوا دایں صحیفہ دو چار شد گیتی

گزر د و خبر نداشتہ باتم کہ سراج الدین احمد کجا ست و چه حال دارو۔ اگر جفا بپا دیش
وفا ست بسم اللہ ہر قدر توانی بغیر اسے۔ کہ اینجا مہر و وفا خردان ست؛ لاجرم جفا نیز باید کہ
خرداں باشد۔ و اگر خرداں تقافل بہ باد افراہ (یعنی بپا دیش) چرے دیگرست تخت گناہ را
خاطر نشان باید کرد، و انگاہ اتقام باید کشید، تا شکوہ در میاں نہ گنجد، و مرز ہرہ گفتار نباشد۔
منم کہ معاش من از گونہ گون بچ و رنگ رنگ عذاب بہ معاد گفتار ماند؛ خوں در جگر و آتش
ور دل، و خار در پیراہن، و خاک پر سر پہیچ کا فر بدیں روز گرفتار مباد، و پہیچ دشمن
ایں خواری مبیناد۔ راست بہ تنہا روی مانم کہ در صحرایا پیش بگل فرور دو؛ و دھنبد
خواہد کہ بالا جہد تواند و فرود تر رود۔ و الا قدر نواب امین الدین احمد خاں بہادر
کہ گیتی را بردیش دیدے، و وصالش را زندگی دانستے، بہ کلکتہ رگر اشد۔ و بگز زندگی از بہر کہ
خواہم دل را بدیدار کہ شادماں وارم۔ و اماندگی من از اینجا تو اں سنجید کہ تو انتم ہمیش
کردن، و واداشتم اور آتہا گذاشتن + + + + +

ایک اور خط میں مولوی سراج الدین کو اپنے مقدمہ کے بگڑ جانیکا حال ابطح لکھتے ہیں
”کایں بہ واد گاہ دہلی۔ چنانکہ دانستہ باشید۔ تباہی گزید۔ حالیا براں سرم کہ اگر مرگ
اماں و ہد باز دیاں دُر دینی در سپریم گورنٹ (رستم، و در دل بدیاں رفرہ فروریزم کہ غلام
ہوا و ماہیان در یار ابرخو و بگرایم۔ بیہات! اگر معاش من ہیں پنجرار و پیہ سالانہ ہم
بدیں تفریق۔ از روے دفتر سرکار ثابت شدہ ہووایستے کہ صاحبان صدر مرا از پیش
رانندے و گفتندے کہ ہرزہ مخروش؛ آنچه تو باز یافت و امتودہ یافتنی از اں افزوں تر

بے پردی پسرانِ وے۔ ہر خچہ از مرگ نتوان نالید، گسستن تار و پود پندارستی
 را چارہ نتوان کرد۔ لیکن انصاف بالاے طاعت ست، بہنو زہنگام مردن مرزا احمد بود
 چرا آن قدر صبر نہ کرد کہ بہ کلکتہ رسیدے، وروے نظارہ فروش دگر بارہ دیدے۔ چرا آن
 وزنگ نہ ورزید کہ حامد علی جواں گشتے، وکار ہا باندزہ دانش وے رواں گشتے، حیث
 کہ ہمیں پسرش خرد سال ست، و باشد کہ بہ حقیقت سرمایہ پردانا، و برگرد آوردن زہاے
 پراگندہ توانا، نباشد۔ و باشد کہ چوں آن سرمایہ بہ جنگ آورد بیاودہد، و بر فردستان خود
 ستم کند، و کہیں برادران را ناکام گزارد۔ بہ آئینہ دین حال آئینے باید ہوشمند و حق شناس
 کہ گرد چارہ بر آید، و غمخواری بے پردہ ماندگاں نماید۔ شد ورسن قال سے

مرا باشد از دردِ طغلاں خبر کہ در طفلی از سر بر قسم پیر

و باشد کہ تیاراں بیچارگاں عینِ فرض و فرضِ عین ست ہم بر شاد ہم بر مرزا ابوالقاسم خاں
 بیکیسی این جامعہ در نظر باید داشت و غافل نباید بود۔ ان اللہ لا یضیع اجر المحسنین۔

ایک اور خط میں مولوی سراج الدین احمد سے دوستانہ شکایت اس طرح کرتے ہیں

”دینہار صدر مینار اے مولوی سراج الدین! بترس از خدا سے جہاں آفریں۔ کہ چوں قیامت
 قائم گردد، و آفریدگار نشیند، من گریاں و مویہ کناں دران نہ گامہ اکیم، و در تو آوینم،
 و گویم کہ ایرک نکس ست کہ یک عمر مرا محبت فر لیت، و دلم برد، و چوں من از سادگی برد فا
 تکیہ کردم، و ایں را از دوستان برگزیدم۔ نقش کج باخت، و بمن بیوفائی کرد۔ خدا را
 بگو کہ آں زماں چہ جواب خواہی داد؟ و چہ عذر پیش خواہی آورد؟ و اے برن کردگار را

از ہم گیتخت : تہج ایوان سروری نژد، و نہال باغ آگہی را برگ و بار فروخت بشکیر و بادشاہ
 را دست از کار رفت، و گرہ کشاے بستہ کاراں را نئے بناخن شکست. خاکم بدین چگونہ
 گویم : و اگر من نہ گویم کیست کہ نمیداند؟ کہ مستر اندروا سترنگ فرد، و از گیتی جز نام نیک
 با خود نہ برود. کاش رُسے گداختہ (گچیلی ہونی کاشی) بروزنہ گو شتم رختندے تا نشود
 کہ چہ شد. اکنون امید غمخواری از کہ باید مداشت؟ و دل را بجبال گردش حتم کہ تسکین داد
 رپوئے کہ فرانسس باکس بہادر و مخصوص وادخواہی من بہ عذر فرستادہ است.
 چگونہ کہ چہ پایہ اسید گاہ و اندوہ فراسے بودہ است تکیہ بر کار سازی اں چابک حسد
 بید اسے قناد (یعنی سترنگ) داتم اکنون از شش سونفلک بکام دشمن ست. زنیار در
 پاسخ ایں نامہ درنگ روا مدارید؛ و بنویسد کہ اں والا گہرا چہ روسے داد، و اں گلین
 رونمہ مردی را کہ ام تہ باد از پانگند؛ و پس از دوسے سر انجام دفتر کہہ چہ شد و جایش کہ
 گرفت. اللہ بس ماسوی ہوس.

ایک اور خط میں مولوی صاحب موصوف کو اپنے ایک گلے کے دوست مرزا احمد ریکی
 کی تعزیت اس طرح لکھتے ہیں "والا نامہ رسید، و نوید فراق دائمی مرزا احمد رسانید
 چہ مایہ شکیں دل و سخت جانم کہ نامہ در تعزیت دوست انشامی کنم و اجزائے وجودم
 از ہم نمی ریزد. می گفت کہ بدلی می آیم؛ و عہدہ فراموش بے مروت راہ گردانند، و ناقد
 بسر سترل دیگر راند. گرفت کہ خاطر دوستاں عزیز نہ داشت۔ چرا بحال بخرد سالان خود
 نہ پرداخت، و سایہ از سرشاں باز گرفت۔ و اسے بے یاری پاراں وے، و درینا

بنیاد، و خود را دوست و یرینہ امین الدین خاں دانستہ آنچنان چارہ سازی و گناہ گری
 بجای آئے کہ ایسے درویش و دراز خانان (یعنی امین الدین خاں) اسد اللہ روسیہ را فراموش
 کنند، و شمارا بجاسے او داند، و نیز بہ برادر و الا قدر گفتمہ شدہ است کہ چون بہ کلکتہ رسید شمارا
 دریا بہرہ داند کہ اسد اللہ پیش از وہ کلکتہ رسیدہ است۔ قطع نظر ازین مدایح کہ بہ محروم۔ آخر
 خدا کے ہست و داد سے ہست، افسانہ ناکامی و تم کشی ایسے فریغ ناصیہ سعادت یعنی
 امین الدین احمد خاں شمارہ رادل بگدازد، دآہن را آب گرداند،

و دوسرا خط مولوی سراج الدین احمد کے نام اس طرح شروع کرتے ہیں ”گوہر گیس
 نامہ و لنواز پس از روزگارے دراز رسید، دیدہ و دل را فرخ و فراغ بخشید، نارسیدن
 نامہ مرا با شہر و گی شوق عمل کردید، چرا یہ مرگیا من حل نہ کردید؟ تا از ادانشناسی ہائے شما خرسند
 بودے، و شمارا اہل دل و دانشور شمرے۔ من و ایمان من کہ رشتہ مہر شاہ بہر دل و دیدہ
 و محبت شما با ہماں در آمیختہ تا زندہ ام، بندہ ام۔ وفا آئین من ست، و مودت دین من ست۔
 اگر روزگار ش نامہ درنگے روے دہر بہ فراموشی محول نشود۔ در دہا در دل، و ہنگامہ ہا
 در نظر، و تفرقہ ہا در خاطر، و سودا ہا در سر، چہ گویم چہ ہی کہم، و روز و شب چگونہ بسر می برم۔
 ایک اور خط میں مولوی صاحب موصوف کو استرنگ صاحب فارین سکرٹری
 گورنمنٹ ہند کی وفات پر اس طرح لکھتے ہیں ”و عمر من و جان من! پس از رسیدن
 اگر امی نامہ در بند آں بودم کہ پاسخ گزار شوم و ماہر اسے خود شرح دہم۔ ناگہاں دنی کہ
 دو شنبہ پانزدہم ذی الحجہ بود آوازہ در اقا کہ مجموعہ مکارم اخلاق را شیرازہ وجود

دائم و دل کہ در شکوہ چہ روش با ایجاد و در گلہ چہ عہدہ با بنیاد کردی۔ صرفہ شما (یعنی سرور
 شما) و زنا کامی من است (جبکہ سبب سے شکوہ کرنے کی فرصت نہیں ہے) ورنہ اگر آپ توں
 داشتے آں قدر با شما در آؤختے کہ شمارا دامن و گریباں بزیاں رفتے، و عراسہ درو شکستے
 آخر از خدا تیرسید، و از روئے داد بسنجید کہ کار من و شما بد اں رسد کہ روز با بگزد و دنیا نہ
 یاد نہ گردم۔ گفتم (یعنی میں او پر کھ چکا ہوں) کہ در بند گزاریش اندوہ ہے تازہ ام شکوہ کجا
 بخاطر ناشادے رسد۔ اگرچہ اندریں ورق گنجائی ایں دو سطر نیز بود لیکن اندیشہ براں
 بسجید کہ مبادا دوست او اشناس من مرا از خود خورسند و اند، و بدیں گماں از طمانی فارغ
 باشند و من زیاں زدہ جاوید گستہ امید باشم۔

بالجملہ دریں نامہ نگاری مدعاے اصلی بدیں رنگ ست کہ برادر صاحب مشفق
 نواب امین الدین احمد خاں بہادر ابن فخر الدولہ دلاور الملک نواب احمد بخش خاں
 بہادر رستم جنگ راہاں موج بلا کہ زہر قہم شکستہ بود یعنی تعدی رئیس فیروز پور خانہ
 بسلاب فتاداد خون و فایم بگردن کہ دریں سفر از ہمساییش یا زماندم و اما نگرگی و
 بیچارگی من از اینجا تو اں سنجید کہ دندان بر جگر نم، و امین الدین احمد خاں را در سفر تہتا
 گذارم۔ اگر قاضی محبت بدیں جرم بر نظم نشانہ، و بہ تیغ بے دریغ خورم زید، سزاوارم۔
 و لطف دریں ست کہ ہر خید درین باب بگفتار گرایم، و ہنگامہ پوزش آرایم شہساری
 بیشتر گرد، و خجالت افزاید۔ مگر سراج الدین احمد تہلانی بر خیزد تا از گرانی تشویر فرزندگی
 سبکدوش گردم، و اگر در خجالت از چہرہ برافشایم یعنی کمر بخوار و ہر ہر نو از ہی استوار

چهار سال می گذرد کہ مقدمہ من باجلاس کونسل پیش است، و دلم از تفرقه بیم و امید
ریش حکمے کہ قطع خصوصیت تواند کرد بنیامده، و هنگام بہ پایاں رسیدن تیرہ شب امید
ور نیامده۔ حالیا براں سرم کہ چون خبر و اعظم کونسل اشرا لامرا لارڈ ولیم کونڈس بننگ باور
بدیں دیار و آید بدامتش در آویزم، و داد خواہم، و استدعائے صدور حکم اخیر کنم، گر و
بر آند کہ نواب عالی جناب بدلی نخواہد آمد، و ہم ازاں رہگذر با جیمیر خواہد رفت۔ اگر
ہمچنین ست بدآ۔ من و روزگار من، و آؤخ از دوری راہ و درازی کار من۔

خواستہ اید کہ نتائج طبع والاے شما بگرم و از تراویدہ ہا کے کام و زباں خود شما اٹھانے
فرستم۔ فرصت آن کجا؟ و دماغ ایں کو؟ آمد آمد نواب گورنر، و در یوزہ اخبار از ہر در تیب
افراد مقدمہ، و تمہید نگارش حال، سنجیدن اندیشہ ہاے رنگارنگ، و سگالیدن اندازہ
بیاں۔ آن مایہ دستیاری و غمخواری از کسے چشم ندارم کہ چون در تے انشا کردہ با شتم نقل آن
تواند برداشت، با چون دفترے از بہر نگہ بستن پریشاں کنم آن اوراق پرانگندہ را فرام
تواند کرد۔ بہر رنگ چند روز در گرفتار داید، و تا زمانیکہ بمن پیوندید گاہ گاہ بہ نامہ
رنگ زدائے آئینہ و داد با شید + + + + +

مولوی سراج الدین احمد لکھنوی جو کلکتے میں کسی عمدہ خدمت پر ممتاز نہیں اور فرزا کے
نہایت سچے اور گارے دوست ہیں انکو نواب امین الدین احمد خاں مرحوم کے باب
میں جبکہ وہ رئیس فیروز پور جبرکہ کے خلاف اپنے مقدمے کی پیروی کے لئے کلکتے گئے
ہیں۔ اس طرح لکھتے ہیں دو مخدوم غالب! اگر نہ اندوہ سترگ بند بدلم نہادہ بودے تہن

ویدہ جاں را تو تیا آورد، و مارک اقبال را افسر و پیکر آرزو را یو بخشید؛ لیکن انا بنی کہ
 آل قدسی مفاوضہ از شعر و غزل۔ چون نامہ اعمال را ہذا ذکر کئے و شاہ۔ سادہ بود؛ دل خواہ
 بدایں نیا سود، و خوارم بدایں یکدو جڑہ صہبانشکست بگفتہ بئے ہئے؛ نہ تروہ دیدارے کہ دل تشاہ
 اں تو اں بستن، و نہ کرشمہ غزلے کہ لب بزم فرمہ اں تو اں کشودن۔ + + + + امید کہ
 از بس بعد زود نہ دیر بانشاے غزل شاہم فرمایند، و نوید رو بگو تا ہی نہادن روز برفراق کہ
 اندر بس موسم کہ خسرو انجم بہ آشد جاے دار و عجب نیست۔ بفرستند دولت و اقبال و زانو
 جواب نامہ شیخ امیر القدر سر و تخلص دو رسیدن دلمناز نامہ دل را تو مند و شاخ
 آرزو را برومند ساخت۔ گلہ از نا رسیدن پاشخ نامہ ہاے خویش مے کنید؛ و از خدا
 شرم نہ ارید۔ من خود از جانب شما نگرانی داشتہ کہ گجائید؛ و چہ در سر و ارید؛ بارے پردہ
 از روے کار شما برگزتم؛ و داشتہ کہ یک چند مرا فراموش کردہ بودید؛ ناگاہ در و در جناب
 مولانا تراب علی بدایں بقعہ افتاد؛ شنیدید کہ قلانی (یعنی غالب) از سخت جانی ہنوز زندہ ست؛
 مہرین بجنبید؛ خواستید کہ بنامہ یا دآوردید؛ از فراموشی روزگار گذشتہ اندیشہ کردید؛ لاجرم
 دروغے چند بر ہم بافتید و آزدی پای دیباچہ نامہ ساختید از حال من پرسیدہ اید چہ گویم کہ یقین نیز و چنانکہ گفتہ اند
 شکستہ دل ترزاں ساغر بلوریم کہ در میان حشرات را کنی زد و در رہا
 خیرہ سر و آشفٹہ راے، نہ زباں سخن سراے، و نہ دل از سرا سگی بر جاے۔

۴۴ یہ خط زمانے اس وقت لکھا ہے جب آفتاب برج اسد میں تھا چونکہ اسد مرزا کا تخلص اورنگ نام کا جزو ہے اس لئے آفتاب کے
 برج اسد میں ہونے سے یہ شگون لیا ہے کہ ایسے وقت میں آپ کا تجھے فنا کچھ دور نہیں ہے ۱۲

از بندگان خویش بگرداند، و تابے بصران را دیده و دیده و راں را سرمه بدست افتد۔ کشته
 نیروی جبریل و معجزه آسودگی خلیل را در نظر ما تازه کرد۔ + + + اگر دانستی که شیش خم و نمرسای
 نحو اہم کشید، و مرا اندریں بحال طلبی بر من زبان طعنہ دراز نخواہد شد۔ ازاں مخدوم بے عتاب
 پاسخ این نامہ و تفصیل ایں ہنگامہ درخواستی و پر سیدے کے دوران ہنگام کہ آتش زبان زد
 و نگہ بستران تیرگی و دود کے تابش نمودے فرارسید۔ شاہچہ می کردید؟ و نور چشم مردمی و فرنگی
 مولوی عبدالحق کجا بود؟ و پس از آنکہ رتخیز در ہمایہ آشکار شد، و ہنرا ہنر در آئین اقبال سربل
 درونی پرستاراں و بیابانی برونی ہوا و اراں چہ قیامت آورد؟ و اینہما آشوب چہ پایہ و کشید؟
 و فرجام کار۔ کہ مردہ امینی دادند۔ بر کارخانہ دواب و بنیہ و بار کھاراں (یعنی اسباب ایشاں)
 کہ اینہا را جز باطراف کاشانہ محل نیست، و بیشتر از مینا طبعہ آتش بلکہ افروزینہ (انیدھن)
 آتش ست۔ چہ گشت؟ لیکن۔ چون ارزش التفات از من سلب کردہ، و مرا نیک و در دل
 فرود آوردہ اند کہ حالیا در اں گوشہ مخاطرم جائے نامزدہ۔ ہر جہت گفتہ ام بطریق آرزوست نہ سبیل

سوال۔ والسلام

نواب مصطفیٰ خاں مرحوم کے خط کا جواب جس میں شوق ملاقات اور غزل تازہ کی خواہش
 ظاہر کی ہے اسکے اول اور آخر کے فقرے یہ ہیں ”د سحر گاہے کہ دلم از در ویشانہ چنانکہ مومن“
 مہریشہ از رخ ہمایہ در آزار باشد۔ بقرار بود، و دستم از اسلم بیابانی دل رعشہ دار یا فرزندہ سر
 از در آمد، و سپردن بہار ساں نامہ گل بہ جیب تمنا رخت۔ ہر چند نامہ سپار مس امید رکمیہ

۴۴ دل کو مومن سے اور شانہ کو ہمایہ سے تشبیہ دی ہے۔

چشمِ دوہم جاے باشد، و چون نامہ من نہ رسد بہ آرزو دار زد، گردِ سراسِ نوازشِ گردم، و بریں
پسش جاں برافشانم ++++++

مولانا فضل حق مرحوم کے مکان کے قریب آگ لگنے کی خبر مرزا کو بذریعہ خط موصول
لالمہیر لال کے معلوم ہوئی ہے اس پر مولانا ممدوح کو اس طرح لکھتے ہیں۔

دو قبلہ و کعبہ! اگر نہ ایس بودے کہ لالمہیر لال راہو اسے دیدنِ عقدا در سرا، و ناگاہ
شاہکاہے بشیرینِ تنہائی من گذر، افتادے۔ آں در گرفتنِ آتشِ گردِ آذر و والا کا شاد، و خوشن
خانہ و رختِ ہمایگاں از ہر کرانہ، و نرسیدنِ آیسے بلازماں دراں میانہ، از کجا شندوے؛
و اگر نہ شندوے ہر مینہ ہم حق دوستانہ پرستش۔ کہ شیوہ غمخواری و اندوہ ربائی ست۔ ناگزاردہ
ماندے، و ہم از دی نیایش کہ لازمہ حق شناسی و پاس گزاری ست بتقدیمِ نرسیدے۔
ہاں اسے وفادارین! بیگانگان (چوں لالمہیر لال) کا میاب پیام و نامہ، و آشنایانِ جگر نشہ
رشتہ خامہ!!

و اسے برین کہ قریب از تو بمن بنماید نامہ و اشہدُ غمِ بحرِ غمناں زدہ
”ہانا آں سوزندہ آذر سرگرمی شوق از من فراگرفتہ بود کہ بتیابانہ گردِ سرگردید، و اندراں
آتشک (شدت) زبانہ و شرارہ و خوشیتن نگہداشت۔ ہیہات من کجا وایں ہمہ دعوی بلند از
کجا!! خود نمایماے گمانِ تاثیرِ ہرود و فاست کہ مرا بدیں رنگ ہرزہ لاسے و یا نہ سراے
وارد؛ ورنہ آں را کہ از شعلہ آہ جگر سوخکاں و امن نسوزد؛ عجیب نیست اگر آتشِ افزوختہ
پیراں نسوزد۔ شکوہ پیشکش، و پنچارہ (طعنہ) بر طرف؛ خداے تو انا را شکر گویم کہ بلاے بی زینا

انصاف بالاسے طاعت است۔ بدعوی گاہے کہ توانائی قفیل را بفرودہیدگی فرہنگ
 (یعنی پسندیدگی روش) مسلم داشتہ، ولواسے نور العین واقف بشیوائی شیوہ (یعنی بخوبی
 طرز) برافراشتہ باشند۔ باکہ باید گفت کہ نتائج طبع ماکبائی ست، و ماراچہ لذت دیں جگر خالی ست
 سطرے چند کہ یدیباجلی دیوان ریختہ کسوتِ حرف و رقم پوشیدہ، و دود سوداے کہ بار اثین سفینہ
 موسوم بہ گلِ رعنا از سوید اجوشیدہ است ارمغان می فرستم و از شرم تنک مایگی آبگیرم بسلام
 شیخ امام بخش ناسخ نے اپنا دوسرا دیوان میر موسی جان کے ہاتھ مرزا کو بھیجا ہے اسکی
 رسید اس طرح لکھتے ہیں ”دریں ہنگام کہ فروماندگی از اندازہ گذشتہ و دل بافسردگی خو
 گرفته است۔ مذاقم چہ می نگارم و چہ می نگرم کہ دریں نگارستن نگہ از ناز بدیدہ و رنی گنجد، و دیز گارش
 خامہ از شادی و رہناں (سرنگشت) مے رقصہ بخت را برسانی ستایم و پندارم کہ بطور معنی
 رسیدہ ام۔ خود را بگرا نمانگی آفریں گویم و انگارم کہ موسے را بایہ بیضا دیدہ ام۔ اگر مجدوم مرا
 بگرفتن عیار ایں دعوی حیرتے روے دہد، و ایں مایہ بالاخوانی و خود نمائی از من عجیب آید۔
 گویم ہاں انصاف، سخن بہ کنایہ می سرایم نہ بگزارف۔ موسی اشارہ بہ سیدی کمری میر موسی جان
 ویدہ بیضا عبارت از دیوان فروغانی عنوان۔

نہجے دیواں کہ مدادش از دودہ چراغ طورست۔ و غلامش از دیباے حلدہ خور۔ قلم معنی
 راستینہ است، و جواہر مضمون را گنجینہ۔ +++ سبحان اللہ سخن بہ روزگار مجدوم بیایہ
 رسید، و اردو را رونق دیگر دید آمد۔ اینکہ ما رسیدن نامہ من بخاطر عاظر جائے گرفت، و مشکوہ
 آں بزبان قلم رفت۔ مرا آبرو اقرود، و از زش مراد در نظم جلوہ گر ساخت۔ خوشناس کن دریاں

سنت آرژوہ از چہ روست! بہر چند و گزیدہ ہم بر ہمیں مقام در جریہ این فن نہ سزاوارشان
 فضیلت باشد لیکن اگر تہمتا سے فرط محبت برستے بجا بہریت گناہ سے بود، و در لافانی
 آن بیوزیش نیارستے اوقاد۔

نیکم احسن اللہ خاں مرحوم نے فرمایا ہے جب کہ وہ گتے میں قلم میں خواہش کی ہے
 کو اڑاپنے اپنی کچھ نثریں بھی کی ہوں تو بھیج دیجیے اسکے جواب میں فرماتے ہیں۔
 ”دور و مند نواز! نسیم دور و دشکلیں رقم نامہ غنچہ ایں بازار پر وہ کتابے، و نسیم ایں نوید را
 غالیہ ساسے آمد کہ روزگار یکزلک تبطلول زمان فراق نقش بی اعتباری اسے سن از
 صدمہ خاطر اجاب نہ مشرودہ ترک تازہ صحر مبداء و جدائی خاکساریا سے مرا از یاد غریزاں نہ بردا۔
 دور و مرض طلب نہ فرودمانہ تر از اں میزان بے دستگاہم کہ ناکرنت (چانک) مہا نے
 غزینش از راہ دور در سر، و پچارہ بسا بگرد سراپا سے سرانہ خوشیتیں بگرد و تاشو رہا سے دور
 پستے زمان کشینے (یعنی مان جویں) فرزند دین و ایمان بن کہ بگرد و دن نثر پانگندہ پیر ختم
 و خود را دین کشاکش نینداختہ ام۔ چہ میداست کہ فرو رنجہ کلک، این کس (یعنی سن)
 نقشے ست نثر بد، (یعنی زشت) یا ستے ست فرہند (یعنی خوب) در صورت اول چہ لازم ست
 بخود را بیچ فروختن، و وبال نظارہ آیندگان بہ سلم خریدن، و در شرق ثانی اندیشہ می سجد کہ
 رفتگان چہ بردہ اند و گذشتگان چہ یافتہ کہ مارا آرزو سے آن، وایہ (یعنی در یوزہ) بنیاب اردہ۔

۱۔ اول سردی میں منتی صدر الدین خاں مرحوم متخلص، آرزوہ کا ذکر نہیں کیا گیا تھا اگر مرزا نے جب یہ خاکیا توڑا تھا
 نے ان کا بھی تذکرہ وجہ کر دیا۔

خجرام پذیرائی اس ہمہ قبول کجا؟ روزگار را از آزار خویش چگونه پشیاں گیرے کہ انجمنیں
 ساوی را بخونہ در پذیرے۔ دو دوتاں بآکا کجا قدر ناشناس پذیرے کہ دشما انقدر تالیش
 در بارہ خویش باوردارے۔ تھا کہ نہ آسان ست ستودہ شدن بہ زبان شیوایاں (یعنی
 فصحا) دو ستار تر از است اندازہ تائی باندا نہ واناں۔

”قبلہ مزد چیل سالہ جگر کاوی آنتے کہ فراہم آوردم؛ و بر فرق فرقہاں ساسے افسانہم
 (یعنی مجموعہ نظم فاسی) اکنوں آیم ہداں روانی و آتشم ہداں گرمی نیست، گوئی پس از بختن آں
 گنج گنجداں رفته، و بختن ہر چہ ازل آذر و من بود گفتہ شد۔ + + + + +

نواب مصطفیٰ خاں مرحوم نے تذکرہ گلشن بیے خارا کا مسودہ مرزا کے مطالبے کے
 لئے بھیجا ہے اسکو دیکھ کر مرزا نے نواب صاحب کو یہ خط لکھا ہے دمن کہ زبانم در تالیش
 بقرارست و اندیشہ در سگالیش (مشورہ) گسرخ۔ امید کہ درآں پایہ بزمہ خوشامد گویاں شمرہ
 نشوم، و بدیں باہر جرات بزمہ مند نگردم۔ بنامیرد (چشم بد دور) تذکرہ ترتیب یافتہ و مجموعہ فراہم
 کہ پیش طاق بلند نامی را نقش و نگارست، و تہال نکو سر انجامی را برگ و بار۔ ہر و نظروں
 بہ بیدارے کنار باب ^{مستطی} ایسے ذوق سخن گام تا شاہ بردارد تو شہ بہ ازیں بر مکتوب اندست۔ حضور
 یا آں ہمہ جگر فشلی کہ سکندر و شہرت لبش بر شہرے آسے تر نتوانست کرد؛ و آں اب از دیا بخشیدن
 بود۔ شاہ گروہے را از دور و نزدیک سخن زندگانی جاوید بخشیدید؛ و ایں لختے از عمر کار دیگر اں
 کردن ست۔ جاوداں زندہ باشند کہ سخن گویاں از شاہ زندہ جاوید شدند۔ و ہنگناں را بہ نکوئی
 نام برآمد۔ بارے گزشتن خامہ و گوہرین نہ گشتن نامہ در ردیف الف بہ نگارن شاعر وین شاہ

تحریر درمیاں نہ گنجد، و میاں بجی گری خامہ کار پر نہ باید۔ اُسے نگارش یکدست است و گفتار
 نخست تخت۔ ستر دن یک لفظ از میانہ، و آوردن لفظ دیگر بجائے آن بر نشانہ۔ و انا شناسد
 کہ چہ مایہ گفتگو و چہ قدر پرس و جو دارد۔ و حق ایں پیش تنواں گزارد۔ مگر بہزبانی۔ وریں
 ترویجی کیے از برادران۔ کہ در برادران از دے عزیز ترے نیست۔ سخن ہاسے پر اگندہ مرا کہ
 عبارت از ترست۔ گرد آورده، و صورت سفینہ دادہ است۔ نہیں پس اُن مجموعہ پریشانی یا
 پیش شہامے فرستم بتا و ستہایہ سگالش در سخن و باز نہائندہ اندازہ کوئی فن تواند بود + + + + +
 نواب مصطفیٰ خاں مرحوم نے۔ جب کہ مرزا کے نیانیا تعارف ہوا ہے۔ مرزا کو خط
 لکھا ہے اور اسیں اُنکی شاعری اور نکتہ سخن کی بہت تعریف کی ہے، اپنے نتائج افکار میں
 سے کچھ اُنکو بھیجا ہے اور اُن سے تازہ غزلوں کی جو حال میں لکھی ہوں درخواست کی ہے۔
 مرزا نے اُسکے جواب میں جو ایک طولانی خط لکھا ہے اسیں ایک لمبی تمہید کے بعد لکھتے ہیں۔
 ”تاؤ کا تم در کشادہ بود، و رنگ رنگ متاع سخن بروے ہم نہادہ؛ کس از مشترباں حلقہ
 بر در ترود، و سوداے خریداری از بیج دل سر برزد۔ چوں دُکال را کالا، و زباں را حرفا
 جگر آلا (یعنی اکودہ بخون جگر) نماند۔ روزگار گرانمایہ خریدارے (یعنی نواب مصطفیٰ خاں) پدید آرد
 کہ نقد راج سخن خود را بہ ہائے گفتار تا سرے منی دہد؛ و گوہر را بہ پلہ بیجانگی خرف می نہد۔
 + + + + + ہاں وہاں اُسے خریدار دُکان بے رونق! از فراوانی مسترت و رود مسعود
 ہایوں نامہ چہ گویم کہ مرا۔ با آنکہ نکوئی خواہ خوشیم۔ برین بر شک آورد۔ حوصلہ مرا۔ کہ فرسودہ
 عنہاے دہرم۔ گنجائی ایں مایہ شادی کو؟ و اندیشہ مرا۔ کہ دل شکستہ دور باش یا راحم۔

و کوتاہ دم باشتم، و بزرگاں وطن را بیا و نیارم، در عالم انصاف بزه مندیستم۔ اما اگر انما یکاں
 جهان مهر و وفا۔ کہ از دور افتادگاں نپرسند و از مرگ و حیات دوستاں باز بخونند۔ اگر گفتگو بیا
 آید، و سمند شکوہ عثمان بر عنان (یعنی بقایا یکدیگر) تاز و گوے دعوی چگونه خواهند برد، و
 قطع نظر از حریت آب و دناں (یعنی حریت مغلوب) کہ منم۔ خدا کے تو انار اچہ جواب خواهند داد“
 ”کس از اہل وطن غمخوار من نیست مراد دہر نپداری وطن نیست“
 مولوی نور الحسن نامے ایک نوجوان نے کلکتے سے مرزا کو خط لکھا ہے اور اُسکے
 ساتھ ایک نثر کا مسودہ اصلاح کے لئے بھیجا ہے۔ اُسکے جواب میں جو خط مرزا نے
 لکھا ہے اُس میں لکھتے ہیں۔ ”پیدا آمد کہ خاطر عاطر را بجانب نثر گراشتے، و ہنگامہ ایس
 گفتار (یعنی نثر نگاری) را در انجا (در کلکتہ) آراشتے بہت بارے ہم دل پسندیدہ شعلے
 خاودہ آید، و ہم اندر یں فن گزیدہ روشے پیش گرفتہ آید۔ دم سردی شاد (یعنی کم شوقی شہما)
 بہ دانش آموزی۔ انچہ دیروز (یعنی در زمانہ گذشتہ) بہ کلکتہ دیدہ ام۔ یاد میکنم؛ و خوں گرمی شہما
 (یعنی سر گرمی شہما) در خرد اندوزی۔ انچہ امروزے نگریم خود را بیدیں شادی کخم ہمانا در اندیشہ
 نہالے برگزردارم بیاں زودوی۔ کہ نثر از شاخ افتد۔ تھلے شدہ، و رطب بار آوردہ؛ ہانے نے
 ہنگامہ یوسفے در نظر دارم بیاں خوبی کہ دل از فرشتہ رہاید۔ از بند حجاب بدر آمدہ، و ہر مہمت
 کردہ۔ خواستہ آید کہ مسودہ نثر در ہر ماہ مین فرستید، و من آں را نگرستہ، و نشست ہر کثرتہ و انگیزہ
 بذلہ را بابت سگی آراستہ بشما فرستم۔ صاحب مین اگر ندانستہ آید کہ گفتار چہ گفتار سفر گزود، و سخن جز بہ سخن
 شناختہ نشود، ہر چند ارادت شہا ذریعہ سعادت مین و فرسندی شہا موجب رضا مندی مین است لیکن

کہ در باد غفلت پر قدح دآستم (یعنی بقیہ ہوا و ہوس و سر بود) نکتے از عمر یہ پیو دیں جاوہ کا فرانی
ہوس گذشت، و بے راہہ خرامیدہ شد تا سر از مستی بگردید (یعنی بستی سے سر بچ گیا) و
اندر اں بخودی پاے مصطبہ پایہ گوے فروفت در گٹھے میں اتر گیا یعنی ایک ایسا صدمہ
پہنچا کر نشے ہرن ہو گئے) لاجرم در ہم شکستہ سراپاے او گردانڈوہ سرور وے ایر خاستم
ہنگامہ دیوانگی برادر یک طرفت، و غوغاے وام خواہاں یک سو؛ آشوبے پدید آمد کہ نفس
راہ لب، و نگاہ روزنہ چشم، فراموش کرد؛ گیتی بیں روشنی روشناں در نظریہ و تار شدہ
پا بے از بخن دوختہ، و چٹھے از خویش فرو بستہ۔ جہاں جہاں شکستگی، و عالم عالم خستگی، یا خود
گرفتہ۔ و از میدان روزگار نالال، و سینہ بروم تیغ مالال، بلکہ رسیدم۔ فراتندہاں سرزبری
و کوپک دلی (یعنی مہربانی و شفقت) کردند، و دل را نیز بختیدند۔ اک ہمہ بختایش کہ شاہدہ
رفت۔ امید کشایش آورد، و ذوق آدرگی و ہوا سے بیاباں مرگی۔ کہ مرا از دلی بدر آوردہ
بود۔ بدل نہ ماند۔ و ہوس آشکدہ ہاے یزد و میخانہاے شیراز۔ کہ دل را بسوے خود کشید
و مرا بہ پارس می خواند۔ از ضمیر بد رخت۔ (یعنی بشاہدہ شہر کلکتہ جملہ ہوسہا از خاطر بدر رفت)
دو سال در اں بقعہ تجا در بودم؛ چوں گور تر جنرل آہنگ ہندوستان کرد پیشا پیش و دیدم،
و بدہلی رسیدم۔ روزگار برگشت، و کار سامتہ شدہ۔ صورت تباہی گرفت۔ اکنون ششیں
سال است کہ خانہاں بباد و اندہ، و دل بر مرگ ناگاہ نہادہ، بکنجے نشستہ ام؛ و در بامینش برو
بیگانہ و آشناستہ۔

”من اگر با اینہم پنج و اندوہ۔ کہ پارہ ازاں باز گفتم۔ در نگارش نامہ و سپارش چہ ایم کاہل ظلم

سخن را از فراوانی بزرگسایان ہم افتادن است؛ و گره در گره گردیدن و من آن می خواهم کہ اندک گویم، و سود بسیار دہد، و شغونہ آن را زود در یاد و این بسیج (قصہ) روانی پذیریت مگر آنکہ گویندہ در آن کوشد کہ نیشتن از گفتن آن مایہ نور تر زود کہ سیر این ہر دو رشتہ با ہمدگر نتوان یافت؛ و نقش یکے در آئینہ دیگرے نتوان یافت۔ زمانے گوش بہن دارید و فراسید کہ چہ می گویم، و ازین گفتن چہ می خواہم، و شمارا در برابر آن چہ می باید کرد، و اندازہ آن با ست نامکجا ست، اسکے بعد کچھ خانگی معاملات تحریر کتے ہیں۔

میراعظم علی اکبر آبادی مدرس مدرسہ اکبر آباد جو میرزا کے ہموطن ہیں اور انھوں نے بیس برس کے بعد مرزا کو خط لکھا ہے اور خط نہ پہنچنے کی شکایت کی ہے انکے خط کا جو اس طرح لکھتے ہیں۔

امروز شرارہ بداعسم زدہ اند نشتر بر گ صبر و فراغسم زدہ اند
از کثرت شور عطسہ مغرم ریش ست تا عطرحہ فتنہ برداعسم زدہ اند

جنبش خامہ عیسوی ہنگامہ مطاع مکرم مخدوم اعظم رانا دم کہ یہ احیائے ہوسنی سے مرودہ صاحب خاطر اعرصہ محشر ساخت، و بازار رستخیز گرم کرد، خار خار ویریں آرزو ہا سراز وں بدر آورد؛ و یاد آمد کہ مرا ہم در گیتی وطنے، و از مہربانیاں انجمنے بودہ است۔ چون نشتر پرش بمغز اندیشہ فرو برد اندر یعنی احوال پر سیدہ اند (خونچکانی نوا ہا تاشا کردنی ست۔ و رازی زمان فراق۔ کہ گمان مخدوم شانزدہ سال ست و بدانت بنامہ نگار کم از ست سال است۔ ستریز کرنگے بودہ است کہ نقش آسایش از صفحہ خاطر بدیاں ستردہ اند۔ آغاز و رود بہ دہلی۔

انتخاب از مکاتبات

مرزا کی نشر فارسی کا سب سے بڑا حصہ اُنکے مکاتبات و مراسلات ہیں جنہیں سے اکثر بہت صاف اور سلیس ہیں اسی لئے ہم اس حصے میں سے بہ نسبت اور نثر کے کسی قدر زیادہ انتخاب کرینگے اور جہاں تک ہو سکیگا مشکل فقروں اور دقیق عبارتوں کے نقل کرنے سے احتراز کیا جائیگا۔ اور نیز جو امور مرزا کے خانگی معاملات سے تعلق رکھتے ہیں اُنکو بھی چھوڑ دیا جائیگا۔

مرزا علی بخش خاں فیروز پور جبر کے میں ہیں؛ نواب احمد بخش خاں کا انتقال ہو گیا ہے اور اُنکی جگہ شمس الدین خاں مسند نشین ہوئے ہیں۔ مرزا نے علی بخش خاں کو کلکتے پہنچ کر خط لکھا ہے اُنہیں لکھتے ہیں۔

”میر فضل بولے خاں نام یارے د اتم؛ اور انا گرفت ز آگاہ در عرضِ راہ بہ مرشد آبادیتم در نور و گفتگو ہائے و پرس و جو ہائے کہ رفت۔ از جامہ گذشتن دینی از مردون فخر الدولہ بہادر بن خبر داد؛ و باز یہ کلکتہ مرزا افضل بیگ و دیگران برگشتند۔ آو خ ایک چراغ روشن این قوای مُرد و شبستان آرزو ہاتیر و مار شد۔ از جانبِ شما اندیشناکم؛ و دانم کہ انچہ شما را پیش آید دلخواہ بناشد۔ نا کساں را روز بازار خواہد بود؛ و فرومایگان را گرمی نہ گامہ زودا کہ انجن از ہم پاشند؛ و پراگندہ چند گرد آئند۔ دولتِ روسے گرداند؛ و آسودگی بر خیزد۔ زمینار ہوشمندی را کار بایدست؛ و موارید بخود نگران باید بود۔“

ایک اور خط کو جو علی بخش خاں کے نام لکھا ہے اسطرح شروع کرتے ہیں ”جانِ بادر!“

داو کہ بد میدن پرده شکیب نظار گیاں نہ درو.

اَل اثر پرده سازت چه شد زمزمه خارہ گدازت چه شد

اَل ز جہنوں پرده کشائیت کو دلوایہ سلسلہ خائیت کو

اَل نفسِ نالہ کندت کجاست دالِ نگہ جلوہ پسندت کجاست

گفتی (یعنی در جوابِ گفته) کہ سوزِ غم و دوازدل بر آورد، و گدازِ نفسِ آذر در زباں زد.

بادے کہ ہر آئینہ نگہ اخت، و باز بانے کہ ہما ناسوخت، عذرِ غمزدگی مسموع نیست. بیایا ہا ہیں

دلِ پذیرہ الخدز نو اے را سخن نہیم؛ و ہمیں زبانِ کز نغمہ این المفسر سراسے را بقتار آریم

(یعنی طوعاً و کرہاً تقریظ دیوانِ تفتہ بزرگواریم)

زمن جوے در بند نکوزیستن جگر خوردن و تازہ زو زیستن

سمن چیدن و در رہ انداختن دل افشردن و در چہ انداختن

(مراد از سمن چیدن و در رہ انداختن آنکہ بر ہنگناں اظہارِ خوشحالی می کنم و اندوہ درونی را

کہ دل افشردن عبارت از ازلست در چاہ می اندازم تا بر ہچکس ظاہر نشود)

رواں کردن از چشم ہموارہ خوں پشور آبِ شستن ز رخسارہ خوں

تنگستن ز دانع کہ بردل بود تنگتن شرارے کہ در دل یود

سایش سخن چشم بد دور خلمد سخن را شرابے ست پُر زور کہ زیں ازاں یہ لائے

(یعنی بُردے) و سپہ ازاں بیوے آنچناں برقص آید کہ اگر کعبہ را حجر الاسود از دیوار و شتری

را عامہ از فرق فرو دافتہ شگفت نماید.

دل و زبان خوں شد؛ و اگر تا کہ از دل بزبان رسید۔ والا سچی ہمت اں را انجامہ سپرد۔ چہ
 منش (طبیعت) کہ یزدانی سرورش ست در سر آغاز تیز گزیدہ گو سے و پسندیدہ جو سے بود۔
 آتا پیشتر از فراخ روی (یعنی بسبب آزادہ روی) پے جاوہ نشناساں برداشته؛ و کثرتی
 ز قمار آناں را تعرش متانہ انگاشته تا ہمدراں نگاہ پوش خراماں را بختگی از شرم مقدمی
 (یعنی لیاقت ہمدراںی خویش) کہ درین یافتند۔ منہ بجنبید، و دل از آرم (مرگوت) بہ دور
 آمد۔ اندوہ آوار گیہا سے من خوردند، و آموزگار از درین نگرستند شیخ علی خریں بجنہ
 زیر لبی بیراہہ رویا سے مراد نظم جلوہ گراخت؛ و زہر نگاہ طالبِ اعلیٰ و برق چشم
 عرفی شیرازی مادہ آں ہرزہ جنبش سے ناروا در پاسے پیاسے من بسوخت۔ ظہوری
 بسرگرمی گیرانی نفس (تا شیر کلام) حرز سے باز و دوشہ بکریست؛ و نظیری لا ابالی خرام
 بہنجا رخاقتہ خودم بجالش (ز قمار) آورد۔

دیوانِ تفتہ کے دیباچے کی تمہید میں ضعف و انحطاطِ قومی اور اپنے قلبِ مہمت کو
 اسطرح بیان کرتے ہیں۔ "ہاں اے غالب تیرہ روزہ درم اختر کہ بدین سستی و کسالی (شخصیت)
 کہ تراست۔ بدال مانی کہ دانی در عالم فرضِ محال پسندے دیدہ ایم بر آتش آرمیدہ۔ اللہ اللہ
 چہ مایہ جوش سودا ست (یعنی غلبہ مادہ سودا) کہ ہر نفسے کے مے کشی۔ چوں خطے کہ از نقطہ بر آوردند۔
 ہر نگاہ سودا ست۔ اکل قلم و اندیشہ۔ کہ از روانی خامہ و روانی گفتار آب و ہوا داشت، ماوے
 منش را فرو روین پرتار بود، و چاشتگش را نسیم سحری پیشکار۔ بدین ناخوشی و زہری پراں
 چراست۔ سبزہ را چہ افتاد کہ بہ چمپیدن دل از دست تماشا میاں نبرد، و عنخہ را چہ روسے

اہل جاہ سیاہ کر دسٹم۔ دریا کہ عمر سب سیر تختے بہ چاہے و چنگ سر آمد؛ و پارہ بدر فرع و درین رفت۔
فرجام گراں خوابی برنخواست؛ و آشوب ہوسناکی فرو نہشت۔

خاتمہ دیوان فارسی میں اس بات کا عذر کہ دیوان کی تکمیل میں کیوں اس قدر غیر
لگی کہ اکتالیس برس کی عمر میں اسکے چھپوانے کی نوبت پہنچی۔ اس طرح کرتے ہیں کہ فکر
نہایت خود سراور بلند پرواز تھی اسکی روک تھام میں بہت سا زمانہ گزر گیا۔ اور اس مطلب کو
اپنے طرز خاص میں یوں ادا کرتے ہیں۔

”ہاں وہاں رختے بہاں تو سنی کہ عنانش سوے و شامش بوے بر تافتے، و از
شموسی (سرکشی) گام بد رازی نہادہ جز بہ پہنا نہ شتافتے۔ از تر سندہ دلی عنانش کشیدہ،
و یہ لایہ آواز بوسہ اش آرمیدہ داشتے۔ چون پارہ از راہ بدیں گو نہ کہ بر شمر دم۔ بریدہ شد،
وروز بلند گشت؛ ہم جوش تندہی تو سن فروشت، و ہم دست و پاے سوار از عنان در کاب
خستگی پذیر آمد۔ تاب مہر نیم روزہ معز در سر سوار گرداخت، و تفتگی ریگ بیاباں نعل در پاے
تکا و رزم کرد۔ راییض را دم و کرہ را قدم بگذازد آمد۔ ہم آپ بہ آخر گرایند، و ہم اس را بہ بستر
نیا ز آمد۔ توانائی بہ چارہ سگالی تو سنی سر آمد؛ و در ہنگام گستہ دی خستگی روے آورد۔ +
+++++ کیست تا از من پرسد؛ و اگر نا پسیدہ گویم در دلش فرو دآید، کہ دیر سی سال
بہت را با فطرت چہ آویزش (یعنی جنگ) روے دادہ؛ و پس از انکہ کار بہاں جا رسیدہ
کہ ہمد گراں کو قلی فرو ماتند۔ بیابانی گری توفیق بکدام قرار و آشتی اتفاق افتادہ۔ خانہ دیریش
بود، و شوق زود گراے؛ (جلد باز) گفتار با از نسیب دور باش اندیشہ بدر از نامے فاصلہ

نہا شد۔ مہر جلوہ بر تابد، و ذرہ بیتابی، و بحر روانی، و قطرہ شلم، دل را کہ گفته است کہ از شورش
ستودہ آید، ہمانا بدانت است، ایں گروہ بادہ در نجاتہ توفیق ہماں قدر بود کہ حریفان گذشتہ را از دماغ
ساختہ، حالیا بساط بزم سخن بر چیدہ، و جام و سبوبر سر ہم شکستہ، و ازاں قلزم قلزم را وقی
بر جاکے نامزدہ، پندارند کہ کاش با بختی۔ کہ من در فردیں روزہ (یعنی صفت پائیں) بہ حلقہ
او باش قدح می گیرم۔ قرار سند تا دار سند کہے فراوانست، و ساتی بے دریغ بخش، بپایان
جرعہ زیرست، و لبھا العطش گوے۔ و شدہ در من قال۔

ہنوناں ابر رحمت در نشان ست مے و مینانہ با مہر نشان ست

اے صبا کے سخن بہ روزگار من از کنگلی شدہ پوزورست؛ و شب اندیشہ را بہ فرد میدان
سپیدہ سحری برات فراوانی نورست۔ ہر آنہ رفقاں سرخوش غنودہ اندو من خرابستم،
پیشینیاں چراغان بودہ اند، و من آفتابستم۔

اے بعد ایک جگہ اپنے تمام غر و مباحات پر افسوس کر کے اس طرح لکھتے ہیں در انصاف
بالا کے طاعت ست۔ در ہوا کے کہ بال بالا خوانی (یعنی خود ستانی) زدہ ام، و در آواز
کہ خود را بہ تکرانی ستودہ ام، نیمہ ازاں شاہد بازی ست؛ یعنی ہوا پرستی۔ و نیمہ دیگر تو اگر ستانی
یعنی باد خوانی، پیداویں کہ ہر جا نشانہ تھے از زلف مرغیہ مویاں کشودہ شود۔ بلا دریں آمیزد
تا دل یہ پچاک آں شکن بندے۔ و خواری تکر کہ ہر گاہ از خود غافل و از خدا فارغے براوردیگ
سروری کج نشیند۔ ہوس مرا برا نگیزد تا بہ پیش بندہ دارست آستے۔ شادم از آزادی کہ بسا
سخن بہنجار عشق بازاں گزار دتم، و داغ از از مندی کہ ورتے چند بگردار دنیا طلبیاں در مرج

ہر سہفت کردہ معنی بجنیش نسیم بر آقاوہ، یعنی تنگ کشاکش دست ناکشیدہ۔ باز پسین چربا
 از گرمی چراغان نیم سوختہ پہلو رخ با فروختن دادہ، یعنی داغ مشت خس ناویدہ۔
 ایک جگہ اس مطلب کو کہ خدا تعالیٰ نے مجھے جیسا داغ معنی خیز دیا تھا ویسا ہی معنی کی
 قدر قیمت پہچاننے اور اس کے بیان کرنے کا ملکہ بھی عنایت کیا۔ اس طرح بیان کرتے ہیں
 ”و سخن آفرین خدا سے گیتی آرا سے راستایم کہ تا نہا تخانہ ضمیرم را از فردانی زنگارنگ معنی
 یعل و گہرناشت، باز دیم را ترا زوی عرجاں سنجی و خامہ ام را ہنگامہ گریاشی از زانی دشت۔
 اب ہم کچھ کچھ عبارتیں دیباچوں اور تقریظوں سے انتخاب کر کے ہدیہ ناظرین بالکین کرتے ہیں
 دیوان فارسی کے دیباچے ہیں ایک جگہ اس مطلب کو کہ لوگ مجھے اکتسابی علوم سے
 بے بہرہ سمجھ کر میرے حسن بیان پر تعجب اور میرے کمال سے انکار کرتے ہیں۔ اس طرح بیان
 کرتے ہیں ”لا سے تخم میخانہ سردی نیست ناچشیدگاں۔ سگالند کہ بچھرانے را این مایہ سیرابی
 نطق از کجاست، غافل کہ نم رشویک شین ست کہ سبزہ را دیدن، و نہال را سر کشیدن،
 و میوہ را رسیدن، و لب را ز غمہ آفریدن آموخت۔ و بہر تو متاب ازلی ہدایت شکیز کردگاں
 اندیشند کہ تیرہ سرا نجامے را این ہمہ روشنائی گفتار چراست، بے خبر کہ فترۃ تابش یک نورست
 کہ شمع را بہ شعلہ، و قندح را بہادہ، و گل را بہ رنگ، و دروں را بہ سخن برافروخت۔ +++
 و اعظم از کوتہ نظر اں تنگ چشم کہ دیدن تازہ گل از گیاہ، و درخشیدن برق بشہائے سیاہ،
 شگفت ندارند، و خبیثین ز بانہائے گویا بہ سخن ہائے نغز دشوار انگار نہ بچھہ مشکین نفسست،
 و باد غالیہ سائے، و گل کشادہ روئے، و بلبل نواسنج، و زباں چہ گنہ کردہ است کہ سخن ہر اسے

دیوان
 فارسی

اور کیا ہے اس لئے جب تک کرائے ایک ایک فقرے کی شرح نہ کی جائے عام ناظرین
 اُن سے کچھ لذت نہیں اُٹھا سکتے اور اس صورت میں ظاہر ہے کہ کتاب کا حجم زیادہ بڑھ جائیگا
 جسکی وجہ سے کتاب کا مطالعہ ناظرین پر شاق گزریگا لہذا اُن نثریوں میں سے صرف اس قدر
 انتخاب کیا جائیگا جس سے مرزا کی ان جزیل اور گراناہ نثریوں کا کسی قدر اندازہ ہو سکے۔
 اس غرض کے لئے ہم تولیہ اور مثال کے مختلف مقامات سے مختلف متناہین کے
 کچھ فقرے لکھ کر دکھاتے ہیں کہ مرزا کس طرح معمولی باتوں کو تشیل اور استعارے کا لباس
 پہنا کر بلند منظر پر جلوہ گر کرتے ہیں۔ مثلاً کتاب بیچ آہنگ کا دوسرا آہنگ۔ جو مرزا نے
 اپنے نسبتی بھائی علی بخش خاں کی خاطر سے لکھا ہے اور جس میں اپنی طبیعت کے آقوں کے
 خلاف زبان فارسی کے متعلق کچھ ابتدائی قواعد اور ہدایتیں تلبدن کی ہیں۔ اُسکے اول
 میں ایک تمید لکھی ہے جس میں طرح طرح سے یہ ظاہر کیا ہے کہ اس بھیکے سیٹھے منعمون پر کچھ
 لکھنا میری طبیعت کے بالکل خلاف ہے۔

وہاں ایک جگہ مندرجہ ذیل کی نسبت لکھتے ہیں: "میں نے شور کہ چون ذوق سے دور
 نیست ز اہر بیچ کلبں را در بنمایشہ در خاک نہ ذوق و نہ اس کے ناستوار کہ ہر دیوار کہ دران
 ریساں برکشہ پیش از سایہ ثور بنماک افتد۔"

فارسی دیوان کے دیباچے میں ایک جگہ اس مطالبہ کو کہ دیوان غرور اور اُسکے
 نو اور افکار میں آواز اور تشبیہ یا کسی استاد کی بلا و اسطہ تعلیم اور ہدایت کو مطلق دخل نہیں ہے
 اس طرح ادا کرتے ہیں "بنامیر و دینی چشم بد دور نختیں نقابے ست از روئے شاہر

نازم بجزام کلک طرزِ قشش نامست ز تیزی بدم تیغ و شش
 چوں اسم کتاب قاطع بران بود گردید درفش کاویانی غلشش
 ماشاک در هیچ محل از عقیدہ خویش رجوع کردہ باشم۔ سرودن سخماے ریزہ (متفرقہ)
 جزا فرو دن ہوش انگیزہ (سبب و باعث) نثار دیاراں جفا کنند، ومن بہ اِزاے ہر جفا
 (بعض ہر جفا) وفا و رزم۔ ہمانا کوئی وہی یاراں خواہم و بس۔ بندہ نہندا، پند دہم۔ داد و دین
 دارند، اندر زور دین نذارم۔ سنگ زنتہ، ثمر بارم۔

از تقریبات و دیباچہ ہا

مرزا نے جو تقریبات اور دیباچے اپنی اور اپنے دوستوں کی کتابوں پر شریں لکھے ہیں
 ان میں جیسا کہ اوپر بیاں کیا گیا شاعری کا عنصر نظم سے بڑا غالب تر پایا جاتا ہے۔ وہ ہر ایک
 معمولی بات کو پیش اور استعارے کے لباس میں ظاہر کرتے ہیں، فقروں اور آئکے اجزا میں
 عموماً ایک خاص قسم کا وزن اور قول اور اکثر صبح کی رعایت ملحوظ رکھتے ہیں، اکثر کچھ صفات
 شوالیہ و متابعہ ایراد کرتے ہیں اور صفات مرکبہ جو نظم کے ساتھ خصوصیت رکھتی ہیں اکثر
 استعمال کرتے ہیں۔ پس سوا اسکے کہ یہ شریں شعر کے اوزان مخصوص سے جھکوا سکی ماہیت
 میں کچھ دخل نہیں۔ مگر ایک اعتبار سے ان پر شعری پوری پوری تعریف ملوث آتی ہے
 چونکہ یہ شریں مرزا نے خاص کر اپنے عالی دماغ اور کتبہ سنخ معاصرین کی عنیافت طبع
 کے لئے لکھی ہیں اور ان میں اپنی نوائیں طرازی اور نادرہ سنجی کا۔ جیسا کہ چاہے۔ حق

نگر د کہ ز بس تیزی در جو ہر لفظ فرد روز و تا چگونگی پیوند الفاظ کہ انگیزش گاہ معنی ست آشکار
 شود ہر گاہ آل را بہنچا راہل زبان نہ بیند۔ دانند کہ در سو اسے زبان دانی جز زیاں نہ بیند۔
 و گراں داند و کارا ناں؛ مرا نیز خردے و روانے دادہ اند۔ فراز آوردہ (پیش آوردہ) اندیشہ
 بگائنگاں را چوں نیریم؟ و از نیردے خرد خدا داد کار چرا نگیرم؟ ہستی بخش را سپاس کہ نیر و فرا
 دانش من دانشمند کسے ست کہ اگر چنانکہ راز داں بود۔ راز گوے نیز بودے ششیں ^{۱۱} ساسان
 بشمار آمدے۔

نہ نام کبیس چوں کبیس مے نام	ز خوشیاں بگائنگی شاد نام
چہار سہر افراز در بوستانم	غریبم و لے روشناس غریزاں
گرفتہ کہ از نسل سلجوقیانم	گرفتہ کہ از تخنیم افراسیابم
رہ در سہم کشور کشائی نہ نام	دل دوست تیغ آزمائی نہ نام
بہمنار پہلو زبان۔ پہلو نام	بیدان معنی حسد و نیر خشم
سز و گر نویسند صاحب تر نام	دو سی سال تو قیج معنی نوشتم

قاطع برہاں۔ کہ صنعت نقشید خیال من ست، نہ نامہ اعمال من ست کہ در اں جہاں
 بمن خواہند سپرد۔ ہدیریں جہاں خواہانند۔ در دل فرد و آمد کہ بقائے چند کلاے چند بفرایم،
 و ایں مجموعہ را کہ قاطع برہاں نام نہادہ ام۔ سپس درفش کاویانی خطاب دہم۔

۱۱ مراد اداں مولانا عبد اللہ استاد میرزا ست ۱۲ ساسان نام سپہ سالار بن اسفندیار بود کہ از پادشاہی بیعت و تحصیل مکت در یافت برداشتہ و کس
 از اولاد و کسے نیز بطریقہ دہے دودہ اند و ایں ہر چہ ادا ساسان اول و دوم و سوم و چارم نامیدہ اند من بعد پس از خسرو پر دیز ساسان نجم بطور آمدہ کہ
 دساتیر از دہنت نرد در زبان دری ترجمہ کردہ ۱۳

ایک ہزار لشکر نگری ہم بے لشکر آراے آرہے، و بسا سپاہ مہنی کیسہ رہے سپہدار
 ییچنگ برخاستہ۔ توپ و گلولہ و ساچمہ (چھرا) و بارود ہمہ از خانہ انگریز آوردہ، و با گنجینہ دارا
 روئے بتیز آوردہ۔ آئین نیرو و ورزش پیکار ہمہ از انگریز آموختہ، و رخ بکین آموزگار
 فروختہ۔ دل ست سنگ و آہن نیست چراغ نور و چشم ست رخسہ در وزن نیست چون نگریہ؟
 آری ہم براغ مرگ فرماندہاں بایہ سوخت، و ہم برویرانی ہندوستان بایہ گریست۔ شہر ہاے
 بے شہر یاہ پیرا بندہ ہاے بے خداوند، چنانکہ باغ ہاے بے باغباں پیرا درختان باروندہ
 بہرن از گیر و دار آزاد و بازار گاں از تمنا، خانہ و ویرانہ و کلیہ (دوکانہا) خوان یغما۔

از دیباچہ ثمانی در فتنہ کاویانی

غالب خاکسار برزہ کارا از آسماں بز می فرساوند، و فرماں دادند کہ دریں بیشہ نشیہ کشاورزی
 (کشکاری) و رزد، و ایس فرزماں (فرماں) را با زماں (توقت) نہ پسند و ناگزیری با نیست
 (ضرورتاً) کہ زمین خستہ، گا و راندن و دانہ افشاندن، ناداں (کشاورزی نکرد) بلکہ
 بہوس در زمین غل جاں کند، و از اں گہرا کہ با خویش آوردہ بود نیمہ دراں زمین پر آگندہ
 ہمانا (گویا) از ہر دانہ کہ کاشت ہزار دانہ چشم داشت۔ از مردارید کہ در خاک نہاں کنند شنیذہ؟
 کہ ریشہ سر برزند کاش جو کاشتے تا سود برداشتے۔ دانست کہ ہمہ را خاک خورد، (یعنی تلف
 شد ناچار) نیمہ دیگر را پیش شاہان روزگار برد۔ دیدند و پسندیدند و خریدند۔ شبے با یکے از
 رازداناں پر و ہش (پریش) رفت کہ در سبب آفتابن نخل نیست، ابر براغ و رانغ و سمن و سن
 یکساں بارود، چراست؟ کہ مردم چندے نادار و اندے (چندے) تو نگزند۔ گفت راست گفتی؟

نوبہار نشد۔ ہاے ااں جہاندارانِ داد آموز دانش اندوز نکو خوئے نکونام، واہ ازاں
خاتونانِ پری چہرہ نازکِ ندام، یارِ خنّی چوں ماہِ دستے چوں سیمِ خام؛ و درینِ ااں کو دکانِ
جہاں نادیدہ۔ کہ در شگفتہ روئی بر لالہ و گلِ محی خندیدند، و در خوشخامی بر یکیک و تندر و آہو
مے گرفتند۔ کہ ہمہ یک بار بگردابِ فوں فرو رفتند۔ اگر مرگ بر بالینِ ایں کشتگاں بموید (بگریہ)
خروشند، و دریں سوگ سیاہ پوشند، رواست؛ و اگر سپہرِ خاک گردد و فروریزد، و دریں سر سیمہ
چوں گرد از جا برخیزد بجاست۔

اے نوبہار چوں تنِ بسیلِ نچوں بخلط اے روزگار چوں شبیہِ ماہِ تارشو

اے آفتابِ روئے بیلِ کبود کن اے ماہتابِ داغِ دلِ روزگار شو

بارے چوں ااں روزِ تیرہ بشام رسید، و گیتی تاریکتر گردید، سید درونانِ خیرہ کُش
(بخیرگی گنشده) ہم در شہرِ جا بجا رختِ تنِ آسانی انداختند، و ہم در آرکِ باغِ خسروی را آخر
اسپاں و نشینِ شاہی را خوا بگاہِ خویش ساختند۔ رفتہ رفتہ از شہرِ ہاے دور دست آگهی
رسید کہ شوریدگانِ ہر سپاہ، در ہر فرد آمدنِ گاہ، (مترل) خونِ سپہداں رنجتہ اند۔
گرد ہا گروہ مردم را از سپاہی و کتا و زردل یکے گشت، و ہمہ بے آنکہ با ہم سخن رود۔ و در نزدیک
یکدست بر یک کار کمر بستند؛ و انکاخہ چساں پر زور کمرے و چگونہ استوار بستنی کہ جز بہ جنبشِ
جوشِ خونے کہ از کمر گذر و کثاد نہ پذیرد۔ پنداری ایں لشکر ہاے بے مَر و غلبگیو یانِ بشمار
را جا رب و دار کمر بند کیست۔ اے رقت وروبِ ہند بومِ ہداں ساں کہ آرامش و
آسایش اگر جویند۔ باندا زہ پر کاہے گاہے نیابند، بچین جا رب گیتی آشوب ہی خواست۔

در زمیں کز زلزلہ نے رود؛ در اں روزِ جہاں سوزِ بختِ برگشتہ و سرگشتہ چند از سپاہ
 کینہ خواہ میرٹ بشہر درآمد؛ ہم بے آرم و شور انگیز و بختِ اندکشی تشنہ خونِ انگریز دیدار
 دروازہ اسے شہر کہ پڑوں (علاوہ) از گویہری و ہم پیشگی تشگفت (عجب نیست) کہ ہم پیش
 ہم سو گند نیز باشند ہم پاسِ نمک و ہم پاسِ شہر گذشتند، و مہمانانِ ناخواندہ یا خواندہ را اگر می
 داشتند۔ اں سوارانِ سرگراں سبک جلو (سبک عنان) دپیادگانِ تند خوئے تیز و چوں
 در بازو دریاں را میہماں نواز یافتند دیوانہ وار ہر سو تافتند، دہر کرا از فرمانہاں، و
 ہر کجا آراشگاہ اں بہاں، یافتند تازار گشتند و پاک نہ سوختند روسے ازاں سوی بربافتند
 شستے گدایانِ گوشہ گیر، از بخششِ انگریزی توشہ گیر کہ ماں باثرہ و دودع می خوردند، و دہر
 دور از یکدگر پراگندہ جایجا روزگار بسر می برتند (یعنی رعایاے شہر ہمتیر از تیر شاہ گداں)
 و از غوغائے دزد و تیر و شب ہراسندگاں، نہ پلار کے در دست، و نہ خدنگے درشت؛
 اگر راست پرسی ایں مردم بہر آبادی کوسے و برزن اند، نہ برائے آگہ بہ آہنگ پیکار
 دامن بہ کمرزند؛ با اینہم ازاں کہ کہ راہ آب تیز زو بہ خاشاک تھواں بہت، دست از
 چارہ کوتاہ دیدہ ہر کیے در سر اسے خویش با تم نشست۔ یکے ازاں ماتم زدگاں ہم کہ در
 خانہ خویش بودم؛ چوں غریو و غوغا شنو دم تا از پرتو ہش دم زدم، در اں مایہ درنگ کہ ترہ
 بہ ہم زدم، آواز بخون غلطیدن صاحبِ اجنبی بہادر و قطعہ دار در رازگ، (قطعہ دودیرن
 سواراں و پیالپے رسیدنِ پیادگان در راستہ بازار از ہر گوشہ و کنار، بلند گشت۔ ہیچ نشست
 خاکے نماند کہ از خونِ گل انداماں ارغواں زار نشد، و ہیچ گنج باغی نبود کہ از بے برگی مانا بہر ہم

شکرست از خداوندان لشکر چنانکه از داستان باستان پارسایان پارس بهمن نامستن
 (عدم مشابست) این دو ستیز و آوینہ ہویائی دارد و رآن بارگن کیش بود۔ ایران پل
 بقرة و فرنگ کیش نو (یعنی اسلام) فرجام آبادی، و از بند آذر بندگی (آتش پرستی) آزادی
 یافت۔ در این بارگن گفتار و رآنست۔ ہندیان بہ چشمداشت گدام آئین تازہ شادمان
 باشند و پارسایان رخ از آتش تافتند، و بسوی خدا راہ یافتند۔ ہندیان دامن دادگران
 (یعنی اہل فرنگ) از دست دادند، و بہ شکنجہ دامن ہمدی دواں (دورنگان) افتادند۔ نمی بینی
 کہ از دامن تا دامن و از دواؤ دواؤ چہ مایہ دوری است؛ داد آست کہ آرامش (راحت) جزور
 آئین اگر نیز چشم داشتن کوری است۔ زخم تازیانہ تازیان از خوبی اک کیش فرخ (اسلام)
 مرہے داشت؛ روزگار در نور و ایں خستگی (یعنی غدر) خستگی اگر میداشت، باراندوہ از دوش
 و لما کے ترند (پریشان و تباہ) بر میداشت۔ اگر در اندیشہ راز داناں بہ ہر وانش دواؤ۔
 ایں پس پیش آمدے (ہیودی) ہست بہن نشاں دہند، و بر دل اندوگین بہنیاک
 سپاس نہند۔ جہانیاں با جہانباں ستیزند، و لشکریاں خون لشکر آریاں ریزند؛ و آگاہ
 شادی و رزند، و بر خوشیتن نہ لرزند۔ ہاں اسے داندگان فرزند و دھکت الہی (شہناں)
 زبان و سودا ایں ہنگامہ بہ آتش خشم خداوند گرم است؛ ورنہ کارزار پارس انجین امید سوز
 و آرزو گداز نبود۔

دچا شہ گاہ دوشنبہ شانزہم ماہ روزہ و یازدہم مئی سال یک ہزار و شصت و پنجاہ و
 ہفت نا گرفت در دودویار بارگن و بارگن دہلی بجنید و اں جنبش زمیں را فرا گرفت سجن

ہوا خواہانہ ہواں چستی۔ کہ کوئی گوے دولت بُرد۔ خود را بآب در زودہ بارے پدانت استکارا
 بیناں ستقائے سخت کوشے بود، و بہ والا دید معنی آشنایان فرخ سرو شے بود کہ جہانباں
 را از گرداب بر آورد و بر جہانیاں منت نہاد۔

از دستنبو

اگرچہ مرزا کی نشریں عموماً عربی الفاظ بہت کم آتے ہیں لیکن کتاب دستنبو میں جو
 غدر کے حالات پر مرزا نے لکھی ہے۔ التزام کیا گیا ہے کہ تمام کتاب میں کوئی عربی لفظ نہ
 آنے پائے۔ باوجود اس سخت التزام کے مرزا نے دستنبو میں اپنی طرز خاص اور
 شاعرانہ ادا اور بانگین کو کیس ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ چنانچہ نمونے کے طور پر دستنبو
 کے چند فقرے اس مقام پر نقل کئے جاتے ہیں۔

”دویریں روزگار۔ کہ ہر روز مزہ را بہجارت و ہر ہمہ را ز قمار، و ہر کجا سپاہ ہے بود از سپہدار،
 سخن پیوندی بگزار و بگوے کہ خود روز و روزگار، برگشت۔ اختر شناسان سپہر پیامے دینی
 منجھاں) برآند کہ در اں روزگار۔ کہ بنیم ناز و جزو شہریار پارس از ترک تار تازیان (اہل
 عرب) ہم خورد۔ کیواں (زحل) و بہرام (میںخ) در خرچک (بیج سرتاں) انجن آراسے
 و ہر آزمائے بودند۔ اینک ہاں پایہ (درجہ) سیردہم از خرچک ہنجاں ہم پیوستن گاہ (جگہ)
 قرآن) بہرام و کیواں ست؛ وایں شورش و پرغاش و جنگ، و خواری و خوشواری و دیگر
 و نیزنگ، نمایہ (ظہور) آنت۔

دانا بدیں گفتار کے گرد و آں تا مانتن لشکرے دیگر بود از کشورے دیگر؛ وایں بر گشتن

و سوار فرسوده اندام، و ستور پشت ریش - فریب دوستی از دشمن خوردگان (یعنی ہمایوں و
 لشکر پاتش کہ فریب از شیر شاہ خورده بودند) دست از غارت و تاراج غنیم کشیدند، و دم
 اسایش غنیمت شمردند۔ پایہا بہ چادہ زہ دامن آتشا شد (یعنی پادشاہن کشیدہ بخواب رفتند)
 و پیکر ہا چوں صورت دیبا بہ بستر پیونید پذیرفت۔ سر از بالش بر نمی خیزد تا کلاہ و مقعر راجہ کنند
 و پیراہن حریر بر تن گران ست تا چلقہ و جوشن کجا برند۔ ہوا نمناک بود، و ابر شمشاد
 تیغ در نیام زنگ بست، و نمد زیں بر بارگی گراں گشت۔ سپیدہ دے کتیرگی تار بیخ
 جہاں رافند و گرفتہ بود۔ ^{یعنی لشکر شاہ} ہنگام ہماں ہنگام جوے یکسرہ بر غنودگان رختند۔
 شگرت سراگی پدید آمد و طرفہ ہماں در لشکر افتاد۔ کلاہ از کمر، و پیرہم از افشار نشناختند
 از رخت خواب جستہ، و بر اسپان بے زیں نشستہ، پرانگندہ ہر طرف تاقتند۔ گروہے
 شہرچہ باد اباد گویاں سوارہ خود را بدریا زدند، و ہنر دے چند ساحل جویاں بشنا دست پایا
 زدند۔ تا کدماں بزخم دم تیغ و کدماں بہ تخم موج رود مرده باشند، و کدماں از طوفان ایں
 دو آب (یعنی آب تیغ و آب رود) جاں بسلامت بردہ باشند۔ شہنشاہ بحر و بر (یعنی ہمایوں)
 ہنگ دشت نور و دریا شگاف (یعنی اسپ) را از فراز ساحل در آب افکند۔ پاسے از رکاب
 و عنان از دست و اسپ از تخم راں بدر رفت۔ و شاہ سوارے - کہ شاہاں ہنگام سوارما
 بوسہ بر رکابش می زدند - غوطہ در آب خورد۔ نظام نام آزادہ از آب کشان لشکر کہ پناہاں
 از خویش اقبال را چشم براہ و گوش بر صدا داشت (یعنی بے آنکہ خبر داشتہ باشد منتظر
 عروج و اقبال خود بود) و با خویشین در ایں اندیشہ کہ از ساحل چوں گذرد بر ساحل جا داشت۔

بیان سلدوز، و امیر کھنسر و کہ ریش ہا کے نو ذنا سور ہا کے کمن دہستند۔ زخمہ تیز تر زدن
 و بنوا ہا کے غونچکاں خوتا بہ نشاں قناں بر آوردند کہ ماقصاں خونما کے رنجہ می خواہیم
 نہ انتقام فتنہ ہا کے ایگنہ کہ دالی ولایت اک را بجل تواند کرد ناگزیر ہیں گفتار فرجام گیرد
 بشرع عالت رفت کاراگا ہاں و دانش پناہاں خوں رنجین فرمودند، و سادات و
 علما بہ گشتن فتوے دادند۔

بہنداری چوں غوں گرفتہ اینہا شنیدہ باشد در دل اندیشیدہ باشد کہ خود را بگرنجین
 از ہنگامہ بدر برد و سپس دزراویہ گنامی کہ ہمایہ یستی ست روزگار بسر برد۔ از انجا کہ سلاح
 و سلب نہاشت سرایمہ از جارت، و از خرگاہ بدر آمدہ بجنگ سیلی دشت را و گزیر پیش
 گرفت۔ خوں خواہاں بخوں گرمی دروے آونختند، و خوںش را کہ بدویدن گرم شدہ بود
 گرما گرم بر زمین رنجیند۔

توای ندیم کہ مانی قازہ روئی خویش	بسزہ کہ سراز طرف جو بار کشد
فریب بہر ز گردوں مخور کہ این بے ہر	وہد فشار کسے را کہ در کنار کشد
ہوا سے تاج شہی ہر کرا بود در سر	سرے بہدفن شاہان تاجدار کشد

شیر خاں را دل دگر بود و زبان دگر بہ لایہ گرمی و فصول گستری پیام آشتی در میاں
 داشت۔ تا چناں شد کہ هیچ کس را ستیزہ در اندیشہ نگذشتہ۔ انان گل و لاکے کہ در راہ پوچھو
 و روز و شب از ہر وی۔ نے نے از شیاوری۔ نیا سو دہ بود و نہ پایادہ آزدہ پاسے بود،
 یعنی از شیاوری کی دوسے

آسمن آن نیم که پسندم طریق و رسم
 ز اختر چه شکوه چون نبود خدائیم
 نبود و بخیر ظهور صفات و شیون حق
 صلح و نبرد و فتح و شکست و امید و بیم
 توفیق معنویت گرا انصاف درستم
 تشریف خسرویت گرا اطلس و گکیم
 از حق بود افاضه هستی بهر صفت
 جز وایه نبود آنچه به سائل دهد کریم

پچنین بارها امیر حسین را از در ماندگی و زبونی کار سخت افتاده است، و سلطان سام بهم آورد
 افزایسب همتا - بر لایه گری و کسبشده بیاری و یادری دل نهاده است. کیس با س
 نهانی امیر حسین آشکارا بود. همه می دانستند، و خدیو همه داں از همه قرون ترمی دانست. و نام
 و ضمیر حق پذیر آژرم ناگزیر - می گذشته باشد که مگر این سست مهر خواهی زشت و کردار با س
 نکو همیشه بگذارد، و جهاندار را در گربار آتی و جانیاں را سپس به دراز دستی نیاز دارد. آن را چون
 رافره از روی کجا که بخشش و کام نگرد، و راه دانش و داد و درود. در آژرم دن دل آژرم نداشت،
 و در برون زرشکب، و در کشتن خلق پر واد.

تو بار سا طلعی عاشق و من آن ندم
 که نمن بجلقه آو با شش آشکار کشد
 پایان کار لشکر یانش از ناخوشی ستوه آمده آن جوان میر خدا گیر را با هر چهار پیش گرفته آوردند
 و بخداوندگار سپردند. دارا س نبرد آژرم را آهنگ عاجز گشتی نه بود و خون گرمی پا داس
 (یعنی جوش انتقام) نداشت. می خواست بر ناخوشی و بیخود و گنا مان ناخوشیدنی
 بخشیدن. از نهاد اهل بزم خروش برخاست. خاصه شاه محمد مرزبان بدخشان، و شیخ محمد

و برگ و ساز گرد آید بر یکدگر بخش کنیم، و با هم جز مهر، و با قوم جز آزارم، و با خلق جز داد و نه و ز بیم
 بخوبی گرمی ایس دو گرد دلاور و دو شیر مردیم گهر ننگامه گرمی پذیرفت، و گدیس دستگا به
 و شرک سپاس فرام آید. صاحبقران از سادگی بلکه از آزادی دل بازیاں سیکه داشت. و
 امیر حسین همواره در کین آں بودے که انباز را از میاں بردارد، و بیکتائی علم دارائی افزاد.
 اندیدہ وری بسگا بشیاسے آں نژند اندیشہ نازستی پیشہ۔ پے بردے، و از فرزانی و دنگی
 سچکاہ بر دنیا در دے.

ستم بجاں کج اندیش متیوان کردن خجل ز راستی خویش متیوان کردن
 روزگارے دراز تر از رشتہ طول اہل۔ بالوک طوائف در کجدار و فریز و ستیز و آویز گذشت
 ہنگناں چشم براہ و گوش بر آواز داشتند تا ایل اسفند یار نیرو را از کد ام سو چشم زخم سید.
 و شیرہ امیر حسین کہ جز بریو و غریو و رنگ و نیزنگ کار نمی کرد، و در انبازی و دمسازی۔ قنہ پزائی
 و شعبہ بازی شیوہ داشت۔ نیزنگ سازی اقبال عدو مال صاحبقران کشورتاں را
 لازم کہ ہم آں گردہ بے شکوہ را سو سو پاسے بنگ خوردے، و ہم ایس گرد بے دستبردار
 با بجا دست از کار رفتے۔ صدرہ اتفاق افتادہ است کہ ایس نفاق پیشگان خرد دشمن
 حق گرفته را از نژاد چیتا خاں دست گرفته بر تکیہ گاہ غانی و مرزبانی نشانہ اندازد و زود نہ
 ویر تیشیر بر سرش راندہ اند۔ تنہاے پیلتنان را مسند و نفع انپئے ہم مہیا بود، و سواے
 سرواں را ناز بالش و خشت گور از پس یکدگر آمادہ.

سیر ستارہ در دوش چرخ نیلگون اینما کند ہر آئندہ در مذہب حکیم

خرن ہستی قاجولی بہادر سوخت، و سپہ نشا کروچی برلاس سپہ لشکری رخ افزودت۔
روز کے میانہ امیر قمر عین و امیر طراغاسے دربارہ اولوس و توشین سخن میرفت،
و فرزانہ فیروزی فرامیر تیمور دلاور باد پر ہنر ہاں بود۔ پدر را از گفتار باز داشتہ خود بشکری سخن سرا
شد، و ہاں ہجارت زخمہ چند بر تار گفتار زد کہ امیر قمر عین در ایں شیوا بیانی و گہرا نشانی مہر
دل بست، و با فرس زباں بر کشاد سخن گوئے فرو ہیدہ ادرا پس خواند، و ہدراں بزم اوج کجاست
ترکاں خواہر امیر حسین نبیرہ خوشنشین را بآئین دیں و قانون شرع پوسے سپرد تا خوشنیشی بر
خوشنیشی و نیشی افزاید، و امیر شے چون شیر و شکر در میاں آید۔ امیر جہاں جوئے پس ازاں
پیوستہ با امیر قمر عین در بزم ہنہشیں و ہمد و در بزم پیش تاز و پیش آہنگ بودے۔ از
نبرد ازانما یان برلاس و دلاوران چختا میر کہ آں دست بردگرستے شکفتی فرو ماندے، و دست
مریزاد، گویاں ہراں دست و بازو آفرس خواندے۔ پس از امیر قمر عین کہ دامادش تھمور
ناگاہ در شکار گاہش کشت۔ جہاں پہلوان تھمن توایں بہ تنہا دامن ہمت والا گرفت، و
دستغ زنی و خنم افگنی کارش بالا گرفت۔

ہر چند کہ زشت دنا سنا ایم ہمہ
در عمدہ رحمت خدا ایم ہمہ
در جلد و بد چنانکہ مایم ہمہ
شایستہ نفیت و بوری ایم ہمہ
برادر زن صاحب قراں ہمایاں امیر حسین نیز بوسے پیوست، و عمدہ بست کہ ہر چہ از ملک و مال

شهنشاه دانا دل دیده در که چوں لعل بودی سر پایگر
 بر آن شد که لشکر فراز آورد بسوی خطا ترک از آورد
 ز مردان و گردان و کند آوازی ^{پهلوان} چه جنبش در آورد کو بهی گراں
 ازاں رو که بالیست خونریز شد ^{یغما برده که خونریز بنام در تھا ۱۲} منش با بخون رنجین تیز شد
 دلیران ز دشمن کشی دم زدند ز دم باد بر روی پرچم زدند
 ز تار تار تا گرد آید گشتند به ننگاه خان خطا رنجینند

التاں خاں دل و دست و عیاں و سناں بکار در آورد، و خود را با سپاہی ^{۱۲} از
 ستارہ ہشتاراقیوں تر بہ پیکار در آورد. کوشید و کوشیدن سو نہ داشت؛ رستم فیروزی بنام
 قولیہ خاں کشیدہ بودند. شکیبائی گسیل شیکستے پر خطائیاں افتاد؛ علم با و از گوں شد، و اندیشہ
 بگرنیز بہنوں. جہانباں التاں خاں بگرنجین جاں برد، و تن ہائے خستہ و دلمائے شکستہ
 از میاں برد. بشہر اند آمد، و در بروے سپاہ کینہ خواہست. قولیہ خاں و لشکر یا نش نہ آنایہ
 برگ و ساز بہ پیکار بودند کہ در اندیشہ گنجد. سپاس گزار چرخ و اختر گشتند، و گرانبار و سبک عیاں
 برگشتند. پادشاہ ہشیم روشنی پیروزی سپاہ و رعیت را صلاے عشرت اندوزی داد. ہنگامہ
 جشن گرمی پذیرفت، و بزیم سور آرایش یافت. خواہی ہنگامہ گرم کن و خواہی بزم آراے،
 مرگ را نہ آن خدنگ بہ کہاں ست کہ خطا کند؛ قولیہ خاں را نیز ہنگامہ خویش ناو کی نشان
 خورد. چوں سپہر نہشت یرمان بہادر جاے پدراز برادر گرفت. بیکہ دلیر و مردانہ بود
 نامش از خانی بہ بہادری در جہاں رفت. بروز گاہ جہاندار ی این شہر بارہ لاور بہتی حل

برود خطائیاں روئے باز گشتن نداشتند، اپنے امید گاہ نگاہ پوسے خویش برداشتند۔ خان
سپہر آستان نخست بار امش جارسید و خطائیاں سپس با قاجولی بہادر و فرزائیکان لشکر
سیگالش رفت کہ چہ می باید کرد۔ انجام کار بہ بہیدیدیکہ گرد خواہاں راکشتند تا از تخمینکہ
کشتند چہ در روند۔
مغتاب دیکھے اہل حرکت کا انجام کیا ہو۔

شہر یاقبل خاں از یک بانوسے نکو دیدار کہ از قوم مقدرات بود شش سپہداشت۔
نخستیں و دو میں بہ او گین یر قاق و قولیہ خاں نام آور، دو گراں بہ نامہاے دگر
روشناس۔ روزے نخستیں ایں دو برادر نام آور۔ ناگاہ بشکار گاہ از ہر ہاں جدا ہی ماند،
وراہ گم کردہ ہرنہ ہی گردو۔ تا تار خانیاں کہ غارتگری پیشہ داشتند، و پیر اسن قلم و مغول
ہموارہ راہ می زدند۔ بایں شہسوار پریشاں ز قار بر می خوردند، و چوں مے دانتد کہ کیست
باسیری می برند، و بالتاں خاں خطائی می سپرند۔ خاں کہ دے برداشت فرماں می دہد
کہ شاہزادہ را بر خر چوبیں بہ منج ہاے آہنیں بردوزند، و تن نازنیش از رواں پروازند۔
خداوند مغولستان را کہ از پیش رنجور بود بہ جگرتابی ایں دلغ درو افرو د۔ چوں دانست
کہ ناکام ہی باید مرد دو میں سپر خویش قولیہ خاں را بہ جانشینی گزید، و بہ کشیدن استقام
خون برادر وصیت کردہ چشم از تاشاے جہاں پوشید۔ قولیہ خاں تا لکین سلیمان
بکف آورد بفرام آمدن سپاہ فرماں نبشت۔ فرماں براں و کینہ خواہاں از ہر سوے
یہ تختگاہ روئے آوردند۔

گرفت و بسوے خود کشید، و ناسزا گفت: «میزبان خشم فرو خورد، و نزدیکان خود را که هم آمده بودند»
 از گستاخی باز داشت. «بامدادان میهمان آهنگ بازگشت سپرد.» ^{ظاهر کرد} «میزبان که از بدستی دشمنی
 سرگراں بود، چنانکه میزبانان و امن میهمان زود از دست ندهند، و آرزو که ویراندن
 کنند. نکرد. کلاه اسے گوهر آگس، و کمر اسے زریں، و خوشنده نگین اسے پیش بهاء و بسته با
 پرنیایا و دیبا پیش کشید، و پذیرود کرد. هنوز رهرو در زرقه بود که بد آموزان التان خاں
 را از جا بے بردند، و برآں آوردند که قبل خاں را از راه برگردانند، و بدرگاه آورند، و کالبدش
 را بدشتند و خنجر از هم فرو کشايند. سخن بنری گزارنده ستاره از سپهر فرو آورنده بدین کار
 کمربست و قبل خاں را براه دریافت؛ و بیاز آمدن فریفت. «رمیده رام نه شد، و از
 راه برگشت. فرستاده تنها باز آمد و بفرستنده خبر داد. بگروهی از گردان و یگان قراں
 رفت که چلو گیسو شتابند، و هر کجا یابند اگر نشاوی و راوی نیاید بخواری و زاری آورند.»
 مگر قبل خاں را براه دوستی بود از دود ستوده سلجوق بکاشانه دے فرو دآمد. «دائم از بهر آسایش
 آهنگ دوسه روزه آنچو رود داشته باشند خطایان شوریده متغذراں ده رسیدند، و خاں را
 درآں خانه دیدند سخن بدان لای ساز کردند که خاقان فریب خورد، و خواست که سوے
 خطا برگردد. «خانه خدا که خرد از مهر فروں داشت. نهفته باد پائے پیش کشید و گفت کاژبا
 و گرگون ست، با رفتن بخدا خود هیچ روے روانیست؛ تنها بدین گروه نیاويز، و بریں
 بادوسن نام بر نشیں، و سوے ایل و اولوس بگریز؛ ناگزیر بخچاں کرد، و جان گرامی تیگرگی
^{مردم رنجید}

نگرندگان ہمہ تن چشم باشند و شنوندگان سراپا گوش .

طرز واقعه نگاری | مرزا نے مہر و نیروز میں جس طریقے سے واقعات تحریر کئے ہیں یہاں دو ایک مثالیں اسکی بھی لکھی جاتی ہیں۔

خانِ خطا با خوشنشین سنجید کہ با قہرمان قوم نخل مہر و نیروز مہر انگیز نامہ رواں داشت
و گزیدہ رود شے را بہ نامہ بری و میا بجی گری گماشت . فرستادہ آمد ، و جہاں پہلواں قبل خاں
رازیں بوسید ، و نامہ سپرد ، و پیام گزارد . صرفہ وراثتی بود نہ در فرد گداشت .
قاچولی ہا در را بجائے خود نشانند ، و ہمعنائی نامہ آور تو سن نیز گام سوے خطا راند .
فرماندہ آن کشور سران لشکر را پذیرہ فرستاد ، و مہمان را بخوشترس نشین فرود آورد . دو
پادشاہ سپہر بارگاہ بر یک خواں نشستند ، و ناں خوردند ، و راوق آشامیدند . مگر خرد پیشہ
قبل خاں را در اندیشہ گزشتہ باشد کہ مبادا خطایاں نہ ہر بہ بادہ آمیزند ، و بدیں رنگ
خون مہماں ریزند ، و در ہر نیم پس از اندک مایہ درنگ بہ بہانہ آب تا خفتن بروں آمد
و بہ ستم شگوفہ کردے ، و خوردہ و آشامیدہ از دہن فروریختے . چون بہرزم اندر آمدے
و گراہہ ساغ گرفتے ، و خوردنی از سر گرفتے . خطایاں بہ شگفت فروماندہ کہ یارب ایں چہ
نیرمند و زور آور کسے ست کہ از ما بیشتر می خورد و خورش را بروے گرانی نیست ، و مے از ما
فروں ترمی کشد و ہمیشہ تر از ما ست . میکشاں دانند کہ چون بادہ پر زور دادم خوردند . چہ
ہر بار شگوفہ اندازند نہ آنست کہ مستی روے نہ ہا ، و تاب مے و زبونی بقے نمش را ہم بزرند
شعبے بادہ بر خرد زور آورد . قبل خاں ریش داراے خطا کہ اتاں خاں نام داشت .

نہ آں دستورست کہ بہر میکے کہ خود کشند عشق نہ بازند۔ مگر مانی اں نقش را کہ خود میرد
 ازا عجز نمی شمرد؟ و آں آں نسبت را کہ خود می تراشید نماز نمی برد؟ یزداں را بندہ سپاس مکرار
 باشم اگر فکرم را بہر جنبش آفریں نگویم، و از سخن بہ ہر اندیشہ سپاس نہ پذیرم۔ رفقار کبک و
 تدوول از دست یزد، و خرام این رعنا لبت رفاص سرت نکند؛ حاشا کہ خراش
 کلک بر ورق این مایہ ذوق انگیز تواند بود؛ تیرست کہ بسنید در حالت سستی تفہیم بخواید
 بنامی خرام۔ این پاری آمیختہ بہ تازی۔ کہ از زمان چیرہ دستی عرب بر عجم در گیتی پدید آمد۔
 خسروی گنجینہ در بستہ بود کہ خامہ من قفل درش را کلید آمد بہر وزیر کجاست تا بنگرد کہ دریا
 رہزدی کدام رہ سپردہ ام، و بہرام کجاست تا فرارسد کہ سخن را از کجا بکجا بردہ ام۔
 خسروی بادہ دریں دُور اگر بخوابی پیش ماے کہ تہ جرعہ از جامی است

خود ستائی فروشم، و بندہ پندار گیسلم۔ آوخ از اں روزگار کہ از خوی بنا سازی و از کار بیازی سپری
 شد، و داد از اں بیدار کہ در وریش افرونی خشم و کام بر روان و ہوش رفت۔ از کار و با
 این نگارش سپاس پذیرم کہ بہر دوختن این نمط کہ خود را چون سایہ با زمین ہموار ساختہ ام،
 تا پرواختہ ام۔ و با گینختن این نقش کہ چشم و دل و گام و نفس با ہم آمیختہ ام، تا انگینختہ ام۔ دست
 از کار ہای دگر کوتاہ ست، و دل از اندیشہ ہاے دگر بر کنار نہ نامہ نگار۔ کہ از کردار گزاری گینختن
 در و دل روے آوردہ بود۔ باز بہ پایے سخن می آید، و جاوہ کہ نشان دادہ اند بے پیاید۔

۱۱ تقسیم اور احراق بخین کی اصطلاح میں دو متقابل لفظ ہیں۔ جب کسی ستارے کا فاصلہ مرکز آفتاب سے ۶ درجہ
 ہو تو کہتے ہیں کہ یہ ستارہ احراق میں ہے اور جب یہ فاصلہ ۱۶ دقیقہ یعنی نسبت احراق کے ۲۴۴ دقیقہ ہو تو کہتے ہیں کہ
 ستارہ تقسیم میں ہے ان فرض ستارے کا تقسیم میں ہونا اسکی عمدہ ترین حالت ہے۔

بسم و زرع و لعل و گھر سنجیدہ انداز من اُن خواہم کہ دیدہ وراں را دستور می دہی تا از کشتش و
کوشش زنجبند، و یکبار گفتار مرا با کلام کلیم بسجند۔

پیشانی نوائی من در ستائش گفتار خویش اگر خود گزاف نباشد، گفتار راست بگستاخی
گزاردن ہم از انصاف نباشد۔ آخر نہ ہانم؛ کہ ہمہ وقت خود را هیچ شمر دے، و ایچکا ہ بر خود گستاخ
کمالے نہر دے۔ سرمستی فوق برگزیدن ایں والا نظر کہ برگزیدہ تست مرا از من برد، و
خانہ بنے پردا پوکے را بدیں روش و آہنگ بخراش و رامش آورد۔

ہانا بلند نامی سلطان دہر در آفاق چشم داشت، کہ چون منے را کہ بجا و بیانی شہرہ افاتم
بگردار گزاری گماشت۔ من خود از اس رو۔ کہ دل و زبان ایں بیدار متغیر آئینہ دار دل و زبان
شاہ است۔ و اتم کہ انچہ عمدۃ الحکما دیں باب بین فرمودہ۔ فرمان شاہ است۔

پادشاہاں را ثنا گفتن نہ کا بہر کست دیدہ و رشاپے کہ کار گشتن انداز دین

نامہ نگار کردار گزار را بہ تنومندی توفیق سر انجام خدمت۔ سعادت جادوئی، و خاقاں را
بہ سایہ سواد ایں نگارش کہ ظلمات آبجوان ست حیات ایدار زانی باد۔

فخریہ فقرے مرزا نے ہر نیم وز میں جہاں سبب تالیف کتاب لکھا ہے اسکے آخر میں یہ
ظاہر کیا ہے کہ کس نفسی کی معمولی رسم کے برخلاف اگر میں اپنی طرز بیان کی داد لوگوں سے
چاہوں تو یہ کوئی بیجا بات نہوگی بلکہ عین تنقید و تمیز کی بات سمجھی جائیگی اسکے بعد کہتے ہیں۔
”کالاشناسی را نہ اُن آئین ست کہ نکوئی کالاے خویش از نظر اندازند، و پرکار کشائی را

ستانہ نیار و حمید گشتگی پیوند نشا ط کمن شد، و خوں از دل بچناں در چکیدن بست؛ تا پیوند
چہ قدر استوار بود؟ و چہ مایہ بہ تر و گشتہ اند۔

شبے یاد دل دیوانہ کہ نختے از من ہوشمند ترست۔ گفتم کہ اگر بگفتار نیرو دہی بشاہ ارم کار گاہ
بار گاہ۔ عرضہ دارم کہ آئینہ رازم۔ مرا می توان زدود، و بندہ سخن طرازم۔ مرا می توان پردہ
گفت اسے ناداں این سخن از جاے در بود و ہنگام آں گذشت؛ اکنون اگر ہی توانی گفت
بگوئے! کہ شہ ام۔ مرہم می توان نہاد، و مرودہ ام۔ جاں می توان بخشید۔

رباعی

شاہ ہر چند دایہ جوئے آمدہ ام - دانی کہ چہ مایہ نقر گوئے آمدہ ام

ایم کہ محیط را بچوئے آمدہ ام - ز نگم کہ بہار را بہ روئے آمدہ ام

اگر چنانکہ بہ دوران تو ام۔ بروزگار فرزندانہ جمشید بودے۔ جمشید روزگار را آفرین گفستے؛ و اگر
بدانساں کہ شناخوان شہرایم۔ قریح فریدیوں راستو دے۔ فریدیوں چرخ و ستارہ را گرد
گفستے۔ و راں انجن کہ زردشت آتش افروخت، و زند آورو، اگر من بدین دم آذر قشاں
جاداشتے۔ آذر از ہم من زبانہ تر دے؛ و از دلفریبی بیان من کس بشنیدن تر نہ پذیرد نختے
من بدین قریحی بخت کہ چون تو خداوند کار فرماے دارم۔ ہر قدر بر خوشنیتن بنام جادارد؛
سرت گردم! تو نیز بدین گرمی ہنگامہ بناز۔ کہ مجموعہ غالب بندہ آتشیں نواے داری۔ اگر با نواز
ہنر داد التفات می دہی۔ جاے مردک ویدہ بمن باز گزار، و در بدل بروی من کیشاے۔
گویند در عید جہان بانی حضرت صاحبقران ثانی بفرمان آں خسرو در یاد دل۔ کلیم را صد

سر و برگ آزادانہ آسائشے۔ سرگزشت ہر کس ہماں فرامتاے ائمضا پذیرفتہ سرنوشت
اوست؛ در آنچه بر من رفت دوستان را با من چه جای سرزنش، و مرا با دشمنان چه
گنجائی بر خاش۔

لنگر گشت صرصر کشتی شکست موج دانا خورد و دریغ کہ نادان چه کار کرد
پس از پنجاہ سالہ آوارگی کہ تیری ز قمار بن از مسجد و تہجانہ گردانگشت، و خانقاہ و
میکدہ را بیکد گردو؛ بفروغ آن قرۃ ایزدی کہ فریدہں را بہ قراب داد گری دل افروخت
و مرا فرہنگ سخن گستری آموخت؛ بیداں دُر فرو دم آوردند کہ تو نیز ہوں حلقہ چشمے بیداں دُر
داری، و ستوانی کہ دیدہ برداری۔ + + + + +

تا ہمسایہ اویم سپریاں در سایہ من اند۔ و تا خاک نشین آن دُر م فرشتگاں در رشک پایہ
من اند۔ در دل و دیدہ ز روشنای جاے من ست، و بر سر راہ و ستارہ پاے من۔ درین
گوشہ گزینی و خوشہ چینی نخست آیہ رحمتے کہ بر من از بالا فرو آمد۔ و داون نختگی زمین بوس
ایکھاں خدیو خدا داں بود۔ دولت روے آورد، بخت از خواب حبست، و حور چشم روشنی
گفت، رضواں رضا جوے آمد، چرخ از رفتہ عذر خواست، و روزگار از گذشتہ بجلی طلبید۔
نومیدی از تو کفر و تو را صنی نہ بہ کفر نومیدیم دگر بہ تو امیدوار کرد

کا لبد خاکی مرا چون پیکر گرد باد جانے در میاں نیست؛ ہمیں یک دو دمہ سرگشتگی تماشا دارو
مگر عند لب گلشن تصویرم کہ میوے گل ز فرمہ ازوے نتواند دید؛ یا سبزہ جو ہر شرم کہ بوزین

در بادۂ اندیشہ مادر دہن بینی در آتش ہنگامہ ماد و دنیا بی

از واپسیانِ این قافلہ نیایے من کہ در قلم و ماوراء النہر سمرقند شہر مسقط الراس دے
بود چوں سیل کہ از بالا پستی آید از سمرقند بہند آمد در دفتر سپہبد شاہ نشان ذوالفقار اللہ
میرزا یحییٰ خاں توقیع نوکری شاہش نوشتند، و بر پرگنہ پچاسو برات روزی دے
و سپاہش نوشتند پیرم پیشہ پیر خویش داشت، و ہم در کارزار جاہر گداشت ہمانا
گلبن شناسے ترا تو آئیں نوا طلیعہ ہی باہست کہ مرا ز فرمہ سنج و دستا نسراے آفریند

رباعی

غالب بہ گہر زدودہ زاد ششم زان رو بصفای دم معینت دم
چوں رفت سپہبدی ز دم جیگہ شعر شد تیر شکستہ دنیا گاہ تسلیم

خاکم یسر کہ بفریب پندار آزادہ روی بسخن لا ابا لیانہ پرداختم، و اندازہ ارزش سخن و پایہ ولایتی
گوہر خویش نشناختم سینہ من نفسے داشت برواں آسانی نسیم کہ از نستر نزار و زہ زیاں
زودہ من کہ دم تجز بہ نا باہست تزدوم و بتیان مرا قلمے بود بہ دجلہ باری ابرے کہ از قبلہ
خیزد بہیدہ کوش من کہ باران بشورہ نزار فروریختم

بایں فروغ گوہر و رخسانی نہاد زیں ساں سیاہ روز کر اگر روزگار

بافر و فرہنگ بیگانہ، و بانام و تنگ دشمن، با فرومایگان مہنشین، و با او باش ہم رنگ، پای
بیراہہ پوسے، و زباں بمیرفہ گوے، در شکست خویش گردوں را دستیار، و در آزار خویش
دشمن را آموزگار، دل پر از خار خار، و دیدہ نستر نزار، نہ دستگار، خود نمایانہ آراشے، و نہ

خطاب کا نام خطاب زمیں بوس رکھا ہے۔ اُسکو کسی قدر حذف و اسقاط کے بعد ہم اس مقام پر نقل کرتے ہیں۔

”وقا آن شیوہ خاقانا! و خواقین خدا یگانا! رُوی آوردن من از عدم بوجود بسودای
اگر سنجی و گہر فوشی بود؛ کالاے بیش بہاے من درین چار سو روی رودائی نذید؛ و متابع
اگر انیایہ مرا دریں بازار ارزیش از زانی نہ شد؛ ناچار ہرچہ با خویش آوردہ ام۔ چوں گویم کہ با
خویش می برم۔ لختے در سفینہ ہا، و پارے در سینہ ہا میگذارم و میگذرم۔ پس از من آں گنج شایگان
را اگر ہمہ باد بیزد گو بیزد، و اگر ہمہ خاک بخورد گو بخورد۔ سینہ آرزو ہاے جوان میرا مدفن ست،
لمعہ نگاہ کرم چراغ گورِ غریباں باد۔“

نیاگان نامہ نگار از تخمے افراسیاب و تشنگ بودہ اند، و فرماندان باقر و فرنگ
فروردین چراغ ہستی نور دیدہ تور بہ باد استین کینہ کجسرخ و تشنگیاں را روز سیاہ پیش آورد۔
خداوندان اورنگ و دہیم را ازاں برگ و ساز با جزئی گندناگوں بکفت نماند۔ بہ مرز و بوم
بگمانہ روی آوردند، و بہ دستِ خرد تیغ زدن ناں خوردند۔ ہم انریں نیستاں ایوانان کجسار
نیشمن۔ سلجوقیاں دگر بارہ سرا بافسر و افسر بگوہر آراستند۔ چرخ گردنہ چنانکہ خوی اوست
ایں نامداران کا دس کوس را نیز از پای افکند۔

در مشرب ما خواہش فردوسِ نخبوی در محبص باطلِ مسعودنیابی

ہم مرزا اکثر بلکہ تقریباً ہمیشہ اُن لفظوں کے بعد خیکے آخر میں داویا لٹ ہوتا ہے بغیر اضافت کے بھی قدما کی طرز پر یا سے زائد لاتے
ہیں مثلاً رُو یا سو یا پا اور جا کی جگہ روے سوے یا سے اور جاے لکھتے ہیں۔“

ذوقِ سلیم رکھتے ہیں اسید ہے کہ وہ مرزا کی نشریں ایک عجیب طرح کی لذت اور شوخی اور ایک
 نئی طرح کا بانگین دیکھیں گے جس سے تمام متاخرین کی نشریں بالکل متراہیں۔
 چونکہ مرزا کی مرزا نشا پوزاری سے اکثر لوگ نا آشنا ہیں اس لئے جہاں تک ممکن ہوگا
 ہم انکی نشریں سے ایسے مقامات اخذ کرینگے جو صاف اور سلیس ہوں اور با انہم جہاں
 ضرورت ہوگی کہیں بین السطور میں کہیں پریکٹ میں اور کہیں فٹ نوٹ میں حل طلب
 مقامات کی شرح بھی کرتے جائینگے۔

مرزا کے تمام فارسی کلام کی املا میں ایک خصوصیت ہے جس سے اکثر لوگ ناواقف ہیں
 یعنی وہ بعض الفاظ کو تمام اہل زبان اور زبانداروں کے برخلاف دوسری صورت سے
 لکھتے ہیں مثلاً سدا کو سدا، شہمت کو شست، غلطیدن اور طپیدن کو غلطیدن اور پیدن
 گزشتن اور گزاشتن کو گزشتن اور گزشتن، آذر اور تذر و کو آذر اور تذر و وغیرہ وغیرہ۔ چونکہ
 یہ املا ناظرین کے تردد کا باعث تھی اور نیز ہم اس املا کو صحیح نہیں سمجھتے اس لئے اس کتاب
 میں جہاں کہیں مرزا کا کلام نقل کیا گیا ہے وہاں الفاظ مذکورہ قدیم معمولی طریقے کے
 موافق لکھے گئے ہیں۔

نشر فارسی کا انتخاب

از مہر نیروز

خطاب میں یوں مہر نیروز کے دیباچے میں حمد اور نعت اور مہج پادشاہ کے بعد ابو ظفر
 سراج الدین بہادر شاہ مرحوم کی طرف خطاب کر کے اپنا درود بیان کیا ہے اور اس

تسلیم کرنی چاہئے) کہ مرزائے متاخرین کی طرز انشا پر داری سے استفادہ حاصل کیا ہے تو بھی متاخرین کی نثر میں مرزا کی طرز کا سرائع لگانا ایسا ہی ہے جیسا تہمی آم میں پیوندی آم کا مراد و ہونڈ ہنا۔ تقریباً ساٹھ برس گزرے کہ لکھنؤ کے ایک نہایت لایق آدمی نے مرزا کی نثر کی نسبت یہ بات کہی تھی کہ شیخ ابو الفضل اور مرزا بیدل دونوں کے مختلف اسٹائلوں سے کچھ کچھ مختلف باتیں اخذ کر کے ایک جدا اسٹائل پیدا کیا گیا ہے؛ لیکن جب مرزا کی نثر کا ان دونوں کی نثروں سے مقابلہ کیا جاتا ہے تو مرزا کی کوئی ادا ان کی طرز ادا سے میل نہیں کھاتی۔

اگرچہ مقتضای مقام یہ تھا کہ مرزا کی نثر میں جو خصوصیتیں ہر کو معلوم ہوتی ہیں ان کو یہاں مفصل طور پر بیان کیا جاتا اور ہر ایک خصوصیت مثالوں کے ذریعے سے ناظرین کے ذہن نشین کی جاتی لیکن چونکہ لوگوں کو اس قسم کی تدقیقات سے کچھ دلچسپی نہیں ہے اس لئے ہم اس بحث سے قطع نظر کر کے حسب وعدہ ان اصحاب کی ضیافت طبع کیلئے جن کو فارسی زبان کے ساتھ باوجود اسکی کساد بازاری کے اب تک کچھ نہ کچھ لگاؤ چلا جاتا ہے مرزا کی نثر میں سے بطور نمونے کے کچھ کچھ اقتطاع کرتے ہیں اور ہر کو امید ہے کہ یہ نمونہ اس بات کا اندازہ کرنے کے لئے کافی و دافی ہوگا کہ مرزائے نثر فارسی میں بھی اسی قدر بلند پایہ بہم پہنچا پاتا تھا جیسا کہ نظم فارسی میں انکو حاصل تھا۔

اگرچہ مرزا کی نثر کو اگلے نامور انشا پردازوں کی نثر پر ترجیح دینا تا وقتیکہ اسکو لیل و برآن سے ثابت نہ کیا جائے ایک بے معنی بات ہے لیکن ہر کو ان لوگوں سے جو وجدان صحیح اور

نظر گاہ پیشین فرستادگاں	جئے قبلہ آدمی زادگاں
روائی دہ نقدِ عالم بخوش	کسائی دہ نسلِ آدم بخوش
گرامی گن سجدہ سیمائے او	بلندی دہ کعبہ بالائے او
خفق بستہ چین گیسوئے او	یمن روشن از پر توروسے او
جہانے بیک خانہ آباد کن	زبت بندگی - مردم آزاد کن
چہ اندیشِ خویش و دعا گوئے غیر	بمحرابِ مسجد رخ آراے دیر
کہ سنگ درش سنگِ کهن رست	تو گوئی - زبس دل زدشمن رست

نثر فارسی مرزا کی فارسی نثر کو جو مقدار میں فارسی نظم سے بہت زیادہ ہے اس بنا پر کہ وہ وزن سے مترا ہے صرف ایشیائی اصطلاح کے موافق نثر کہا جاسکتا ہے ورنہ اگر وزن سے قطع نظر کی جائے تو مرزا کی نثر میں شاعری کا عنصر نظم سے بھی غالب تر معلوم ہوتا ہے۔ خصوصاً کلیاتِ نظم کا دیباچہ اور خاتمہ، ہر نیم وز کے ابتدائی عنوان، تمام تقریظیں اور دیباچے جو لوگوں کی کتابوں پر مرزا نے لکھے ہیں، اور مکاتبات کا ایک معتد بہ حصہ سراسر شاعرانہ خیالات اور پوٹیکل نظم و نسق پر مبنی ہے۔

تساخرین میں ابوالفضل، ظہوری، طاہر وحید، اور جلالائے طباطبائی بڑے متاثر مانے جاتے ہیں۔ مرزا بیدل کی نثر اگرچہ انکی نظم کی طرح ایک دوسرا عالم رکھتی ہے مگر وہ بھی اپنی شان اور آن بان میں بی نظیر ہے۔ اگر یہ بات تسلیم کر لی جائے (اور ضرور

بہ بند امید استواری فرست بہ غالب خطر تنگاری فرست

محمد کز آئینہ روی دوست جزائیش ندانست دانا کہ است

زہے روشن آئینہ ایزدی کہ در وی نہ گنجیدہ زنگ خودی

ز راز ہنس پرودہ برزودہ ز ذات خدا معجزے سرزودہ

کشتاے دیرینہ کردگار بوسے ایزد از خویش امیدوار

تن از نور پا پودہ سرچشمہ دے عجب مہتاب در چشمہ

بہر جام از نوشہ جرعہ خواہ بہر گام از و معجزے سربراہ

کلاش بدل - در فرد آمدن ز دم جستہ پیشی بزود آمدن

خرامش بنگ از قدم نقش بند برنگے کہ نادیدہ پایش گزند

ہوش کشا و قلم نارسا بگلکش سوادِ رستم نارسا

دل امید جای زیاں دیدگاں نظر قبلہ گاہِ جہاں دیدگاں

برقبار صحرا گلستاں کنے بگفتار کافر مسلماں کنے

بدنیا ز دیں روشنائی دے بعبقسی از آتش رہائی دے

بخوے خوش - اندوہ گاہ ہمہ بآمرزش امید گاہ ہمہ

ز بس محرم پرودہ راز بود بنزدیکی حق سرفراز بود

ز راز کے کہ باوے سرودے سرودے صدائیش بودے ز اول بگوش

نعت
الامین

اگر حور در دل خیالش که چه
 چه منت نهادن آشنا ساز
 گریزد دم بوسه - انیش کجا
 بزو حکم و نبود لبش تلخ گوے
 نظر بازی و ذوق دیدار گو
 نه چشم آن روز مستدل لاله
 ازینها که پیوسته میجوست دل
 چه پیش رگه راجا و دزد دل
 بهر حرم کدوے و فقر رسد
 بفرا مے کایں داوری چوں بود
 هر آینه همچوں منی راب بند
 بدیسی موی در روز امید و بیم
 شود از تو سیلاب راجا و جوی
 و گر خون حسرت بند کرده
 گذشتیم ز حسرت - امیدیم هست
 که البسته این رنڈنا پار سا
 پرستار فرخنده منشور است
یعنی قرآن

غم بجز و ذوق وصالش که چه
 چه لذت دهد وصل بے انتظار
 فریید به سوگند - دیش کجا
 دهد کام و نبود دلش کامجوے
 به فردوس روزن بدیدار گو
 نه دل تشنه ماه پر کاله
 هنوزم ہاں حسرت آلاشل
 دو صد و جلہ غم تراود ز دل
 ز من حسرتے در برابر رسد
 کہ از جرم من حسرت افروں بود
 تلافی فراخور بود سنئے گزند
 گریم بدانساں کہ عرش عظیم
 تو بخشی جداں گریہ ام آبروی
 زیاد اش قلیع نظر کردہ
 پیدای روی پیدیم هست
 کج اندیشہ گبر سلساں منا
 ہوا دار فرزانہ و خورشید مست

اگر تافتم رشتہ گو ہر شکست
 و گر یافتم بادہ ساغر شکست
 چہ خواہی زدلقی مے آلودن
 بیس جسم خمیازہ نہ سودن
 بنا ساز گاری نہ ہمایگاں
 بسد مایہ جونی زبے مایگاں
 سراز منت ناکساں زیر خاک
 لب ز خاکبوس خساں چاک چاک
 گیتی دزم بنواداشتی
 دلم را اسیر ہوا داشتی
 نہ بخشندہ شاہے کہ بارم دہد
 بہر بازو رسیل بارم دہد
 کہ چوں پیل زان جابر انگیزے
 ز رخس بر گدایاں فروریزے
 نہ نازک نگارے کہ نازش کشم
 بہر بوسہ زلف درازش کشم
 بدیں عمر ناخوش کہ من داشتم
 ز جاں حنا دور پیرمین داشتم
 چو دل زیں ہو سہا بجوش آیدے
 ز دل بانگ خونم بگوش آیدے
 ہنوزم ہجان دل بجوش اندرست
 ز جاں حنا دور پیرمین داشتم
 چو آن نامرادی بیا و آیم
 ز دل بانگ خونم بگوش آیدے
 و لے را کہ کتر شکبہ بیباغ
 ہنوزم ہجان دل بجوش اندرست
 صبوحی غورم گر شراب طور
 ز دل بانگ خونم بگوش آیدے
 دم شب رویہائے مستانہ کو
 کجا تر ہنوز صبح و حجام بلور
 دریاں پاک میخانہ بے خروش
 بہنگامہ غوغائے مستانہ کو
 چہ گنجائی شورش نای و نوش
 خزاں چوں نباشد بہاراں کجا
 سیہ مستی ابر و باراں کجا

اس مطلب کو اس طرح ادا کرنا کہ در آتش بگورم از دوست، اور پرواز نورم از دوست،
 نتہائے بلاغت ہے نشہ شراب سے جو عارضی نشاط اور آسائش پیدا ہو جاتی ہے اسکو
 پرواز نور سے بہتر کسی استعارے میں ادا نہیں کیا جاسکتا کیونکہ جس طرح چوٹی کی پرواز
 اسکی موت کی علامت ہے اسی طرح نشہ شراب کا عارضی نشاط آخر کار مرثیہ ہلاکت
 ہوتا ہے۔

من اندو گین وئے اندہ رہاے	چہ می کردم اے بندہ پرورد خداے
حساب نئے در آتش و رنگ و بو	ز جیشید و بگرام و پرویز جوے
کہ از بادہ تا چہ سہرہ افروختند	دل دشمن و چشم بد سوختند
نہ از من کہ از تاب نئے گاہ گاہ	بہ در یوزہ رخ کردہ باشم سیاہ
نہ بتاں سرانے نہ میخانے	نہ دستاں سرائے نہ جانا نئے
نہ رقص پری پیکراں بر بساط	نہ عوغاے رامتگراں در بساط
بسا روزگار اں بہ ولد ادگی	بسا نوبہاراں بہ بے بادگی
بسا روزگار اں و شبہاے ماہ	کہ بودہ است بے مے بچشم سیاہ
افق با پیر از ابر پس من نمی	سفالینہ جام من از نئے تھی
بہار اں ادا من در غم برگ و ساز	در خانہ از بسینوائی نسیب از
جہاں از گل دلاکے پر بوی و رنگ	من و حسیرہ و دامن زریں رنگ
دم عیش جز رقص بسمل نبود	بہ اندازہ خواہش دل نبود

پیش مراد ہم افشردہ گیر پر کاہ را صبر صرے بڑدہ گیر

✓ پس انگہ بدونخ و ستادہ وال در آتش حس از باد افتادہ وال

پیش سے مراد باز پرس قیامت ہے۔ کہتا ہے کہ مجھے باز پرس سے مستثنیٰ رکھ اور یہ سمجھ لے کہ مجھ سے باز پرس ہو چکی اور ایک پر کاہ کو باد صبر صراٹے لگئی اور یہ فرض کر لے کہ میں دونخ میں بھیجا جا چکا اور ہوا سے ایک ہنگام دیکھتی آگ میں گر چکا۔

وگرچہ نہیں ست و سرجام کار کہ مے باید از کردہ را بدن شمار

یعنی اگر انجام کاری ہے کہ اعمال کی باز پرس ہونی ضرور ہے تو۔

مرا نیز یار اے گفتار دہ چو گویم براں گفتہ ز نہار دہ

دریں خستگی پوزش از من مجوے بود بندہ خستہ گستاخ گوے

یعنی اس خستگی اور مصیبت کی حالت میں جو کچھ میری زبان سے نکل جائے اس پر مجھے عذر مت چاہنا کیونکہ خستہ و مصیبت زدہ غلام گستاخ گو اور بیباک ہوتا ہے۔

دل از غصہ خوں شدہ نفقہ چہ سود چو ناگفتہ دانی نگفتن چہ سود

زباں گرچہ من درم آواز نشت پست ارچہ گفتارم۔ آواز نشت

ہمانا تو دانی کہ کافر نیم پرستار خورشید و آذر نیم

نکستہ تم کسے را بہا ہر بینی نبرد م ز کس مایہ در رہزنی

مگر غم کہ آتش بگورم از دست ہنگامہ پرواز مژدم از دست

یعنی صرف مجھ میں ایک عیب ہے کہ میں شراب پیتا ہوں اور اسی سے میری زندگی ہے

کبریا سے شوار پیش آورند فرو سپید کردار پیش آورند
 ز نور یکہ ریزند و خرمین کنند بجا را بخود چشم روشن کنند
 بنگار با این جلوه گشتگان در آیند شسته بکار تو شنگان
 ز حسرت بدل کرده دندان فرو ^{بخت زخمی از بازغاران} زنجالت سر اندر گریبان فرو
 در آن تعلقه من با ششم و سینه ز غم با سے آیام گنجینه
 در آب و در آتش سیر کرده ز دشوار سے ز رستن مرده
 تن از سائے خود بهیم اندر دل از غم به سپا و دو نیم اندر
 ز ناسازی و ناتوانی بهم دم اندر کشاکش ز پیوندیم
 ز بس تیر گسیا سے روز سیاہ نگه خورده آسیب دوش از نگاه
 بختا سے بزا کسی با سے من تمید ست و در مانده ام - واسے من
 بدوش تر از دست بهار من تسخیرده بگذار کردار من
 بگردار سنجی میفراسے سنج گراں باری در دهم سنج
 که من با خود از هر چه بخد خیال نذارم بغیر از نشان جلال
 اگر دیگران را بود گفت و کرد مرا ای عمر سنج ست و درد
 چه پرسی چو آن پنج و درواز تو بود غمے تازه در هر نور و از تو بود
 فرو بل که حسرت تیر من ست دم سر دمن ز مهر بر من ست
 بسا و اگیتی چو من بچلک پس جمعی دل ز مهر بر من ست

اگر دیو سارست بیوش و تنگ ^{دیو سارست یعنی گزاه}
 به بت سجده راں رو روا داشته
 و گر خیره چشمی ست نیز پرست
 پیمیش از اں راه جنبیده مهر
 ز تارمی در روان اهریمنی
 ز بس داد تا آشنائی دهند
 به تن ما به آذر گرایش کناں
 گروهی سراسیمه در دشت دوی
 ز رستمی که خود را براں بسته اند
 ز مهری که نجو است در دل بود
 نظر گاه جمعی پریشاں یکے ست
 که امی کشش کاں از اں سوئیست
 جہاں حیت ؟ آئینہ آگهی
 بہر سو کہ رو آوری سوی اوست ؟
 کہ ہموارہ پیکر ترا شد ز سنگ
 کہ بت را خداوند پنداشته
 بہ دوری از جام اندیشہ مست
 کزیں روزنش دوست نموده چہر
 گروہی بود کز حزد دشمنی
 بہ آتش نشان خدائی دہند
 بد لہما خدا را نیایش کناں
 خداوند جوی و خداوند گوے
 بیزواں پرستی میاں بستہ اند
 پرستند حق گریہ باطل بود
 پرستندہ انبوه - ویزواں کلیت
 بدونیک را جز بوی روی نیست
 فضا بے نظر گاہ وجہ اللہی
 خداں رو کہ آوردہ روی اوست

از مناجات

پرورے کہ مردم شوند انجمن
 رواں را بہ نیشکی نوازند گاں
 شود تازہ پیوند جانہا بہ تن
 بہ سرمایہ خویش نازند گاں

نفسِ رایہ بیتابی آرام دہ	جگر از خونا یہ آشام دہ
ہر سنگاں را غم از دل تہا کے	شنا سسندگاں را بخود رہتا کے
جگر با بھر اس کے اور نیز ریز	نفسا بسودای او تالہ خینہ
دم برق را بقیاری از دست	رگ ابر را آشکاری از دست
نہا نہا کے اندیشہ پیدا کے او	زبانہای خاموش گویا کے او
نگہ خیرہ در برق پیدا تیش	خرد را کہ جوید شنا سائیش
خودی داد گر شختہ در کش	دونی بے کفن مردہ در رمش



کہ ناز و یہ کیتائیش بہت و بود	زہے ہستی محض و عین وجود
بہر تشنہ آشام دیگر دہد	ز شاخا بہ کہ قلم سے سر دہد
بہر ذرہ رقصے جدا گانہ	بیک بادہ بخشہ ز سپیمانہ
ہنوزش ہماں چیں بگرداب در	جہان سے ز طوقاں بفرقاب در
ہنوزش ہماں غمی بہینا دروں	گرد ہے زمستی بنو غادروں
شنا سد کہ بر تخت چیں جای است	اسیرش ز بند سے کہ بر پایی است
بجز چشم ز خمش نباشد گزند	شیدش بخوش از غلبہ برہ مند



بہر لب کہ جوئی نوا کے از دست	بہر سر کہ بینی ہوا کے از دست
------------------------------	------------------------------

نگه را که بیرون نباشد ز چشم
و در بال پیدائی مهر چشم
دل و دست با هم گردوخته
دریں کیسه کردار اندوخته
یعنی در کیسه که از هم دوختن دل و دست بهم رسیده - کردار مردم اندوخته است .

روان و خرد با هم آمیخته
ازیں پرده گفتار بگینت
نه زیں سو گهر با شمر دن توان
نه راه اندریں پرده بردن توان



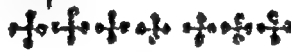
به نیروی نه چرخ برهم زدن
نشانید ز داشت او دم زدن
یعنی بقوتی که از آن نه چرخ را برهم میتوان زد از معرفت الهی دم نمیتوان زد .

گر دهم به بند گهر یافتن
فرو بسته دل در زیں کافتن
یکے را دم تیشه بر کاں نخورد
کیه ره به نایاب گوهر نبرد
خرد کر جانے ست پیش خبر
نباشد ز عنوان خوشیش خبر
نه بیند جزایں بهیچ بیننده
که مار بود آئینه عینده
نگارنده پیکر آب و گل
شمارنده گوهر جان و دل
به گردش در آرنده نه سپهر
به گردوں بر آرنده ماه و سپهر
رواں را بداشت سرای ساز
زباں را بگفتار پیرای ساز
بشاهی نشاندۀ خسرواں
نه رهن رمانده رهرواں
بدانش بر اندیش فرزگان
به مستی نگه دار دیوانگان

نہیں پہنچی: صرف دیا چہ کے چند عنوان لکھنے پائے تھے کہ مکروہات روزگار نے گھیر لیا مگر یہ
 شتوی آنکی تمام تنبیہیں میں ممتاز ہے اور ہم اسی مثنوی کے کچھ اشعار توحید میں سے اور کچھ
 اشعار مناجات میں سے جو نہایت آزادانہ اور زندانہ طور پر لکھی ہیں اور کچھ نعت میں سے اس
 مقام پر نقل کرتے ہیں۔

از توحید

سپا سے کز و نامہ نامی شود	سخن در گزارشش گرامی شود
سپا سے کہ شوریدگان لست	دہندش بیا نگ قلم دل نہ دست
سپا سے بہ پوزشش در آیمختہ	ز دل جستہ و بادل آویمختہ
سپا سے دوتی سوز کثرت رباسے	سپا سے دل فروز بنیش قراسے
خدا را سزد کز دروں پروری	بدیں شیوہ بخشہ شتا سادری
خدا سے کہ ز اں گو نہ روزی دہد	کہ ہم روزی دہم دور روزی دہد



بمنا چو سے ہر دل کہ درویش است	ہو خواہ ہر رخ کہ گردیش است
ز عجب زانیوہ خواہستد گان	نیا پد ستوہ از نیاہستد گان
خود جنس ہستی فروشند گان	وہد مزوہ بیوہ کوشند گان
باید دل آماند دل داد گان	کشد ناز لیکن ز انقاد گان
ز بادے کہ بردل وزد و نہفت	زباں را بہ پیدا و آر و گہفت

نظیری

سر سبز از دعائے ثنا گستر تو باد

کارش بہ حسنِ شاہد فرخندگی بود

ہر چند بر تو مرگ - برو زندگی بود

اس بند میں بھی نظیری کے ہاں دو شعر معمولی تعداد سے زیادہ ہیں افسوس ہے کہ اس وقت کتاب کے چھپنے کی جلدی میں ہمارے قدر مہلت نہیں ملی کہ کلیات نظیری کے صحیح نسخہ کے ملنے کا انتظار کیا جاتا اور بعد کامل اطمینان کے اُسکے ترکیب بند میں جو اشعار حل طلب تھے انکی شرح کیجاتی جس سے ناظرین کو دونوں ترکیب بندوں میں موازنہ کرنے کا زیادہ موقع ملتا لیکن ہمارا ارادہ ہے کہ اگر اس کتاب کے دوبارہ چھپنے کی نوبت آئی تو بشرطِ زندگی اس نقصان کی تلافی کی جائے گی۔

اب ہمارے مرزا کی کلیات نظم فارسی میں سے صرف شثنوی کا نمونہ دکھانا باقی رہ گیا ہے۔ اگرچہ پہلے حصے میں کہیں کہیں مختلف شثنویوں کے کچھ کچھ اشعار مقتضائے مقام کے موافق نقل ہو چکے ہیں مگر نمونے کے طور پر یہاں بھی ایک دو مقام کسی شثنوی کا دکھانا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ مرزا نے کوئی مبسوط شثنوی نہیں لکھی اُنکے کلیات میں گیارہ شثنویاں ہیں جن میں سب سے بڑی شثنوی ۹۲۸ بیت کی ہے اس شثنوی میں - جبکا نام مرزا نے ابرگر یا رکھا تھا۔ اُن کا ارادہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے غزوات بیان کرنے کا تھا مگر چونکہ یہ انکی آخری تصنیف تھی اور اخیر عمر میں طرح طرح کے عوائق اور مولع پیش آئے اس وجہ سے غزوات کے شروع کرنے کی نوبت

غالب

در نوحه شاعری مکنید از من لباس
 در پرده سنجی از دم خویشم رسد گزند
 در هرودی ز سایه خویشم بود هر اس
 من میمان و چرخ سیه کاسه میزبان
 دردی خور بلاکم و تلخایه نوش یاس
 باقی نماند اشک چه گریم بای های
 از کار رفته دست چه بزم هم لباس
 سر حلقه پلاس نشینان ما تم
 اندوه همدان شه از خود کم قیاس
 چون بود بزم ما تم شهزاده بے خروش
 من دم زدم تلخ نوائی بریں پلاس
 از نوحه عرض لطف سخن میتوان گرفت
 غالب سخن سراسر می شنیده سخن شناس
 یارب جهان رفیع تو بارگ و ساز باد
 عمر ابو ظفر شه غازی دراز باد

نظیری

رسم التعمیل بر دوز جزا و قبر تو باد
 فردا که روز حشر بر انگیزی از زمین
 دوش و کنار جو رویی شتر تو باد
 روزی که کار با همه موقوف حق شود
 جبریل کار ساز و خدا یا در تو باد
 وقت سوال گوش و لب منکر و نیکر
 پیر از قبول نکسته جان پر تو باد
 آن حله که آدم از ذل و قدر یافت
 گر رحمت دو کون بود در بر تو باد
 محمد عه عمل چو به محشر در آورده
 کار تو را است همچو خطا مسطر تو باد
 متواضع بر روی غرارت مطهر است
 بوسه بهشت هم نفس نیست تر باد
 آدم بهاسه تو شناسد دریں جهان
 تسبیح قدس رسول کال گوهر تو باد
 نخل ریاض ملک که باب غریز نیست
 سینه بهشت نیست

غالب

بے باغ و قلعہ و لب دریا چگونہ
بعد از تو شاہ خیل ترا بر قرار داشت
اینجا عسکر بودہ اینجا چگونہ
اسے بعد مرگ راتہ خوار تو عالمے
پروانہ چسبہ مرغ غار تو عالمے

نظیری

اے بخت خوش خواب پریشان چگونہ
ایجات کار دستر و دیوان حوالہ بود
انجا بگوز پریش دیوان چگونہ
قلم سبک ثبات ترا انجا ز شبنم ست
در بحر گل تو قطرہ باران چگونہ
بشنو کہ بانگ بہر تو بر حشر می زند
تا بنگریم در صفت دوراں چگونہ
چوں کار زنگان دگر نیست کار تو
محشر شتاب میکند از انتظار تو

اس بند میں بھی نظیری کے ہاں دو شعر معمولی تعداد سے زیادہ ہیں۔ نظیری کا یہ بند اس کے تمام ترکیب بند کی جان ہے اگرچہ مرزا کے ہاں اس بند میں نظیری کے برابر بلند شعر نہیں ہیں مگر شریعت کا رنگ نظیری سے بڑھ کر پایا جاتا ہے۔

بند ہفتم

غالب

گفتار را بنوحہ گری چیدہ ام ساس

نظیری

فردا کلاہ پادشہی بر سر تو یاد

۴۴ خاندان تیموریہ میں دستور تھا کہ خاص پادشاہ کی اولاد میں سے جب کوئی شاہنژادہ مرجاتا تھا تو اسکی خواہ اور نوکر چاکر اور اسکی سرکار پر دستور بھی رہتی تھی ۱۲

زیبائی و جوانی فرخندہ شاہ جمیت خون ست بے تو گریہ و غم دل میں
 اس نو نہال سر و قد کج بلاہ جمیت ہر دل کہ بے تو خوں نشو و سنگ است
 اگر چہ یہ دو نو بند اپنی اپنی جگہ نہایت بلیغ ہیں مگر تانت و جزالت کے لحاظ سے نظیری کا
 پتہ غالب معلوم ہوتا ہے ۔

بند ششم

غالب

اے رہ نورِ عالم بالا چگونہ
 مایے تو درِ نیمِیم تو بے ماحی چگونہ
 از سایہ در غم تو سیہ پوش شد ہما
 اے شفقہ و شمیمِ عنف اچا چگونہ
 زان پس کہ با تو آئے ہوا ی جہاں آستا
 در روضہٴ حیاں بہ تماشا چگونہ
 با گلرخانِ دہر و فاسے نہداشتی
 با عوریاں آنہ سیمہا چگونہ
 ما بخوداں بجلتہ ماتم نشستہ ایم
 از خوشیتن بگوئے کہ تنہا چگونہ
 بے مطرب و ندیم و غلامانِ خن و سال

نظیری

اے شاہِ مصر و دور ز کناں چگونہ
 اے یوسف از جدائی اخواں چگونہ
 ہر گاہ جلوہ کردہ تقاضا چہ مکنی
 با حسن شوخ ورتہ زندان چگونہ
 اسکندر از عزم تو بطلک نشستہ است
 در زیرِ گل تو چشمہٴ حیدراں چگونہ
 اے پارہٴ زجان و جگر گوشہٴ پدر
 گشتہ حید از دیدہ و داماں چگونہ
 ما بارے از فراق تو در خونِ پیدہ ایم
 تو در میانِ روضہٴ رضواں چگونہ
 آوازِ نو طبع و دل آشفقہ می کند

لے گیا ہے جیسا کہ اصحاب ذوق پر پوشیدہ نہیں ہے۔

بند پنجم

غالب

دستے ست ای سپہ ترا در ستمگری
بارے بر غم ز جو تو پیش که داوری
نیزنگ ساز چرخ که بیداد خوی است
با گل کند سمومی و با شاخ صصری
دا غم ز روزگار که شهنشاه بر بخورد
از خوبی و جوانی و فرخنده گوهری
حیف است مردنش که در آیام کودکی
بود او ستاد قاعده بنده پروی
شبه دروہ و دود سالگیش کرده که خدا
با قر خسر دانی و قرباب قیصری
ناگاه روزنامه عمرش دریده شد
امضا پذیر نشده توقع شوهری
جز نوع دین صاحب عالم نیاقتند
دو تیزه که بیوه کنندش بدختری

نظیری

رفتی و کار ما همه در هم گذاشتی
آشفته گلی به مردم عالم گذاشتی
جانهای غم رسیده و دلهای بقرار
در پیچ و تاب طرّه پر حشم گذاشتی
از تو عیار بردل بیگانه نه بود
بهر چه بردل بد راین غم گذاشتی
روز و شبیت برسم خجستیت ستاده بود
در زین خویش اشوب و اوجم گذاشتی
شمع قرار و خشت لحد ساختی قبول
رخسار تخت و طرّه پر حشم گذاشتی
همت ترا به ملک نیاورد سرفرو
عالم بهر که خواست مسلم گذاشتی
حرمت نگاه ^{اینجا نگاه} داشتی و جای خویش را
بهر برادران مفت دم گذاشتی

غالب

گردے بدل نشست مغبارے بیدار
 بستانیاں یا تم شہزادہ بخود اند
 زیر رُبو بود کہ پیرہن گل دریدہ اند
 خوش گشت و در دل جگر دوستان قناد
 اُس بادہ ہائے ناب کزونا کشیدہ اند
 در عرج شاہزادہ سخن ہائے دلپذیر
 در داکہ ہم نگفتہ رو ہم ناشنیدہ ماند
 در وادی عدم توان رفت با چشم
 ماند انچہ بود و صاحب عالم جبریدہ ماند
 زراں گلبنے کہ مصر مصر گرش زاپا کنند
 خارے بیادگار بد لہا علیہ ماند
 اخلاق شاہزادہ بود و نشین خلق
 پوسے ازاں شگفتہ گل نورسیدہ ماند
 اُس سرو سایہ دار کہ بارش نبود کہو؟
 و اں نو گل شگفتہ کہ خارش نبود کہو؟

نظیری

شد بزم تیوہ پر دہ ازاں صبح بر افکنید
 شمعے کہ دہر روشن و بود - مردہ است
 پروانہ را برید و بجاکستر افکنید
 در خانہ اش ز حلقہ ماتم خرام نیست
 ایں حلقہ را ز صحن سرا بردار افکنید
 ریحان جلوتہ یا سمن عشوہ رنجہ
 چینید و ہم بر آں قد جاں و افکنید
 بالیس ز تاب کا کلش اشغلی کشید
 کوتہ کنید و عسربہ در کشور افکنید
 رفت اُل سرے کہ لاج با و سرفراز بود
 بر سر کنید خاک و کلاہ از سر افکنید
 پوشید چند جامہ نیلی ز جوہر چرخ
 بر آفتاب جامہ نیلو فر افکنید
 خیزید تا باں سرتابوت دم ز نیم
 عرضے کنیم و کار و دوا عش ہم ز نیم

اِس بند میں ہر تراکیبان صفائی اور سادگی اور لطافت میں نظیری کے بیان سے سبقت

غالب

نظیری

اے اہل شہرِ دُفنِ بایں دودمان کجاست؟
خاکمِ بفرقِ خوابِ گہِ خسرواں کجاست؟

کس راسخ و درخوراں تغزیت بنود
پیداکنید کا دل ایں داستاں کجاست
خلقے بشیون اند و نگونید حالِ صیت
صبرِ خشنیدنِ تابِ بیاں کجاست

رکتہ کے دینے سے حملہ آور
در استعارہ سمجھ کر

آفاق در مصیبت او متحجّج شدہ
ایں مرگ باعثِ المِ مرد و زن شدہ

حاصلِ بحرِ نہایت
گلدی

اس بند میں نظیری نے برخلاف پہلے بندوں کے دو شعر زیادہ کر دیے ہیں نظیری کا بند بلاغت میں شاید مرزا کے بند سے کسی قدر فائق ہو مگر مرزا کے بینِ نہایت دل خراش ہیں متوفی الی نسبت یہ کہنا کہ وہ کم عمر اور نا تجربہ کار لڑکا ہے اور راہ میں بہت خطرے ہیں اُسکو جانے سے روکو وہ جو کچھ مانگے اُسکو دو اور جو بہانہ مناسب سمجھو وہ کرو اور اگر سیدھی طرح وہ کہنا نہ مانے تو اُسکو سختی سے سمجھاؤ اور اگر یوں بھی کام نہ نکلتے تو روؤ اور پیٹو اور کپڑے پھاڑو اور چٹاں کرو اور چٹیں کرو اور بادشاہ کو اطلاع کئے بغیر تا بوقتِ مرقد کی طرف لیجاؤ، یہ تمام پیرائے بیان کے نہایت موثر اور دل خراش ہیں اور گرہ کا شعر سارے بند کا پتھر ہے۔

بند چہارم

غالب

نظیری

ز اں سبز خط کہ بر رخ او ناویدہ ماند
غمِ غماست - در پیالہ می از ساءِ فکند

جس رتبے کا ہے ایسا کوئی شعر غالب کے بند میں نہیں ہے۔

بند سوم

غالب

نظیری

اسے قوم باخویش را شکیب امتحان کنید
 ایں کار را بشیوہ کار آگماں کنید
 طفلست شاہزادہ و درہ خطر بسیست
 منغش ز غم رہروی آبخماں کنید
 از میوہ و گل انچه دلش خواہاں و مید
 از حیلہ انچه رای شما باشد اں کنید
 ہر حرف دل نشیں کہ بگوئید و نشنود
 اں گفتہ را بعریدہ خاطر نشان کنید
 و ر خود زرقش نتوانید بازداشت
 بخود شود و جامہ و رید و قماں کنید
 گیرید دشمنہ دگفت و ہم بر جگر زیند
 تا سینہ را ز زویدہ فروں خوچکاں کنید
 ز نہار پیش شاہ گوئید و بخیمبر
 تا بوت را بجانب مقرر و اں کنید

اسے بزم تیرہ بارخ چوں ارغواں کجاست
 وے رزم و دہی! شہر گیتی ستاں کجاست
 شوقِ سجود و حرمتِ تعلیم کترست
 اں ناز صدر و سرکشی آستاں کجاست
 امروز غم بہ مسند شاہی نشستہ است
 پہلو نشینِ خسرو ہند و ستاں کجاست
 اں حکم ہاکہ بود از و آب کار کو؟
 و اں کار ہاکہ آمد از دہوی جاں کجاست
 و لما پرا ز غمست غزیاں لچہ واقعست
 یک دل شکفتہ نیست خوشی و ہجاں کجاست
 ہر جا بسوگِ مرگ گرد ہے نشستہ اند
 زیں غم کہ عام گشت ندانم اماں کجاست
 برگ و شاخ و درخت۔ نمر از کجا خورم
 بشکت شاخ و برگ۔ مرا آسایاں کجاست

غالب

نظیری

شاہ سخن سراے سخنور نواز را
 در بزم عیش نوحہ سرا کرد و زگار
 شاخے کہ بود موسم آتش کہ برود
 از نخل عمر شاہ جدا کرد و زگار
 مرگ اینچنین رخ و تن بازک ندیدہ بود
 کام آہل بیدار و اکرد و زگار
 شہزادہ خرد سال و بود و زگار
 شوخی بشا ہزادہ چہ سرا کرد و زگار
 فرزند پادشہ نشاندہ معانقہ
 اغوش گور بہرچہ واکرد و زگار
 اے آں کساں کہ خاک رہ شہزادہ را
 توجیہ آبروے شما کرد و زگار
 ہر چند بے اہل نتوان ہیج گاہ مرد
 آتش بخود زید کہ فرخندہ شاہ مرد
 یہ دونو بند ساوگی اور مرثیت میں تقریباً برابر سرا ہیں۔ البتہ نظیری کے بند کا چوتھا شعر

یہ شاہ ہے اس ستر کی طرف کا خاندان تیموریہ کے سلطان اور شاہزادے کسی سے معاف نہیں کرتے تھے۔

غالب

نظیری

اے نو بہار چوں تن بسمل بخوں لفظ
اے روزگار چوں شیبہ ماہ مار شو
اے ماہتابِ دلی بسلی کیو دکن
اے آفتابِ داغِ دلِ روزگار شو
اے فتنہ باوصی وزید۔ ایں مختص
اے رستخیز وقت رسید آشکار شو
اے ایں چیل بود کہ مار از سر گذشت
تہناز سر لگو کہ ز دیوار و در گذشت
دست اجل تیغِ سیاست بیدہ با
از خاک ٹہر بر دہن تنگ میزند
آرایشِ جنازہ دو ستار سکت
گوئی کہ گل بر افسر و از نگ میزند
ایں چرخ شوخ دیدہ عجب بے بصارت
بر جامِ عشرت کہ بے بین سنگ میزند
فرزندِ شاہ اکبر والا نژاد مرد
شیوں بر آوزید کہ سلطان مراد مر

مرزا کے بند میں الفاظ بہت پر شوکت و شاندار واقع ہوئے ہیں اور کوئی شعر صنعتِ شاعری اور شاعرانہ نزاکت سے خالی نہیں ہے مگر واقعہ کی عظمت جس قدر کہ بیان ہونی چاہیے تھی اُس سے ہر اتب زیادہ ظاہر کی گئی ہے بخلاف نظیری کے کہ اُسکا بیان اگرچہ دیکھا چھیکا معلوم ہوتا ہے مگر متانت اور اعتدال کا سرشتہ اُس نے کہیں ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔

بند دوم

غالب

نظیری

بگذر کہ بر من تو حفا کرد روزگار
با پادشاہِ عہدِ چہا کرد روزگار
آفاق پر دروغ و جہاں پر زاریست
ایں روزِ برگِ نیست کہ روزِ قیامت

مرزائے بھی مرحوم بہادر شاہ کے بیٹے فرخندہ شاہ کا۔ جو عین نشوونما کے زمانے میں فوت ہو گیا تھا۔ مرثیہ اسی بحر کے ترکیب بند میں لکھا ہے جو مرزا کے کلیات میں موجود ہے۔ چونکہ دونوں ترکیب بند تیموری شہزادوں کے مرثیہ میں لکھے گئے ہیں اور دونوں کا وزن متحد ہے اور ہر ایک میں سات سات بند اور دونوں کا ہر ایک بند آٹھ آٹھ بیت کا ہے اس لئے ہم یہ دونوں نظمیں مقابل یکدگر لکھے دیتے ہیں تاکہ ہر شخص جو فارسی شاعری کا مذاق صحیح رکھتا ہے دونوں میں باتانی موازنہ کر سکے۔ مگر افسوس ہے کہ کلیات نظیری کا کوئی صحیح نسخہ ہم کو دستیاب نہیں ہوا لہذا جیسا کچھ لکھا ہوا پایا نقل کر دیا گیا ہے چنانچہ پہلے بند کے بعض شعر بالکل سمجھ میں نہیں آئے جبکی نسبت ظن غالب یہ ہے کہ ان میں کتابت کی غلطی رہ گئی ہے۔

غالب

نظیری

ایدل بچشم خشم حوادث نگار شو	لب خوش نگشتہ خندہ رہ خچک میزند
اے چشم از تراوش دل اشکبار شو	در بزم مرگ خندہ بر آہنگ میزند
اے خوں بیدہ درد گداز جگر فرست	ہرگز زمانہ جامتہ ماتم بروں نکر د
اے دم بسینہ دود چراغ مزار شو	نارفتہ شب بیا من شب چنگ میزند
اے لب بنوحہ نالہ جانگاہ سازدہ	وقت گذشتہ را بتاست ز پے فرو
اے سر نصیحتہ خاک سر بر بگذار شو	کاینجا نشاط گام بفرسنگ میزند
اے خاک اچھ گرتوان زد ز جادو	ایں دہر روز کو رکش ایام خشم باد
اے چرخ اباک گرتوان شد غبار شو	دست طمع بگیسوی شیرنگ میزند

قتادہ در سیر اس شتہ عقدہ - ورنہ
 نہ مردہ تو - ورنہ رازق العباد وخیل
 ز چند سال بیک تو و تباہی رزق
 شدست حکم خود از تیسگاہ رتبایل
 فرشتہ کہ کھیلست بر ترانہ رزق
 نکر دیچ توقف یہ رزق در تعطیل
 دوم فرشتہ کہ یادش بخیر مقبول باد
 لطیفہ کہم از قول شاعر کے نصیب
 اگر خدا سے بداند کہ زندہ تو ہنوز
 ہزارشت نہ در دمان عزرائیل
 کہ در لطیفہ مراور اسکے بنودہ عدیل

بر آدم زن - بشیطان طوق لعنت
 سپردند از رہ تکریم و تذلّیل
 و لیکن در اسیری طوق آدم
 گراں تر آمد الاطوق غرازیل

اب ہم مرزا کی ایک نظم کا مقابلہ دورہ اکبری کے ایک نہایت ممتاز اور نامور شاعر کے کلام
 کے ساتھ کرتے ہیں۔ مرزا کے قصائد و قطعات و مسملات وغیرہ میں صرف ایک نظم ایسی ملی ہے
 جس کا مولانا نظیری نیشاپوری کی نظم سے بخوبی مقابلہ کیا جاسکتا ہے۔ نظیری نے جلال الدین اکبر
 کے بیٹے سلطان مراد کا جو عقوان شباب میں گذر گیا تھا ایک مرثیہ ترکیب بند میں لکھا ہے
 جو اس کے کلیات میں موجود ہے اور چونکہ نظیری کو اسکے ساتھ نہایت خصوصیت تھی اور اسکی
 شان میں نظیری نے متعدد قصیدے لکھے ہیں اور گراں بہا صلے انکے جلد میں پائے ہیں اسلئے
 معلوم ہوتا ہے کہ نظیری نے اسکا مرثیہ کمال صدق دل سے لکھا ہے۔

چکنی بکایں فسادِ سیم و زرت
واسے من! اگر تو م بجاسے تو من
بتو ہرگز نہ دے زرو سیم
خواجہ! اگر بودے خدا سے تو من

دیدی آں بد گھر - و مرد و لاش پر نید
ز اں کہ او خود سیر ابنِ علی تیغ زانہ
گفتم البتہ کہ شبیر دباں می اندو
گفت ز اں رو کہ غریزاں ہمہ مسلم بودند
کہ ہر خشم آید - اگر زشت و پاپیش گویند
خواجہ از تنگ نخواہد کہ زیدش گویند
کہ شہیدش بنویسند و سیدش گویند
نتوان کرد گوارا کہ شہیدش گویند

کردہ تہمدے کہ در ویرانے کاشانہ ام
گر بہ بھوت ماندہ باشم کتبہ باز و پیچ
بتیے از آسا و دیدم ذوقکے بخشید - لیک
بمچر تو ناقابلے در صلب آدم دیدہ بود
چرخ در آیش نہ گمانہ عالم نکرد
زانکہ حرفے - زانچہ گفتم - خاطر مخرم نکرد
ہنچ در تسکینِ نیر و نور زشت کم نکرد
ز اں سبب الیسیں ملعون سجدہ بر آدم نکرد
پیش ہر کس گفتم ایں اندیشہ باو نم کرد
عاش بشہادت و صلب آدم ہست

ایازیاں زدہ غالب کہ از حدیقہ بخت
چو لازم ست کہ پروردگار تا دم مرگ
چراست اینکہ نداری ز راز سیاہ و سفید
غیر سزد تو خوار و خستہ ہنچ سبیل
بود بر ذوق ضروریہ عباد کفیل
چراست اینکہ نیابی بر از کثیر و قلیل

خطاب
بہ
میرزا
ابو
علی
محقق
مقدس

توقی

قطعات

ہزار معنی سرچوش خاص نطق من بہت
 کز اہل ذوق دل - گوی او غسل بردست
 نرنگان ہیکے گرتو اردم زوداد
 مراں کہ خوبی آرایش غسل بردست
 مراست تنگ لے فخر دست کان بہن
 بسعی فکر رسا - جاہداں محل بردست
 سبر گمان تو ارد - یقین شناس کہ دزد
 متاع من زہن تخانہ ازل بردست

فرست اگر دست وہد منتقم انکار
 ساقی و منقنی و شرابے و سرودے
 زہنارا اداں قوم نباشی کہ فریبند
 حق را بسجودے - و بی را بدردے

اے کہ خواہی کہ بعد ازیں باشم
 مخلص صادق الولاے تو من
 گر ترا شیوہ شاہدی بودے
 کرومے جان و دل فدائے تو من
 ورترا پیشہ شاعری بودے
 سوومے چشم و سروپاے تو من
 ورترا پایہ خسروی بودے
 سفینے گوہر ثنابے تو من
 چوں ازینہائے - مراچہ ضرور
 کہ شوم ہرزہ مبتلاے تو من
 راست گویم - بہانہ چند ارم
 ناصح مشفقتم بر اے تو من
 نسکہ بر مال و جاہ مغروری
 نیستیم خوش ازیں اداے تو من

خود
 سلف

نہایت

خطبات
 نور

چوں بغیر از عمارت مفتست پیچم یا نیست
چو دہم ہم زیاں گچرخ کج باز دہن
بر نقش دستے تواند بود۔ زان بالا تر دم
دل بنارم۔ شیر گردون پنجہ گریز دہن
پہلے مصرع کی تقدیر عبارت یہ ہے کہ من ازاں بالا تر دم کہ فلک را برین دستے تواند بود، شیر گردوں
سے مراد خود گردوں یا بیج اسد یا میخ پنجہ یا زیدن دست دراز کردن و حملہ نمودن۔ دل غارت
بدحواس شدن۔

ہر کر اگر دوں بلند آواز تر خواہد بدہر
نوبت شای دہد و آنگاہ بنواز دہن

بنواز دہن۔ یعنی اسکو میرے ذریعے سے مغز کرتا ہے دوسرے شعریں اسکی تشریح ہے۔

پادشاہاں را سخن گفتن نہ کار بہرست
دیدہ و رشاہے کہ کا گفتن انداز دہن

ور تو گوئی پادشہ را مایہ نبود۔ بنیمست
خود بشاہاں ماخیشتم گر بہر داز دہن

آنکہ چوں در ملک ہستی سکہ شای زند
سکہ شای بطغرا سبے پیا لہی زند

قولہ در پادشہ را مایہ نبود، اس سے یا تو یہ مراد ہے کہ سلاطین عہد اس قدر مایہ نہیں رکھتے کہ سیر

کمال کے موافق میری قدر کریں، اور یا یہ مطلب ہے کہ بہادر شاہ مرحوم جو اس زمانے میں مرزا

کے مدد و اور پادشاہ کے لقب سے طبق تھے وہ گردش روزگار سے بے مایہ ہیں۔ قولہ دیگر

بہر داز دہن، بہر داز دہ کا فاعل دوسری بیت میں واقع ہوا ہے یعنی دو آنکہ چوں در ملک

ہستی آنخ مراد اس سے حضرت امیر المومنین علی مرتضیٰ ہیں جنکی منقبت میں مرزا نے

یہ ترکیب بند لکھا ہے۔ رسل تداب کے دہن سے معلوم وسیع ہے۔

سختی اور مصیبت کا سمجھنے والا ہے کتاب ہے کہ میں علم سے کامیاب ہوں اور نہ سختی اور مصیبت سے
گھبرائے والا ہوں تو گویا مشتری اور زحل دونوں کو ششیں میرے پاس ہیں راگیاں جاتی ہیں
اور اسلئے ہیں ان دونوں سے شرمندہ ہوں۔

دینی شہر و دہراز تہیت چرخ رفتہ مسکیں از یاد گنج پناش منم
کتاب ہے کہ آسمان جو دینی اور بخل میں مشہور ہے یہ اسکی تہیت کا نتیجہ ہے کیونکہ اسکے پاس
دینے کو کچھ باقی نہیں وجہ یہ کہ اسکا گنجینہ پناش میں تھا سو وہ اپنے خزانے کو یعنی مجھ کو بھول گیا
ہے۔ مسکیں سے مراد خود آسمان ہے جیسے اردو میں کہتے ہیں کہ غریب پنا خزانہ کیوں لکھ کر بیٹھ گیا
در غریب خویش از عقدہ در داغی ظلم خورده ام از شب غم تیر کیہ پناش منم
یعنی عالم غربت میں بسبب غم کے میں سزا اپنے دل میں چھپتا ہوں گویا غم کی چٹکی سے وہ تیر
میرے اگر گایے کہ خود میں ہی اس تیر کی بھال ہوں۔

ماندہ ام تنہا گنج از دور باشی پاس من غم خانہ دارم کہ چنڈازند در بالاس کے تو غم مند
دور باش ہٹوڑ ہو کی آواز کو کہتے ہیں جو نقیب افراسلاطین کی سواری اسکے آگے
بکارتے جاتے ہیں۔ مگر شعرا اسکو اکثر مطلق روک توک اور نافت و فراحت کے معنوں میں
استعمال کرتے ہیں کہنا ہے کہ پاس وضع عجبا گھر کے کونے سے کہیں باہر نہیں جانے دیتا
پس میری اپنے گھر پر ایسی مثال ہے کہ گویا اسکا دریاں میں ہی ہوں۔

پای من جز چشم من نیاید در نظر از بندہ ی اخترم روشن نیاید در نظر

از بندہ چپارم

دیکھا۔ مطلب یہ کہ یہ تمام نظر فریب سیمائی جلوے تھے جنکو محض وہم نے اختراع کیا تھا اور اسی لئے صبح صادق اپنے خندہ زن تھی۔ اسکے بعد بند کو اس گرہ کے شر پر ختم کرتا ہے اور کہتا ہے۔

محرم راز نہان روزگارم کردہ اند تا بحر فم گوش نمد خلق خوارم کردہ اند
کہتا ہے کہ اگرچہ مجھکو زمانے کے پوشیدہ اسرار کا محرم بنایا ہے؛ مگر اس لئے کہ کوئی میری بات نہ سنے اور پوشیدہ راز ظاہر نہ ہونے پائیں مجھکو دنیا میں ذلیل و خوار کر دیا ہے۔

از بند سوم

روشناس چرخ ورجح اسیرانش منم نور چشم روزن دیوار زندانش منم
کہتا ہے کہ آسمان کے مظلوم اسیروں میں اسکا روشناس اور پچانے والا صرف میں ہوں؛
گویا میں اس زنداں کے روزن دیوار کی جیسے آسمان کے مظلوم قیدی اسیر ہیں۔
انگوئے کا نور ہوں۔

ثابت و سیار گردوں رخصد بستم عیلم رشتہ تبسیج گوہر ہای غلطانش منم
چونکہ رخصد باندھنے سے اکثر ستارے منتظم ہو جاتے ہیں اس لئے کہتا ہے کہ میں نے جو آسمان کے
ثوابت و سیارات کی رخصد باندھی ہے تو گویا میں اسکے گوہر ہای غلط (یعنی کوکب)
کی تبسیج کا ڈورا ہوں جسکے سبب سے تمام ستارے مثل دانہاے تبسیج کے منتظم ہو گئے ہیں۔
نے زندانش کا میاں ڈوبختی تنگدل شرمسار گوش جبین و کپویش منم
اہل نجوم کے نزدیک برجیں یعنی مشتری علم کا افاضہ کرنے والا ہے اور کیواں یعنی زحل

کہ ایسا سویرا تھا کہ پھولوں کی خوشبو کا قلم ابھی گردش میں نہیں آیا تھا کہ میں نے فیضِ سحر کا
مکتوب جبکہ اسکا سرنامہ نہیں لکھا گیا تھا دیکھا۔ مطلب یہ کہ فیضِ سحر ابھی عام ہوا تھا اور
پھولوں کی خوشبو سے باغ ممکنے نہیں پایا تھا۔

خانہ بادِ سحر گاہی جنبشِ نامدہ طرہ سنبلِ بالیں پریشانِ مدہام
اس بیت میں بادِ سحر گاہی کو کنگھی فرض کیا ہے جسکے ملائم پھوکوں سے گویا سنبل کی
زلف سلجھ جاتی ہے۔ کہتا ہے کہ ابھی شانہ نسیم صبح کو جنبش نہیں ہوئی تھی اور طرہ سنبل
بالیں راحت پر پریشان پڑا ہوا تھا۔

بادِ سرستانہ می جنبید و شنم می چکید غنچہ را در رختِ خوابِ آلودہ اماں مدہام
یہ اس حالت کے بعد کا بیان ہے جو پہلے دو شعروں میں بیاں ہوئی ہے کہتا ہے کہ
ہوا رسان رسان چل رہی تھی اور شنم ٹپک رہی تھی جبکی وجہ سے میں نے غنچہ کو
رختِ خواب میں آلودہ دامان دیکھا یعنی اگرچہ غنچہ ابھی دوشیزگی کی حالت میں معلوم
ہوتا تھا مگر چونکہ وہ عنقریب کھلنے والا تھا اس لئے وہ گویا اپنے رخت میں آلودہ دامان
ہو چکا تھا۔

صبحِ اول گوبر دے کس نیا دراز حیا صبحِ ثانی را بریں ہنگامہ خندانِ مدہام
اب ان تمام عجائبات کی جو آخر شب اسکو نظر آئے انکی قلمی کھورتا ہے اور کہتا ہے کہ صبحِ اول
یعنی صبحِ کاذب جو گویا کہ شرم و حجاب سے ایک جھلکی دکھا کر غائب ہو جاتی ہے، اگرچہ وہ حیا
اصل بحیدر منہ پر نہیں لائی مگر صبحِ ثانی یعنی صبحِ صادق کو میں نے اس تمام ہنگامے پر غور

ہر ایک برج کسی نہ کسی سیارے کا خانہ کھاتا ہے یا وبال مثلاً جدی و دلو زحل کے خانے اور شمس و قمر کے وبال ہیں اور برعکس اسکے آسد و سرطان شمس و قمر کے خانے اور زحل کے وبال ہیں اسی طرح ہر برج ایک سیارے کا خانہ اور دوسرے کا وبال ہے ثور اور میزان جن کا دوسرے شعریں نام آیا ہے یہ دونوں زہرہ کے خانے ہیں اور ثور کے تین درجے چاند کے شرف اور میزان کے کہیں درجے زحل کے شرف کے مقام ہیں۔ شاعر کا مطلب یہ کہ میں نے چاند کو اسکے شرف کے مقام (یعنی ثور) میں اور کیواں یعنی زحل کو اسکے شرف کے مقام (یعنی میزان) میں دیکھا اور چونکہ ثور اور میزان زہرہ کے خانے ہیں اس لئے اس مطلب کو اس طرح ادا کرتا ہے کہ میں نے ایک لولی (دبئی) یعنی زہرہ کی دو عشرت گاہوں یعنی ثور و میزان میں دو ایسے مہمان دیکھے ہیں کہ ہر ایک دوسرے کے حال سے بے خبر اور ہر ایک اپنے حال میں خوش ہے کہ میرے سوا کوئی دوسرا زہرہ کی عشرت گاہ میں نہیں ہے پھر دوسرے شعریں دفع و خل مقدر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اس بیان کو کسی بے معنی پر محمول کرنا چاہئے بلکہ صرف مطلب یہ ہے کہ میں نے ماہ کو ثور میں اور زحل کو میزان دیکھا ہے۔

فتمہ ام زراں پس سیر باغ و مرغزار باغ
سر برسم خواب زیر پال پنہاں دیدہ ام
برسم خواب یعنی جیسا کہ پرندوں کے سونے کا دستور ہے۔ سر زیر پال پنہاں یعنی بازو کے سر گھسائے ہوئے۔

کلب مویح حکمت گل نم ز گردش نازدہ
نامہ فیض سحر توشہ عنوان دیدہ ام
مویح حکمت گل کو کلب یعنی قلم قرار دیا ہے اور فیض سحر کو نامہ یعنی خط ٹھیرا ہے۔ کتاب ہے

اور جہاں جہاں ضرورت ہوگی شکل مقامات کی شرح بھی کی جائیگی۔

بند اول

اِس سحر خیزم کہ بہ راد شہستان دیدہ ام شب نشیناں را دین زندہ ایوانِ یہ ام
اِس تمام بند میں مرزا نے اپنی سحر خیزی اور جو کچھ اُس نورِ ظہور کے وقت میں آسمان پر یا زمین پر
نظر آیا ہے اُسکو نہایت بلیغ و خریل شمایین بیان کیا ہے اور آخر کو اُس سے ایک لطیف نتیجہ
نکال کر شکایتِ آئینہ خزر پر بند کو ختم کیا ہے۔ شعر مذکور کا مطلب یہ ہے کہ میں وہ سحر خیز ہوں کہ
میں نے چاند کو اُسکی خوابگاہ میں دیکھا ہے اور شب بیداروں یعنی کو اکب یا ملائک کو اِس
گردنہ ایوان (یعنی آسمان) میں مشاہدہ کیا ہے۔

انیت خلوتخانہ روحانیاں اِکا نجا ز دُو زہرہ را اندر ردائی نورِ عیاں یہ ام
انیت کلرِ تحسین و تعجب ہے یعنی زہے دُخمے۔ روحانیاں فرشتے۔ آسمان کو کہتا ہے کہ کیا عمدہ
خلوتخانہ روحانیوں کا ہے جہاں میں نے دُور سے یعنی زمین پر سے زہرہ کو چادرِ نور میں
عریاں یعنی بغیر کسی حجاب کے دیکھا ہے۔

ہر کیے فایز غیر وہر کیے نازاں بچیش لولئے را در دو عشر تلک دو مہماں یہ ام
ہرگزائے اداں ہر سوائی نبندی لکن ماہ را در ثور و کیواں را بہ میزان یہ ام

اِن دونو شعروں کا سمجھنا کسی قدر نجوم کی اصطلاحات جاننے پر موقوف ہے مگر جنہوں نے دورِ فلک
کو بارہ حصّوں پر تقسیم کیا ہے جن میں سے ہر ایک حصّے کو بیج کہتے ہیں اور انکے نام یہ ہیں حل،
ثور، جوزا، سرطان، اسد، سنبلہ، میزان، عقرب، قوس، جدی، دلو، حوت، اینیس

خیر نذر دستہ دستہ منان نشسته رود
در آرزوی چیدن بر ستم زمارون

از شور و دیریاں گمان خروش
اموات راز قص بین رود کفین

رخشد ستاره از رخ ناسته صنم
بالدنبسته از قد خم گشته شمن *

بر روی خاک جلوه کند سایه درخشنده
بر روی دوست حلقه ز نذر مرغ و چمن

خوابد چراغ کشته جو شخص بریدہ سر
خیزد گل شاگفتہ چو بحر خستہ تن

بر جام مل ز دیدہ شبنم گلزار گاہ
بر روی گل زطرہ بسینل فود و شکن

غوغای روز پرده کشاید ز خوب و بد
آوای کوس خواب ریاید ز مرد و زن

فخر و دوستانی پائیکوہ بخت و گردون

اس مضمون کے کچھ متفرق اشعار ہم مرزا کے ایک ترکیب بند میں سے جو جناب امیر کی منتقبت میں لکھا گیا ہے نقل کرتے ہیں۔ چونکہ یہ نظم ایک خاص انداز کی منتقبت اور خاص طرز کی شاعری پر مبنی ہے جس سے زمانہ حال کے عام مذاق نا آشنا ہیں مگر باوجود اسکے مرزا کے کلام میں شاعری کی حیثیت سے نہایت ممتاز درجہ رکھتی ہے اسلئے نہ اسکو اس موقع پر بالکل نظم انداز کیا جاسکتا ہے اور نہ وہ اول سے آخر تک نقل کیا جاسکتی ہے لہذا متعدد بندوں میں سے جتنے جتنے اشعار متضمن مضمون مندرجہ عنوان انتخاب کر کے اس مقام پر نقل کئے جاتے ہیں

ہم بہم مجاویا ازار وغیرہ کی تیلی تیلی بالشت بھر کی شاخیں جن کو آتش پرست عبادت یا غسل باطعام کے وقت ہاتھ میں رکھتے ہیں

* شمن بت

P

صفت موسم بهار

✕ سحر که باد سحر عرض بوستان گیرد
 برات بر زرگل کرده اند پنداری
 که غنچه را سپهر سبز دریاں گیرد
 مگر بگرد گل از بهر باین حلقه زده است
 که تالاله را زدها سبزه بر شاں گیرد
 ستاده سر و دیاں اهتمام بر در باغ
 که تا بهار دیگر راه بر خزان گیرد
 که بعد باده شکر ریزه در دهاں گیرد
 ز تراله غنچه به سرست شاهی ماند
 سمن ز جوش طرب ملک رخاں گیرد
 چمن بر عکس شفق ساکین مل گردد
 کشند گر همه پیکر ز سنگ - جاں گیرد
 ز آفتاب هوا بعد ازین عجب دارم
 که مرغ قبله نما جادو آتیاں گیرد
 و گل نگه توان داشت دل - بحلیه عشق
 اگر زمانه تواند زد و ستاں گیرد
 چنان بکنج چمن یافت ذوق طاعت حق
 که شیخ شهر جو ماترک خان مان گیرد
 حلص جلوه بگه در هجوم لاله و گل
 چو آن گدا که دنیال کارواں گیرد
 ✕ چنین که شاخ همی سینہ بر زمین مالد
 چرا که شمر از دست باغبان گیرد

کیفیت صبح

صبحی که در هوا ی پرستاری روشن
 جنبه کلید تیکه در دست برهن
 در رفت و روب دیر - دم گرم راهبان
 آرد بر وں گداخته شمع از لگن

ز آل رستم یعنی مداد، مطلب یہ کہ میرے ساتھ خط کتابت جاری رہے۔ ۱

امید کہ بپذیری و برسن نہ کئی قسم
نپذیرم اگر معذرتِ فرطِ شاغل
امید کہ آلِ شیوہ نوری کہ بگویم
کز در و دلم فارغ و ازمن شدہ غافل

کیفیتِ آغازِ موسمِ سرا

عیدِ صبحِ امیرِ آغازِ زمستان آمد	وقتِ آراستنِ حجرہ و ایوان آمد
گرمی از آبِ بروںِ فستِ حرارتِ زہوا	محلِ مہرِ جہاں تاب بہ میزاں آمد
روزی کاہد۔ و شبِ استِ آفرینشِ رو	موسمِ دیرِ غنودنِ بہستان آمد
آوازِ فروزہ و خرو و طلسم و سیف و بدو	مہر مہ۔ میر و داینک مہرِ آباں آمد
ہند و فصلِ خزاں نیز بہارے دارد	گونہ گون سبزہ خلی بندِ خیاباں آمد
دے و بہمن کہ درِ اقلیمِ دگر تخرج بندد	اندیسِ ملک گل و سبزہ فراواں آمد
تیشکر بیکہ صفتِ آراستہ کہ پور بہ نسیم	گفت جانیت دگر سر زده نتواں آمد
نخلِ نارنج نہ بینی کہ ہم از میوہ و شاخ	گوی و چو گاہ کہبت آواز و مہیاں آمد
تابر و داغِ غمِ ہجرِ شقائقِ زولش	گلِ صد برگ بہ دلجوئی و بہقاں آمد

گر نہ ایس گرمی ہنگامہ تماشا دارد

ز چہ زنگس پے نظارہ بہ بیتاں آمد

تشیب
قصیدہ
مخمس
وزن
رہن
لونک

ماندن ز تو شوخ و رسیدن تو مشکل
یعنی از آغاسے تو دامان

زینیاں کہ فرو رفتہ مرا پائی گس گل
یعنی در دین خود

از چیت کہ ہرگز نہی دایہ بہ سائل
در دوزخ

حرکت غلط از صفہ ہستی شدہ زائل

تا نزد تو آرد کیے طائر بسمل

چوں قبلہ نما سوی تو ام ساختہ مائل

دانی کہ دریں شیوہ نیم عامی و جاہل

ایں آیہ خاص است کہ برین شدہ ناہل

مے ہیں دینجہ - ارچہ کشودن شدہ مشکل

نعم نیست گر آبادی دہلی شدہ فرائل

اعجاز زدہ دہلی بود و سحر ز باہل

دیگر خبر و ذوق ز آواز عنادل

بستم بہ فرہ مندی خویش از کرمشل

حاشا کہ پذیرم عمل شخمہ و عامل
اقبال مندی

در حبیب گداز ز تعلیلے ز داخل

کز بہر ہمیں گشتہ در اقطاع تو شامل
جاہل

ز اس رشمہ کہ بر صفحہ فتانی زانامل

تا نزد تو چوں آیم و دور از تو چہ سازم

اے کاش کہ بکوسے تو چنین روی نمودے

چو نست کہ گاہے کنی روی بدیں سوئے

گر جاں و ہم از غصہ تو دانی کہ گیتی

خواہی کہ مرا ننگری؟ از دور بفرماے

از صنعت استاد ازل دال کہ زہر سوئے

غالب سخن نام من آمد - ازل آورد

درفتن سخن دم مزن از غری و طالب
یعنی قدیم دانی

من گنجم دگر دوس گل اندوہ درم را

خود و خود ویرانہ بود - گنج گر ان مند
یعنی چہ در کو تیار کردا ہے

ہاروت - فسوں نفس گرم چہ دانند
یعنی گنج کراں ہوا

اں را کہ صریح تسلیم ہوش زباید

توقع بر علی تو فرخندہ کہ من نیز

حاشا کہ ستاںم رفتہ قاضی مفتی
یعنی زبان اتفاق بر علی ہوا

بفرست خردمند کساں را بجلو مت

ہر سال از اس شہر بمن دایہ رواں دار
یعنی از مملکت بر علی

امید کہ لب تشنگی من نہ پسندی

دانم کہ تو دریائی من سبزہ ساحل
 آن شمع فروزاں کہ بود درخو محفل
 صد حیف کہ شد نفیس امیدم ہمہ بل
 بادوست کہ پیوستہ ہی بردغم ازدل
 چوں منی نہ ہر دوا در فرادچہ حاصل
 دل گفت کہ ہاں شیوہ عشاق فروبل
 جاشاکہ حکایت کنم از لیلی و محل
 خوانند شمعگاہ و خو نغوارہ و قاتل
 شایاں بودش گویم اگر خسرو عادل
 او فلزم دغاں بود من خس ساحل
 امید گنم بود بہر وادی و منزل
 بر بستہ بردیم در ارسال رسائل
 مشتاق جمال تو چہ یوانہ چہ عاقل

چون نیست مرا شربت آبے ز تو حاصل
 در باد یہ برگور غریباں زچہ سوزد
 زان خسرو خواں چہ قدر چشم وفا بود
 افسانہ غم گر بسیرایم نبود عیب
 میگویم و مہدم زندم طعنہ کہ "تن زن
 از طعنہ شد خستہ دل و از رہہ تیمار
 تا کس نہر وطن کہ بہ شاہ بودم رو کے
 شاہ بود آن دوست کہ اندر غزل و را
 من ناالم از ان دست کہ دغاں افسانہ
 او خسرو خواں بود و بندہ گدایش
 خود ہر چہ سرودم ہمہ با دوست کنین پیش
 یارب چہ شد اینک کہ نگیرد خبر از من
 ای یوسف ثانی کہ بود در ہمہ عالم

۱۲۰۰ ذاب یوسف علیہاں مرحوم صاحبزادگی کے زمانے میں جب تحصیل علم کے لئے دلی میں آئے تھے اس وقت مرزا صاحب سے
 بہت ربط تھا مفتی محمد الدین خاں مرحوم سے عربی پڑھتے تھے اور مرزا صاحب سے فارسی مرزائے اس قصیدے میں اس
 زمانے کو یاد دلایا ہے چنانچہ اسی قصیدے پر ذاب ممدوح نے سورۃ پیر ماہوار مرزا کے لئے مقرر فرمایا تھا جو مرزا کی دہم دہم
 ملک برابر جاری رہا ۱۲۰۰

۱۲۰۰ چونکہ تشبیب میں اکثر عشوق کی طرف مہاب ہوتا ہے اس لئے کہتا ہے کہ میں اس تشبیب میں لیلی و محل کا ذکر نہیں
 کرتا یہی عشوق کی طرف میرا روئے سخن نہیں ہے ۱۲۰۰

و در بنده خود خشم خط بندگی درید
 به روشنی - و مهر فروزش ز سر گرفت
 بهرام دل بپشت تیغ و کمر نهاد
 نظایره فتنه های عیاں از نظر سترد
 جام از شراب - روشنی آفتاب او
 روی سخن صفای بنا گوش گل گزید
 بر دم زدن قاعده های کمن به در
 فیض سحر به غالت یاب کش رسید
 رهن ستاع خویش بر این لیدین رخت
 گزاهدست نیز ز سن مے بجام بُرد
 یافتند هم مضائقه در خرمی ز رفت
 دولت سپند سوخت که شد ملک تازه رو
 از انتظام شاهی و آئین سروری
 به بر خستگان هند به بخشود از کرم
 توفیق خوشدلی ز خداوند گاریفت
 لیل و نهار صورت لیل و نهار یافت
 ناهید ذوق و درش مضرب آریافت
 اندیشه گنجای نهال آشکار یافت
 بزم از بساط تازگی نو بهاریافت
 بانگ قلم نشاط نوای هزار یافت
 هر کس نشاط تازه زهر گونه کار یافت
 ذوق صبح عابد شب نده دار یافت
 کودک ضای لہو ز آموز گاریافت
 و ر مجرم ست نیز ز شهر بهاریافت
 خود رخت خویش از رنگ گل و داریافت
 ملک آفرین سرود که دولت مدار یافت
 سوره سرور و دانش و داد و شمار یافت
 و کور یا که رونق از در و ز گاریافت

شکوہ تغافل و عدم توجہ بہ نواب یوسف علیخان مرحوم رئیس رام پور در زمانہ سختی دہلی
 کہ بعد از فتح دہلی روز کے چند روئے دادہ بود

میکدہ خسرو گل ست - رزستان صورت مینا ز غورہ در نظر آمد
 کتا ہے کہ رزستان یعنی انگور کی ٹٹیاں گویا خسرو گل کا شراب خانہ ہے کیونکہ آپس نیم خام
 انگور لگے ہوئے ایسے معلوم ہوتے ہیں جیسے شراب کی بوتلیں۔

رُوحِ ترمذانی محو رہا کہ جہاں را موج گل از ہر کرانہ تا کر آمد
 فتویٰ ختم داد ابرو باد و لیسکن شیشہ نہاں بہ کثرالہ بد گسر آمد

عذرِ شہداء کے بعد ملک میں امن ہو جانا اور معافی کا اشتہار جاری ہونا۔

۱۔ در روزگار ہاں تو اند شمار یافت خود روزگار انچہ دریں روزگار یافت
 ۲۔ پر کار تیز گرد فلک در میاں مہیں حق داد و حق کہ بمرکز قرار یافت
 ۳۔ در ہاے آسمان بزمیں باز کردہ اند ہر کس ہر انچہ حبست بہر روزگار یافت
 ۴۔ آمد اگر بفرض ز بالا بلا منسود بر روی خاک تیج و خیم زلف یار یافت
 ۵۔ چوں حسن ماہ یک شبہ بینی - ہواں کہ ماہ پاداش جا بگذازی شبہای تار یافت
 ۶۔ چوں رنگ دی گان لبری - شاد شو گل اجر جلہ خراشی پیکان خار یافت
 ۷۔ در خاک و باد و آتش و آب آشتی فرود ایں پرورش کہ خلق ز پروردگار یافت
 ۸۔ ناچار جز بہ داد گر ایش نمی کند درد ہر ہرچہ صورت ازین چہار یافت
 ۹۔ ہر کس بقدر فطرت خویش رجعت گشت ہر شے بحسن جو بہر خویش اشتہار یافت
 ۱۰۔ گر خواجہ بندہ را خطا کردگی نہشت ہم بر در سرای خودش بندہ وار یافت

دینگر
 فیض
 دینگر
 ملک

ہشتیم اشتغال کی چون بر نہ دیکھو ترس نہ تھپو پل پر نہ
 نا زید ذلت سے قربت نہ چل را ہنر و بیان از شکوہ پیشتر آمد
 یعنی ہنر و خوشنویسی سے پہلے باغ ویراں کی آہ کی آمد کہناں سے سن لی۔
 بید و بندہ خوش فرخ سوزوں کو کسبِ اہل یک پر پائ در آمد
 تیس گپا گپا کت شیار کو محمل از پس ہر نچہ نچہ و گر آمد
 یعنی خوش سے اور اہل کو تیس سے تشبیہ دی ہے کہ کتاب ہے کہ تیس جو ایک کے موافق دوسرا
 عمل نہیں جانتا دوسرے اور محملوں کو شمار کرے کیونکہ ہر نچہ کے بعد دوسرا نچہ اور دوسرے
 کے بعد تیس و غیر جڑا تے پٹ آتے ہیں۔
 کثرت انواع اہل شمار کہ ہوئے رنجہ ز بار شند و فی غمور آمد
 یعنی طرح طرح کے پتھروں کی اس قدر کثرت ہے کہ ہیوئے بشیر مختلف صورتوں کی نباتات
 سے ناجزا کیا ہے اور تحک کیا ہے۔
 لاد بیچہ تیغ کوہ گدشتن دامنش اینک از زیر سنگ برآمد
 یعنی لاد کو کرنا ہے تیغ کوہ گدشتن۔ واسن از زیر سنگ برآمدن نصیبت سے نجات پانا۔
 محبت اہل شد و باے نام نچل را نہ بجز ہر شب نہ ہرزہ سویہ گرا آمد
 یعنی ایک جانور کے سیاہ رنگ۔ جبکہ خوشبو اس نہیں اسی لئے موسم بہار میں مرجاتا ہے
 چونکہ لوبیہ پیدا ہوتا ہے اس لئے اسکو ہندی میں لگاتے ہیں۔ نہ بجز ہر شب نہ ہرزہ سویہ گرا آمد
 بوقت ہے۔ سویہ گرا ناں و گرا ناں۔

دل نہ بنزند نہ ننگے درین دنگ
ہرچہ بنزند بعنوان تماشا بنند
جام جویند و زندی نہ گرانید نرید
سجہ انجسم اگر دید بیا بنند
ہرچہ در جانتوان یافت ہر سو یابند
ہرچہ در جانتوان دید ہر جا بنند
ہمہ گردند درال پایہ کہ اوراد آند
اس نظر باکے گرانہ فراموش کنند
یعنی اس ملاحظت کہ بالادگر شد
نظر را مویجہ سر شمشیر چو اں تختند
چوں بہ ننگ سخن شبدہ مابینند
نثر النسخہ اعجاز میجا بنند
کہ بے نقل بصد گونہ تقاضا خواہند
کہ بے فال بعد رنگ تما بنند
بروز از یاد کہ دنیا ست نمود بے بود
ایں دل فروز نمود یکزد دنیا بنند

اس مقام پر اس شعر کی خوبی و جدائی ہے بیان میں نہیں آسکتی کہ کتاب ہے کہ دنیا کی یہ ال فروز
نمود یعنی ہماری نظم و شرح اہل اللہ کی نظر سے گزرے گی تو وہ انکے دل سے اس
عارفانہ خیال کو فراموش کر دیگی کہ دنیا محض ایک نمود ہے بود ہے۔

صفت موسم بہار

شکر کہ آشوب برفت و باد سر آمد
نامیہ از بند زہر سر بر آمد
کسب ہوا نفع آب خضر رساند
سبزہ جہان را بہر ہمیشہ را ہر آمد
یعنی آج کل جنگل کی ہوا کھانے سے وہی فائدہ ہوتا ہے جو آب حیات کے پینے سے ہوتا ہے
اور جس طرح خضر آب حیات کا رستہ بتاتا ہے اسی طرح سبزہ جنگل کا رستہ بتاتا ہے۔
در چمنستان کشودہ بارِ نوآورد
باد کہ باز ارجکان کسب و بر آمد
سوداگر

استعار
فخریہ

تشبیب
فطریہ
سبب
لایکھ

آتش شیشہ میں اور واسق و حذر الکی رو دنا و جو غیبی اسے بیان کرتے ہیں یہ لوگ انکو توبہ و موت
و فدا پر کڑا کی دیکھ لیتے ہیں۔

نستور بند اگر ہمدرد لب زوں گردند نخر و شند اگر محل ایسے ہمیشہ
خون خرید و بکار و فتنہ بہ نراں گیرند خویش را چوں بسرا نہ تنہا بنند
یعنی جیب آٹک ساتھ کوئی دوسرا دسترخوان پر نہیں بہتا تو ادانت پیتے ہیں اپنی جو فیض ان کو
پیشہ چاہے اس میں اور وہ کبھی شریک کرنا چاہتے ہیں۔

سرد تن را اگر زور دستوہ انگازند جان و دل را اگر دست نکینا بنند
قطر فاب بہ لب ہوشہ نشتر شمرند پارہ ہاں بہ گلوریزہ مینا بنند
یہ وہ نوحہ و دست و گریباں ہیں مطلب یہ ہے کہ زور و طلب کے اکتا جانا اور دوسکے خیال
کے نایاب ہونا کبھی نہیں چاہتے۔

تشقہ را زوق ہنگامہ بند و فرزند بادہ را شمع طربخا نہ ترسا بنند
یعنی بزرگ شے کو اپنے اپنے محل پر مناسب و سوزوں خیال کرتے ہیں اور کسی چیز سے
اور زوق و شغف پاک نہیں چڑھاتے۔

برسم دوزخ زندہ و تشقہ بہ زنا و صلیب خرقہ و سبوح و مسواک و مصلیٰ بنند
برسم دوزخ زندہ آتش پرستوں کے ساتھ تشقہ دوزنا بہند و زوں کے ساتھ اور صلیب عیسیٰ یوں
کے ساتھ مخصوص ہے اور دوسرے متبع میں شعائر اسلام کا بیان ہے کہتا ہے کہ وہ
لوگ برسم دوزخ زندہ و غیرہ اور خرقہ و مصلیٰ وغیرہ میں کچھ فرق نہیں سمجھتے۔

یہ شعر گویا حاصل ہے اس قول کا کہ "لَيْسَ فِي الْأَمْكَانِ أَبَدًا عَمَّا كَانَ" یعنی جو نظام عالم کہ
اب موجود ہے اس سے بہتر نظام ناممکن تھا۔

ہم دریں جا نگرند آنچه در آنجا بینند	دو بر میانِ ازل کوری چشم بد بین
نقطہ گردن نظر آرند سوزِ آہ بینند	رازِ زینِ مہدہ در آن جگہ از دیدہ دری
جادہ چوں نبضِ تپانِ رگِ مہر بینند	راہِ زینِ گرمِ روانِ پُرس کہ در گرمِ روی
زخمہ کردارِ تبارِ رگِ خارِ آہ بینند	شرِے را کہ بنا گاہ بدِ رخا ہدِ خُست
صورتِ آبلہ بر چہرہ دریا بینند	قطرہ را کہ ہر آئینہ گہرِ خواہد بست
روزِ درِ منظرِ خفاش ہوید آہ بینند	شامِ در کو کبہ صبح - نمایاں نگرند
مجمعِ آنس بہ تے بستِ زینجا بینند	دشتِ تفرقہ در کاخِ مصوّر سجند

کاخِ مصوّر وہ محل جسکو زینخانے وصالِ یوسف کے لئے آراستہ کیا تھا اور جس میں تمام سامانِ
عیش و کامرانی جمع تھا۔ تے بست وہ جھوٹا جو یوسف کے قید ہو جانے پر انکی جدائی کے
غم میں زینخانے اپنے لئے بنایا تھا اور اس میں رہتی تھی۔ کتا ہے کہ یہ لوگ یعنی اہل اللہ
کاخِ مصوّر جیسے آراستہ محل میں اُس تفرقہ کی وحشت کو دیکھ لیتے ہیں جو یوسف اور زینخانہ کے
حق میں وہاں سے آخر کار پیدا ہوا اور اُنس اور بلاپ کو اُس نے بست میں دیکھ لیتے
میں جو یوسف اور زینخانہ کو اُس کے بعد نصیب ہونے والا تھا۔

ہر چہ گوید عجم از خسرو شیریں شنوند ہر چہ آرد عیاز و اُمق و عذرِ بینند
یعنی خسرو شیریں کا قصہ جو اہل عجم بیان کرتے ہیں یہ لوگ اُسکو خود خسرو اور شیریں کی بان

آن را که طالع کف گنجینه پاش نیست
 و انم که آسماں زمین مشکاکرست
 چون جنبش سپهر نیران داورست
 رنگ از گلست سایه بخت و نواز مرغ
 در نشتر نغمه قرع بنام هوازند
 مستنیر بانسیم اگر بلبے بیابغ
 دار و ز بهر زندگی آید نه بهر مرگ
 پرویز در یاب شبی بود در بخت
 فریاد ز دو میر کس بود در نه دهر
 دارم ز روزگار نوید که آن نوید
 از داور زمانه باندیشه درست
 هر گم بسز نوشت سزاید شمار نسیم
 سلطان بن محمد مهدی که راسکاو
 نعم البدل ز خانه پروین نشان دهد
 عکس چه جلوه روشنی روشنای دهد
 بیداد نبود آنچه بجا آسماں دهد
 هر جا بهار هر چه بود در خور آن دهد
 در نشو سبزه علم آب روان دهد
 جان در نور دجار خوش آسماں دهد
 جرم ز شکست است اگر خسته جان دهد
 آواره را براه ز شیرین نشان دهد
 کام دل غریب پس از امتحان دهد
 در پریم بشارت بخت جوان دهد
 شادم که مژد بند گیم ناگهان دهد
 راهم ببارگاه شبهه انور جان دهد
 منشور روشنی به شبهه خاوران دهد

صفت سالکان طریقت

۴ ربه رواں چون گهر آبله پابینند
 هر چه در دیده عیانت بگامش دارند
 راستی از رقم صفحه هستی خواهند
 پاک را پای فراتر ز تر یا بینند
 هر چه در سینه نهافت زینت بینند
 نقش کج بر ورق صدفه متعاقب بینند

و در
 و در
 و در

بزمی سرخوش خواب عیدم عباس غازی را
 هجوم خستگان و سوز و ساز نو گرفتار را
 نمی بینی که چون جان داد از بیدار و بیدارها
 گرفتیم کاینه بینی دے داری و چشمی هم
 چه دندان به جگر افشرد و باشی کانداز راوی
 نیاری گرد راں کوشی که پایش در کابری
 تنه را کشی گُل خار بودے بر زین یابی
 نه شکست در خم باز و نه تیرش در کمان بینی
 نو آتش بزم طوسی فاسخ ناشادان بینی
 علی اکبر که همچون سخت بند خوشتران بینی
 بخوان غشته نازک پیکر صغر چیاں بینی
 حسین ابن علی را در شمار کشتگان بینی
 نه بینی گرد و آن غم ای که دشمنان بینی
 سرے را کشی را فسر عار بودے بر شان بینی

ستایش روزگار

هست از تیز گریه بهما استخوان دهد
 مردست مرد هر چه کند بے خطر کند
 گلزار را اگر نه قمر گل به ستم
 گنج سخن نهد به ناس خانه ضمیمه
 تار و ز خاک تیره نه گرد و زرشک چرخ
 تا آدمی ملان بکیر و دزیک هوا
 هم در بهار گل شگفتانند چمن چین
 هم در تموز میوه فشانند طبق طبق
 آن را که بخت و ترس بدل با نیست
 آئین دهر نیست که کس را زیاں دهد
 را دست را دهر هر چه دهد را یگان دهد
 در ویش را اگر نه سحر شام ناں دهد
 و آنکه کلید گنج بدست زباں دهد
 ز خشانے ساره بر یک رواں دهد
 سرا و نو بهار و تموز و خراں دهد
 تا راحت شام و نشاط رواں دهد
 تا آرزوے کام و مراد رواں دهد
 طبع سخن رس و خرد خرد رواں دهد

تنبیه
 قصیده
 منقبت
 نام دارد

عجماس دلاور کہ دران ابروی شست
 آں قائم گلگون کفن عصمت محشر
 آں اصغر دل خستہ پیکان جگر دوز
 اسے قوت بازو دے جگر گوشت ہنہار
 اسے شہر ہدای و شادی کہ نداری
 اسے منظر انوار کہ بود اہل منتظر را
 اسے گلبن نورستہ گلزار سیادت
 اسے منبع آں بہشت کہ آرایش خلدند
 بالغ نظران روش دین بنی - حیف
 ماتم کدہ آں خیمہ غارت زدگاں - حیف
 آں تابش خورشید در آں گرم روی - حیف
 غالب بلا ملک نتوان گشت ہم آواز
 شمشیر بیکیت و بیکیت لوا - ہاے
 واں اکبر خورش تن میدان غلا - ہاے
 واں عابد غمدیدہ بے برگ نوا - ہاے
 دست تو شمشیر شد از شانہ جدا - ہاے
 کا فور و کفن - بگزم از عطر و قبا - ہاے
 دیدار تو دیدار شہر ہر دوسرا - ہاے
 نایافتہ در باغ جہاں نشو و نما - ہاے
 داغم کہ رسن شد گلکوے تو داسا - ہاے
 قدسی گہران حرم شیر خدا - ہاے
 غارت زدہ آں قافلہ آل عبا - ہاے
 واں طعنہ کفار در آں شور و غا - ہاے
 اندازہ آں کو کہ شوم نوحہ سرا - ہاے

بیادر کر پلاتا آں ستمکش کاروان بنی
 نہ بینی ہیج بر سر خازنان گنج عصمت را
 ہمانا میل آتش بر دہ نگاہ غریباں را
 بہ بنی چشمہ از آب چوں جوئی کنارش را
 کہ دروے آدم آں عبا را ساربان بنی
 مگر در خارین ہمارو پود طلیساں بنی
 کہ ہر جا پارہ از خست و چو از دھان بنی
 ز خون تشنہ کا ماں چشمہ دیگر وان بنی

چہ ستیزم بقضا ورنہ بگویم غالب علم شاہ لگوں شد نہ چین بایستے

وقت ست کہ در پیچ و خم نوحہ سرائی
وقت ست کہ اں پر گیاں کز رہ تو عظیم
سوز و نفس نوحہ گراں تلخ نوائی
از خیمہ آتش زده عیاں بد آیند
بر در گہ شاہ کردہ فلک صیہ سائی
جانہا ہمہ فرسودہ تشویش اسیری
چوں شعلہ دغاں بر شیش کمرہ ردائی
دلہا ہمہ خون گشتہ اندوہ رنائی
اے چرخ چو آن شد گراں بہر چہ گردی
اے خاک چو ایں شد گراں سودہ چرائی
برخیز و بخون غلط اگر از اہل و فائی
خون گرد و فروریز اگر صاحب مہری
اکبر تو کجا رفتی و عباس کجائی
تنہا ست حسین ابن علی در صفت اعدا
از خون حسین ابن علی یافت روانی
توقع شفاعت کہ ہمیز خداداشت
فریاد ازاں حامل منشور امانت
فریاد ازاں زاری و خونابہ فشانی
فریاد ازاں زاری و خستہ درونی
گر روے شناس غم شاہ شہدائی
غالب جگری خون کن و ز دیدہ فرو بار

سر و چین سروری افتاد ز پا - ہاے
شد غرقہ بخون پیکر شاہ شہدا - ہاے
بر خاک رہ افتادہ نئے بہت حسرت کو
اں روی فرو زندہ و آن نعت دوتا - ہاے

نہ حسینؑ بہت کچھ سوئی بھٹکتے پیشِ رخسار
 بدستِ چوں باقی نماندے دردِ انِ مصطفیٰ
 قدسیاں را نطقِ حق و دعا الٰہِ سماع
 گشتہ ام در فوضہ خوانی مع خوانِ مصطفیٰ

اسے کج اندیشہ فلکِ حرست دینِ بائیت
 علمِ شاہِ بگوں شد نہ چنیں بائیت
 تاجِ افتاد کہ بر نیزہ سرش گردانند
 عزتِ شاہِ شہیدانِ بایں بائیت
 حیث باشد کہ فتنہ خستہ ز تبسِ برفاک
 انکہ جو لانا کہ او عرشِ بریں بائیت
 حینت باشد کہ زاندا دمِ آسے طلبند
 انکہ سائلِ بدرش ریحِ ایں بائیت
 تازیانِ راہِ جگر گوشہٗ احمد چہ نزع
 وطنِ اصلی ایں قومِ زمیں بائیت
 ایسا القوم! منزل بود از خود گویم
 میماں بے خطر از خنجر کیں بائیت
 یعنی یہ تو ادنیٰ درجے کی بات ہے اگر یہ کہا جائے کہ اسے اہلِ شام کہ بلا کا یہ مہمانِ خنجر کیں سے
 محفوظ رہنا چاہئے تھا بلکہ جو سخن اس موقع پر کہنے کے لائق ہے وہ یہ ہے یعنی جیسا اگلے
 اشعار میں بیان ہوا ہے۔

سخنِ انیسٹ کہ در راہِ حسینِ ابنِ علی
 پوہ از رویِ عقیدتِ بر جنیں بائیت
 چشمِ بدو در بنگامِ تماشایِ خورش
 رونما سلطنتِ رویِ زمیں بائیت
 داخستِ ناخواستہ در شکرِ قدوشِ دادن
 اگرش ملک و گرتاج و نگیں بائیت
 چوں لغزانِ خود آرائی و خود بینی و نفیض
 اں نکرد کہ از صدقِ یقین بائیت
 با سیرانِ سدیدہ پس از قتلِ حسین
 دلِ نرم و منشِ مہر گزین بائیت

باید بدر دهنزه گریستن - و اگر گریست
ریشک آیدم بایره که در حدِ وسع است
رفت آن چه رفت - بایدم اکنون نگاشت
باران حتمی !! که باز از شسیت و شو
^{یعنی بقصدت و توبه}
خود را ندیزال لب نوشین بجام خویش
فرو شفاعت وصله صبر و خوں بها
چون زرق غیب در دتر اعلام کرده اند

جیسا گریستیم۔ دریا گریستن
بر خاک کر بلائے معلیٰ گریستن۔
از بہر نور دیدہ ز نہرا گریستن
دارد بر رویا ہی اعدا گریستن
زیب در بشور نجفی دریا گریستن
ایچ از کسے نخواستہ الا گریستن
سر میزند ز مومن و درسا گریستن

اے فلک شرم! از ستم بر جانِ مصطفیٰ
اے بھرواہ نازاں ہیچ میدانی قیمت؟
سایہ از سرورِ روانِ مصطفیٰ نقدِ نجاک
گر بے بازارِ امکاں خودِ طفیلِ مصطفیٰ است
کنینہ خواہی ہیں! کہ با اولادِ مجاوش کنی
نیک بنودِ کز تو بر فرزندِ لبندش رود
یا تو دانی مصطفیٰ را فارغ از رنجِ حسین؟
یا مگر گاہے ندیدی مصطفیٰ را با حسین؟
ہو حسین سے تائیں کہ گفتے مصطفیٰ روحِ فدک

دوستی زین پیش سرِ آستانِ مصطفیٰ
از تو بر چشم و چرخ و دوامِ مصطفیٰ
ہاں چہ بر خاک افگنی سرورِ مصطفیٰ
ہیں چہ آتشِ میزنی اندرِ مصطفیٰ
انچہ بامہ کردہ اعجازِ مصطفیٰ
انچہ رفت از مرتضیٰ بر دستانِ مصطفیٰ
یا تو خواہی میں مصیبتِ مصطفیٰ؟
یا مگر ہرگز نبودی در زمانِ مصطفیٰ؟
چوں گذشتے تمامِ پاکستانِ مصطفیٰ

گل چماندیر گرد در دلش بازار سرد
بہر تجدید طرب طبع خراں انداختہ
آتش از روئے گلہا سہ ہزار آفرختہ
شعلہ در جان مرغ صبح خوان انداختہ
دلیہ در ساغر معنی طرازاں رنجیتہ
رشتہ در کاسہ دریا و کال انداختہ
جزیریں آب آتش نہ رشتہ تولاں سرگرد
کعبہ راجو کے بہشت از دواں انداختہ
جزیریں لباس تولاں بچیں دواں نہشت
رخنہ از اسلام در کشیں مغاں انداختہ

یعنی آتش ز رشت ہر ایک پانی سے نہیں بجھ سکتی تھی اس لئے میزاب کعبہ سے
بہشت کی نہر جاری کردی اور کشیں مغاں ایک ایسا موتی تھا کہ اسلام جیسے الماس کے
سوا اس کا بندھنا یعنی اس میں رخنہ ڈالنا ناممکن تھا۔

چشم را بخشیدہ چو ناں گردش کار با پیش
برزیں دانند طرح آسماں انداختہ
یعنی چشم مشرقاں را
دادہ ابرو را بد انسان بخشے کاہل قیاس
در تن شمشیر بند از دجاں انداختہ
اے ز شرم خاکساران تو از شہر ہما
چوں کلیم کہنہ ظن را بکراں انداختہ
ذوق تمکین گدایان تو گنج مشاہ را
از دل گنجور و چشم پاسبان انداختہ
تا دریں صورت چشم دشمنان نہاں بود
دوست را اندر طلسم امتحاں انداختہ
تا علاج خستگی آسایش دیکردہ
خار ہا در رگہزار میماں انداختہ

مرثیہ ذوق

کفرست کفر - در پے روزی ستانتن
نگ ست تنگ - در عین دنیا گریستن
گاہے ہواغ شاہد و ساقی گداختن
گاہے برگ نامک و باہا گریستن

مرثیہ ذوق

نظیری کے ترکیب بند کے ساتھ اس غرض سے نقل کرینگے تاکہ اصحاب ذوق صحیح کو دونوں کے کلام میں موازنہ اور اس بات کا اندازہ کرنے کا موقع ملے کہ مرزا نے اکبری طبقہ کے چیدہ اور برگزیدہ شعرا کے تتبع کو کس حد اور کس درجے تک پہنچایا تھا۔

توحید

اے زوہم غیر غوغا در جہاں ابتدا	گفتہ خود حرفے و خود را در گماں ابتدا
ویدہ بیرون دروں از خوشی تنجہ	پردہ رسم پرستش در میان ابتدا
نقش بر خاتم زحرف بے صدا گنجینہ	شور در عالم ز حسن بے نشان ابتدا
چرخ را در قالب بدل عوینہ	خاک را بر نطع پیدائی ستیاں ابتدا
عاشقان موقت دار و رسن و ادا	غازیاں در معرض تیغ و سناں ابتدا
رنگہا در طبع ارباب قیاس منجمتہ	نکتہ ہا در خاطر اہل بیاں ابتدا
باچیں ہنگامہ در وحدت نمی گنجد وئی	مردہ را از خوشی دریا بر کراں ابتدا

دوئی کو مردے سے اور وحدت کو دریا سے تشبیہ دی ہے یعنی جسطرح دریا مردے کو بآہنگدیتا ہے اسی طرح باوجود ہنگامہ کثرت کے وحدت میں دوئی نہیں سما سکتی۔ بالکل نئی اور نہایت بلیغ تشبیہ دی ہے۔

ز دبا ئے بستہ باد یوار کاخے در نظر	انتہائے در نہادین و آں ابتدا
رفقہ ہر کس تا قدمگا ہے و زانجا خوشا	پایہ پایہ از سر را ز دباں ابتدا
غم جو گیر و سخت نتوان شکوہ از دلدار کرد	بہر سانی اساس آسماں ابتدا

نظم
توحید
اکبری

تھاؤ کی مثال سے کر دیا جاتا ہے۔ بلکہ کثرت کی مثال پر ہر ایک لفظ سے فوقیت رکھتا ہے؛
 مثلاً اسی کے ساتھ تغزلیات کا ایک دوسرا حصہ ایسا بھی ہے جس میں تغزل کی شان بینی
 عام شدہ اور ناس پس ہونا بہت کم پایا جاتا ہے۔ بخلاف قصیدے کے کہ ان میں قصیدہ
 کی شان نہیں کہ جو بی پیاب سے اول سے آشوب یکساں طور پر جلوہ گر ہے۔

قصائد میں مرزا نے کیسے غنائی کا شوق کیا ہے نہیں سلطان و ظہیر کا اور کیسے غنی
 و ظہیری کا؛ اور ہر ایک منزل کا میانی کے ساتھ ملے کی ہے۔ مرزا کی تشبیب نسبت
 مع کے نہایت شاندار اور عالی رتبہ ہوتی ہے؛ اور اسی سے قصیدے کی پستی و
 پختہ بی کا اندازہ کیا جاتا ہے۔ مشرقی شاعری میں عموماً اور ایران کی شاعری میں خصوصاً
 کوئی مضمون مع و سانس سے زیادہ پھیکا سے تھا۔ قصائد اور بے لطف نہیں ہوتا؛ بلکہ بالکل
 شاعرین نے مبالغہ کی نئے بڑھاتے بڑھاتے مع کو جو کے درجے تک پہنچا دیا ہے؛ اور اس
 کلیہ سے مرزا کی مع بھی مستثنیٰ نہیں۔ البتہ غنی نے مدحیہ مبالغوں میں ایک قسم کا باکپین
 پیدا کیا ہے جو اسی کے ساتھ مخصوص ہے۔ جس طرح قدما کے قصائد میں وہ ان نہیں
 پایا جاتا ابی طرح مرزا کے قصائد بھی اس سے مترا ہیں۔ لیکن مرزا کے اکثر قصیدوں
 کی تشبیبیں کچھ شک نہیں کہ غنی کی تشبیبوں سے بہت لیکنی ہیں۔

چونکہ مرزا کے تمام قصائد اور ان کے ملحقات کے انتخاب کی اس مختصر گنجائش نہیں
 ہے اس لئے ہم ایک آدھ پورا قصیدہ اور باقی صرف چند تشبیبیں ۱۰ اور ایک آدھ مع اور کچھ
 قطعے اور نوے بطور نمونے کے اس مقام پر نقل کرتے ہیں اور اخیر میں مرزا کا ایک ترکیب بند

بلکہ جس طرح سونے کو آگ میں تپانے سے اسکی کھوٹ نکالنی منظور ہوتی ہے اسی طرح، آتشِ ہنر سے نفوسِ انسانی کو مہذب کرنا مقصود ہے۔

۳۵ یارب تو کجائی کہ بہ ما زرنہی بیدرد خدائی کہ بہا زرنہی

نے نے۔ تو نہ غائبی، و نہ بیرحمی بے مایہ چو مائی کہ بہا زرنہی

اس رباعی میں مرزا کی شوخی و گستاخی حد سے زیادہ گزر گئی ہے۔ دارالافتا میں تو یقیناً اسپر کفر کا فتوے دیا جائیگا؛ لیکن ہمارے نزدیک ایسے کلام سے بچاے کفر کے زیادہ تر قائل کے ایمان اور یقین پر استدلال ہوتا ہے، صاف پایا جاتا ہے کہ سائل معاش کی تنگی و فراخی و خوشحالی و بھالی کو محض خدا کی طرف سے جانتا ہے؛ اور تدبیر و عقل و دانش کو اس میں بالکل عاجز و در ماندہ سمجھتا ہے؛ یہاں تک کہ جب معاش سے بہت تنگ ہوتا ہے تو یہ نہیں خیال کرتا کہ ہنسنے تدبیر نہیں کی، یا تدبیر میں مجھ سے غلطی ہو گئی، یا ہماری کابلی دوستی سے یہ منگدستی ہو کہ نصیب ہوئی؛ بلکہ نہایت تعجب کے ساتھ خدا کی جناب میں عرض کرتا ہے کہ کیا تیرا خزانہ خالی ہو گیا ہے۔ جو ہم کو کچھ نہیں ملتا؛ ہاں اس قسم کے خطابات آدابِ شریعت کے بالکل خلاف ہیں؛ اور ایسے ہی خطابات کی نسبت کہا گیا ہے۔

”ما بروں را تنگیم و تال را مادر وں را بنگیم و حال را“

قصائد مرزا کے قصائد جن میں قطعات، نوحے، ترکیب بند، ترجیع بند، مخمس وغیرہ بھی

شامل ہیں۔ کیا باعتبار کثرت اور کیا بلحاظ کیفیت کے انکے اصنافِ نظم میں سب سے زیادہ ممتاز صنف ہے اگرچہ مرزا کی غزل کا ایک معتد بہ حصہ متاخرین کے طبقے میں کسی بڑے سے بڑے نامور اور مسلم القوت

تھوڑے تھوڑے فرق سے رودکی اور فرخی نے بھی باندھا ہے؛ مگر مرزا کے ہاں سب سے عمدہ طور پر بندھا ہے رودکی کہتا ہے: "جہاں چہ بینی توا زنجبیاں : کہ مادر گئے گاہ ما ندری"

اور فرخی کہتا ہے: "مہر زندی بر خواجہ فگندہ ست جہاں : ایس جہاں ما در اوست کہ ما ندراست"

۳۳ آزا کہ زد سب بے زری پالست رسوائی نیز لازم احوال ست

ما خشک لبیم و خرقدہ آودہ پئے ساقی مگرش پیالہ افز و بال ست

کہتا ہے۔ کہ نفلس آدمی کے لئے یہ بھی ضرور ہے کہ رسوا اور بزنام ہو۔ چنانچہ ہلکود کیو! کہ ہمارے ہونٹ تو خشک ہیں، اور کپڑے شراب میں آلودہ ہیں؛ گویا ساقی کا جام چھلنی کا بنا ہوا ہے کہ نہ تھک تے تے ساری شراب کپڑوں پر ٹپک جاتی ہے۔ قاعدہ ہے کہ نفلس آدمی جو شراب پینے لگتا ہے وہ بہت جلد

بزنام اور رسوا ہو جاتا ہے۔ کیونکہ کبھی کلال کی دوکان پر جا کر ماتہ پیارتا ہے، اور جو تھوڑی بہت

مل جاتی ہے تو بہت ہو کر اسکی دوکان ہی پر باراہیں گر پرتا ہے، اور آنے جانے والے سب اسکو دیکھتے ہیں؛ کبھی کلال کے دام چڑھ جاتے ہیں تو اس سے بازار میں تکرار ہوتی ہے اور سب لوگ دیکھتے

ہیں۔ حالانکہ کبھی اسکو اطمینان سے سیر ہو کر شراب پینی میسر نہیں ہوتی۔ اس حالت کو اس تمثیل کے پیرائے میں بیان کیا ہے کہ گویا ساقی تقدیر ہو کہ چھلنی کے پیالے میں شراب دیتا ہے کہ ہونٹ تک تو

نہیں ہوتے اور کپڑے سارے شور بور ہو جاتے ہیں۔ ایسی تبلیغ تمثیلیں بہت کم دیکھی گئی ہیں۔

۳۴ اسے داوہ بیاد عمر در لہو و فسوس ز نہار مشور ز رحمت حق مایوس

ہشدار! کہ آتش جہنم حق را تہذیب غرض بود نہ تعذیب نفوس

فسوس۔ بہرل و استہزا کہتا ہے کہ جہنم میں ڈالنے سے بندوں کو تکلیف دینی مقصود نہیں ہے؛

ایں سیم دزست خواجہ! ایں سیم دزست
 غم نیست کہ ہر چند خوری کم نشود
 دست خوش مغلوب دزب دست، کہتا ہے کہ اے دولت مند! چاہئے کہ روپے کے کم ہو جانے سے
 تیرا دل پریشان اور غم میں دیا ہوا نہ ہے۔ اے حضرت یہ سیم دزب ہے، اور پھر کہتا ہوں کہ سیم دزب
 یہ غم نہیں ہے کہ جس قدر کھائے جائے کم نہیں ہوتا۔

۳۰ دارم دل شاد و دیدہ بینا کے
 وز کرمی گوشم بنود پروائے
 خوب ست کہ نشنوم زہر خود رائے
 گلبنانک انار کرم الا علایے
 کہتا ہے کہ مچھو کڑی گوش یعنی نقل سماعت کی کچھ پروا نہیں بلکہ اسکو بہتر سمجھتا ہوں کیونکہ منور
 اور خود پسندوں کی زبان سے انار کرم الا علی (جو کہ فرعون کا مقولہ ہے) نہیں سنتا۔

۳۱ اے کردہ بارائش گفت از لیج
 در زلف سخن کشودہ راہ خم و تیج
 عالم کہ تو چیز دیگرش میدانی
 ذاتے ست بسیط منبسط دیگر تیج
 بیج - قصد - زلف سخن میں خم و تیج کی راہ کھولنے سے مراد بیان میں پیچیدگی پیدا کرنی، کہتا ہے کہ عالم
 جسکو تو نے کچھ اور چیز سمجھ رکھا ہے - وہ صرف ذات واحد ہے جو بسیط ہے - یعنی مرکب نہیں - اور منبسط
 ہے یعنی تمام فضا میں پھیلی ہوئی ہے - پس اسکے سوا کچھ نہیں۔

۳۲ اے تیرہ زمیں کہ بودہ بستر من
 ہر خاک کہ باقت ہمہ بر سر من
 زہر بر کسان و ہر من دانہ و دام!!
 اے ماور دیگران و ماور من
 ماور من سو کیلی ماں کو کہتے ہیں - زمین سے خطاب کرتا ہے کہ اوروں کے لئے تو تجھ پر سونا بچھا ہوا ہے
 اور میرے لئے دانہ و دام کے سوا کچھ نہیں، گویا تو اوروں کی مان ہے اور میری میسر ہے۔ یہ مضمون

۲۵ گر گرد زنج گیسو بر خیزند پسند که دود از جلوس بر خیزد

بخت نتوان سدا بر گریه گراں بنشین که بخدمت در گریه خیزد

گنج گهر سے گرد آٹھنے کے معنی اسکے خالی ہو جانے کے ہیں۔ کتا ہے کہ اگر جواہرات کا خزانہ خالی ہو جائے تو بلا سے، مگر یہ گوارا مت کر کہ کسی کے جلوسے دھواں اٹھے، بھیک مانگنے والوں پر احسان نہیں رکھا جاسکتا؛ خدا نے انکی خدمت پر تھکوا کھڑا کیا ہے؛ اگر تجھے یہ خدمت پوری نہیں ہو سکتی تو بیٹھ جاتا کہ دوسرا اس خدمت کے لئے اٹھے۔

۲۶ اسے دوست بسوی این فرمانده بیا از کوچ غمید راه گردانده بیا

گفتی کہ مرا مخواں کہ من مرگ توام برگفته خویش باش و ناخوانده بیا

ادب کے دو نمبر سے صاف ہیں اسکے بعد کتا ہے کہ اسے دوست تو نے مجھے کما تھا کہ مجھے مت بلانا میں تیری موت ہوں آچھا اب تو اپنے کہنے پر قائم رہ اور جس طرح کہ موت بن بلائے آتی ہے تو بھی بن بلائے چلا آ۔

۲۷ اے آنکہ ہما اسیر دست باشد صاف مے خسروی بجاست باشد

۲۸ تسبیح بہر اسم آتھی کہ بود آغاز از ابتدا سے نامت باشد

یہ رباعی سبحان علیماں مرحوم کو جو مرزائے خط لکھا تھا اسکے اول میں لکھی تھی معنی ظاہر ہیں

۲۹ بازی خور روزگار بودم ہمہ عمر از بخت امید وار بودم ہمہ عمر

بے ایمان بودم مانند چمچہ بے وعدہ در انتظار بودم ہمہ عمر

۳۰ باید کہ دلت رغبت بر ہم نشود از رفتن ز روست خوش غم نشود

۲۱ ہر چند زمانہ مجمع جمال است

در جہل نہ حالِ ثناء بیکہ است

کودن ہمہ۔ لیک از یکے تا دیگرے

کہتا ہے کہ اگرچہ زمانے میں جہڑاں جاہل بھرے ہوئے ہیں، مگر جہل میں انکا حال تفاوت و مختلف ہے۔ کودن تو سب ہیں۔ مگر ایک دوسرے میں ایسا فرق ہے جیسا خر عیسیٰ اور خرد قبال میں۔

۲۲ تائیکش و جوہر دو مختور داریم

شانِ دگر و شوکتِ دیگر داریم

در میکدہ پریم کہ تمیکش از ما است

یہ رباعی منشی جواہر سنگ جوہر اور میر احمد حسین تمیکش کے حق میں۔ کہ دو نومرزا کے عزیز شاگردوں میں سے تھے۔ لکھی ہے۔ در میکدہ پریم۔ یعنی پیر مغانیم۔ باقی رباعی کے معنی ظاہر ہیں۔

۲۳ دستم بہ کلیدِ قوتنے سے باسیت

ور بود تھی۔ بدائے می باسیت

یا بیچ گم بہ کس تنقادے کار

یا خود بزبانہ چوں منے می باسیت

کہتا ہے کہ یا تو میرے ہاتھ میں کسی خوانے کی کٹی چاہئے تھی، اور اگر ہاتھ خالی ملا تھا تو میں کسی کا دامن ہونا چاہئے تھا۔ جبکہ قوسل سے زندگی بسر ہوتی، یا مجھ کو کبھی کسی سے کام نہ پڑتا، اور یا زمانے میں خود مجھ جیسا صاحب کمال ہوتا۔ جو میری قدر کرتا۔

۲۴ ہستم زبے امید سرست و دبست

دارم سر اس کلاہ دروت۔ دبست

گردش لطف و کرے نیت۔ دبست

استحقاقِ ترحمے ہست و دبست

سر اس کلاہ۔ یعنی سر اس شستہ۔ باقی معنی ظاہر ہیں۔

چوں نیک نظر کنی ز روئے قشیشہ ماند بہ بہائم و غفلت زارِ فرخ
یعنی زاہدوں کا بہشت میں پیماک پھرنا، اور جا بجا سنیوں پر پھلوں کے لئے ہاتھ مارنا،
اگر غور کر کے دیکھو تو اسکی مثال بالکل ایسی ہے کہ ایک وسیع چراگاہ ہے اور اس میں ڈھور
ڈانگر خرتے پھرتے ہیں۔

۱۹ اں را کہ بود درستی در فرجام ہم محرم خاص آید وہم مرجع عام
اساں نبود کشاکش پاس قبول نہ نہار نہ گردی بہ نکوئی بدنام
فرجام۔ انجام اور نکوئی انجام اور رنگ درون کو بھی کہتے ہیں۔ یہاں رنگ درون یعنی شہر
و ناموری مراد ہے۔ کتاب ہے کہ جسکی شہرت صحیح اور سچی ہوتی ہے وہ ضرور ہے کہ خواص کا
محرم اور عوام کا مرجع واقع ہو۔ مگر پاس قبول کی کشاکش یعنی ہر موقع پر اس بات کا خیال
رکھنا کہ قبولیت میں فرق نہ آئے۔ نہایت سخت چیز ہے۔ پس ہرگز نیکی کے ساتھ بدنام یعنی
مشہور ہونا نہیں چاہئے۔ اس موقع پر بچاے مشہور کے بدنام کا لفظ نہایت بلیغ واقع ہوا ہے
جس سے ساری رباعی میں جان پڑ گئی ہے۔

۲۰ در عالم بے ندی کہ تلخت حیات طاعت نتواں کرد با تمید نجات
اے کاش ز حق اشابت صوم و صلوة بودے بوجود مالِ جوں حج و زکوٰۃ
کتاب ہے کہ بے مقدوری کی حالت میں جبکہ زندگی تلخ ہوتی ہے نجات کی اُمید پر طاعت
نہیں ہو سکتی کاش ایسا ہوتا کہ جس طرح حج اور زکوٰۃ میں استطاعت اور تمویل شرط ہے روزہ
اور نماز میں بھی یہی شرط ہوتی۔

چوں عاقبتِ یگانہ بنیاں دارست دریا بکہ انجام دو بنیاں چہ بود
کتاب ہے کہ اگر منصور کو لوگ کہیں کہ سولی پر چڑھایا گیا اور ذلت سے مارا گیا تو منصور کو اسکی
کچھ پروا نہیں مگر تم دیکھو کہ جب منصور جیسے یگانہ بین لوگوں کا انجام دار ہے تو دو بینوں کا انجام
کیا ہونے والا ہے۔

۱۶ ہر کس ز حقیقت خبرے داشتہ است برخاک رہ عجز سرے داشتہ است
زاہد ز خدا رم بدعوے طلبید شد آدہانا پسرے داشتہ است
کتاب ہے کہ جو شخص اپنی یا انسان کی حقیقت سے واقف ہوتا ہے اسکو عاجزی کرنے کے
سوا کچھ بن نہیں آتی۔ پس زاہد جو خدا سے ارم بدعوے کے ساتھ طلب کرتا ہے اس سے
معلوم ہوا کہ شداد نے بیٹا اپنا وارث چھوڑا تھا۔ کیونکہ اول تو ارم جو کہ متروک شداد ہے اسکا
دعوے کرنا، اور پھر خدا کے سامنے اس کے مانگنے میں ہیکڑی کرتی، یہ دونو باتیں اس بات کی
دلیل ہیں کہ شداد نے اپنا وارث حقیقی چھوڑا تھا۔

۱۷ غالب سخن گرچہ کست ہمست از نشہ ہوش محبت اندر نیست
مے خواہی و مفت و نغز و انگہ بسیار!! ایں بادہ فروش ساقی کوثر نیست
کتاب ہے کہ اسے غالب اگرچہ شاعری میں کوئی تیرا ہمسر نہیں، مگر عقل کا نشہ تیرے دماغ میں لگ
نہیں، شراب چاہتا ہے، وہ بھی مفت، اور وہ بھی عمدہ، اور پھر کثرت سے!! یہ بادہ فروش
ہے، ساقی کوثر نہیں کہ تیری سب خواہشیں پوری کر دیگا۔
۱۸ گردین زاہدان محبت گستاخ دیں دست داری بہ تر شاخ شاخ

طیب کی طرف خطاب ہے کہ مجھے بیماری میں شراب سے کیوں منع کرتا ہے؟ اگر میں کیا
تو غضب ہو جائیگا، کہ یہ رکھنے دو تین ٹکے میرے کام تو نہ آئینگے، میرے وار تو کو بیچ جائینگے۔

۱۱ آتم کہ بہ پیائے من ساقی دہر ریزد ہمہ در و در و تلخ آب زہر

بگذر ز سعادت و نحوست۔ کہ مرا ناہید بہ غمہ گشت، و مریخ بقہر

ناہید یعنی زہرہ کو سعد اور مریخ کو نحس قرار دیا گیا ہے۔ کہتا ہے کہ سعادت و نحوست کے
خیال کو جانے دو، میرے حق میں تو سعد و نحس دو نو قسم کے ستارے نحس ہو گئے، کہ زہرہ
نے مجھے غم سے قتل کیا اور مریخ نے قہر سے۔

۱۲ شریشت کہ روی دل خراشم ہمہ عمر خونا بہ بر سنج ز دیدہ پاشتم ہمہ عمر

کافر پاشتم اگر برگ مومن چوں کعبہ سیہ پوش نباشتم ہمہ عمر

۱۳ غالب روشن مردم آزاد جد است ز قمار اسیران رہ و زاد جد است

ماترک مراد را ارم می دانیم و اں باغچہ ضبطی شد او جد است

یعنی آزاد لوگوں کی اور روشن ہے، اور جو لوگ توشہ اور رسم و راہ کے گرفتار ہیں انکا آدم
ڈھنگ ہے۔ ہم کہ آزاد لوگ ہیں ہمارے نزدیک ترک مراد کا نام ارم ہے؛ اور وہ ارم جس
شد آدم حروم رکھا گیا وہ ہمارے ارم سے الگ ہے۔

۱۴ ایں نامہ کہ راحت دل پیش آورد سرمایہ آبرو کے درویش آورد

در ہر بن نمود سید جانے۔ یعنی سامان ثنائی و خوش باخویش آورد

۱۵ منصور غمش ز نکتہ چنیاں چو بود در رست خطر ز ہشتیناں چو بود

۴۔ اے آنکہ براہ کعبہ روئے داری لازم کہ گزیدہ آرزوئے داری
 ایں گوئے کہ تہذیب خرامی۔ دائم درخانہ زن ستیزہ خوئے داری
 کعبہ جانے والے سے کہتا ہے کہ تیرا راوہ تو بہت عمدہ ہے؛ مگر تو جو ایسا بھاگا جاتا ہے میں
 سمجھتا ہوں کہ تیرے گھر میں بد مزاج عورت ہے جسکے سبب سے کعبہ جانے میں اس قدر جلدی ہے۔

۵۔ شاہرچند وایہ جو آمدہ ام دانی کہ چہ پایہ نغز گو آمدہ ام
 رنگم کہ بہار را بہ رو آمدہ ام آہم کہ محیط را بجو آمدہ ام
 ۸۔ زانجا کہ دلم بوسہم در بند بنود باہیج علاقہ سخت پیوند بنود
 مقصود من از کعبہ و آہنگ سندر جز ترک دیار زن و فرزند بنود

یعنی چونکہ میں وہم میں۔ جو نیت کو بہت کی صورت میں دکھاتا ہے۔ گرفتار نہ تھا، اسی لئے
 کعبہ کے غم سفر سے میرا مقصد زن و فرزند کا ملک چھوڑ دینے کے سوا اور کچھ نہ تھا۔

۹۔ اے جام شراب شاد کامی زوہ در جور دم از بلند نامی زوہ
 یاد آر زن چو بیستی اندرا ہے تنہا ر و خستہ حرامی زوہ

حرامی۔ فراق۔ حرامی زوہ۔ فراقوں کا لوٹا ہوا اس شعر میں معشوق کی طرف خطاب کیا
 ہے اور اپنی حالت کو اس مسافر کے مشابہ بتایا ہے جو تنہا ہو، مجروح ہو، اور فراقوں نے اسے
 لوٹ لیا ہو، گویا معشوق کو فراق ٹھیرایا ہے۔

۱۰۔ اے آنکہ ترا سعی بدرمان بست منعم مکن از بادہ کہ نقصان بست
 جیف بست کہ بعد من بمیراث رود ایں یک دوسہ ختم کہ درستان بست

زاجماع چہ گوئی بر علی باز گراے
مہ جاے نشین مہر باشد نہ بخوم
یہ رباعی مرزا کے تفسیلی ہونے پر دلالت کرتی ہے نہ تشبیح پر، کیونکہ خلفائے ثلاثہ پر بخوم کا اطلاق
حضرات شیعہ نہیں کر سکتے۔

۳ راہیت زعبد تا حضور اللہ
خواہی تو دراز گیر و خواہی کوتاہ
اِس کوثر و طوبے کہ نشانہ دارد
سر چشمہ و سایہ اسیست در غیمہ راہ

اِکسا ہے کہ بندے سے خدا کی حضور تک ایک راہ ہے یا خواہ اُسکو دراز سمجھو خواہ کوتاہ سمجھو۔ اور یہ
جو کوثر و طوبے ہیں جنیں اُسکی راہ کے کچھ کچھ نشان پاتے جاتے ہیں۔ یہ ایسے ہیں جیسے آثار
راہ میں چشمہ اور سایہ آجاتا ہے۔

۴ اَل مرد کہ دزن گرفت دانا بنود
از غصّہ فراغتش ہما نانا بنود
دار و بجاں خانہ دزن نیست درد
نازم بخدا چہ را تو انا بنود

تیسرے مصرع میں دار و کا فاعل خدا ہے جبکہ نام چوتھے مصرع میں لیا ہے خانہ سے مراد
خانہ گمبہ ہے باقی شعر کے معنی ظاہر ہیں۔

۵ بادست غم۔ اَل باد کہ حامل بیزد
اب رنج ہو شمند و عنافل ببرد
بگذاشتہ ام نخے ز صہبا بہ سپر
کیش اندہ مرگ پدر از دل ببرد

اِکسا ہے کہ غم ایک ہوا ہے۔ ایسی ہوا کہ تمام خرمن کو اڑا لیجائے؛ اور دانا اور ناداں کی آبر و کو
بہا لے جائے؛ اِسی لئے میں بیٹے کے لئے ایک شراب کا مٹکا چھوڑ چلا ہوں؛ تاکہ باپ کے
مرنے کا غم اُسکے دل سے دھو دے۔

ہم نے دونو شاعروں کی غزلوں کی شرح بخوبی کر دی ہے، مگر زیادہ نکتہ چینی کرنا غیر ضروری سمجھا ہے اور دونو غزلوں میں محاکمہ کرنا بھی ناظرین کی رائے پر چھوڑ دیا ہے۔ وہ خود بشرطیکہ فارسی شعر کا صحیح مذاق رکھتے ہوں گے، اس بات کا اندازہ کر لینگے کہ دونو غزلوں میں کیا نسبت ہے۔

رباعیات

مرزا کی رباعیاں تعداد میں قریب سو اُسو کے ہیں۔ جن میں سے اکثر شوخی و بیباکی، بادہ خواری، فحشو و مباحات، اور شکایت و زار نالی کے مضامین پر مشتمل ہیں۔ اور کسی قدر متصوفانہ، اور چند خاص خاص مضامین پر ہیں۔ خمریات میں ظاہر اعر حیا م کا تتبع معلوم ہوتا ہے۔ مرزا کی رباعی میں نسبت عام تغریات کے زیادہ صفائی و شگفتگی اور گرمی پائی جاتی ہے۔ چنانچہ ان میں سے کسی قدر رباعیاں بطور نمونے کے یہاں نقل کی جاتی ہیں۔ اور جہاں ضرورت ہوگی رباعی کے ساتھ اسکی شرح بھی کو بیجا لگی

۱ غالب بہ گمزدودہ زاد ششم
چوں رفت سپیدی ز دم چنگ شہر
رزاں رو بصفای دم تنست دم
شد تیر شکستہ نیاگاں تسلیم

گمزدو گمزدو اصل۔ دودہ۔ نسل و خاندان۔ زاد ششم چنگ کے باپ اور تورابن فریدیوں کے بیٹے کا نام ہے۔ جسکی نسل میں مرزا اپنے تئیں بتاتے ہیں۔ دم تیغ۔ تلوار کی دھار۔ دم یعنی میرا کلام سپیدی۔ سلطنت و سپہ سالاری۔ نیا۔ واز۔ نیاگاں جمع۔ کہتا ہے کہ جب سپیدی ہماری قوم سے رخصت ہو گئی تو میں نے شعر کہنا اختیار کر لیا، گویا بزرگوں کا ٹوٹا ہوا تیر میرا قلم بن گیا۔

۲ شرطت کہ بہر ضبط آداب در سوم
خیزد بجز راز نبی امام معصوم

کہ پاشکست آدمی کو جو چلنے پھرنے نہیں دیتے، اور جب تک ہڈی بھرنے جائے مقید رکھتے ہیں۔ اس کے مطلب یہی ہوتا ہے کہ آخر کار اسکو راحت حاصل ہو۔ ظہوری کے شعریں کسی قدر جدت ہے مگر شعر کی بندش سست اور ڈھیلی ہے مرزا کے ہاں مضمون میں کچھ ایسی جدت نہیں ہے مگر یہاں نہایت چست اور ٹھیک ٹھاک ہے۔

غالب

ظہوری

اگر نہ بہرین - از بہر خود غزیم دار

نہ بندگاں نسزد آرزو - خدا نکند

کہ بندہ - خوبی اُو خوبی خداوند

ہمیں بس سست کہ ما بندہ او خداوند

ظہوری کے شعریں ”خدا نکند“ یا تو محض حسوہ ہے، اور یا اس کے بعد کچھ عبارت متقدر ہے یعنی ”خدا نکند کہ ما آرزو میکنیم“ باقی شعر کے معنی ظاہر ہیں۔

مرزا کا شعر ان کی غزل میں بیت التزل ہے؛ اور معنی اور لفظاً دونوں طرح سے ظہور کے شریز ترجیح رکھتا ہے۔

غالب

ظہوری

نہ آں بود کہ وفا خواہد از جہاں لب

اسیر عشق - ظہوری نشانہ دارد

بدیں کہ پرسد و گویند بہت خرسند

نشانہ اینکہ بہید و دوست خرسند

ظہوری کے شعر کا مطلب یہ ہے کہ اسیر عشق کی یہ پہچان ہے کہ وہ دوست کے ظلم سے خوش نہ ہوا ہے۔ مرزا کے شعر کا مطلب یہ ہے کہ میر المقصود وفا کی تلاش سے یہ نہیں ہے کہ میں اہل دنیا سے وفا کا طالب ہوں؛ بلکہ میں اسی میں خوش ہوں کہ میں پوچھوں کہ دنیا میں وفا ہے؟ اور لوگ اس کے جواب میں کہیں کہ ہاں ہے۔ دونوں قطع ہوا ہیں مگر باوجود اسکے مرزا کا بیان بانگپس سے خالی نہیں۔

اسکے سوا لفظی مناسبیتیں جیسے حسن و عشق، وجود و ہستی، دشمن و دوست، اور محبت و اقبال
ایتمام شعر کا مناسب اجزا میں تقسیم ہونا۔ اسنے شعر کو بہت بلند کر دیا ہے۔

ظہوری غالب

زہر روان تو منزل شمار کہ شمر د
شمار کجروی دوست در نظر دارم
غم از کسے کہ نغید اندازند ہش چہ دست
دریں نور و ندائیم کہ آسمان چہ دست
ظہوری کہتا ہے کہ تیری راہ میں جو شخص۔ منزلیں گنتا ہے، اور یہ خیال رکھتا ہے کہ کتنا سہ
ملے ہوا اور کتنا باقی ہے۔ اُسکو تیرے رہروں میں کون شمار کرتا ہے؟ پھر کہتا ہے کہ دو غم از
کسی ست، یعنی غم معشوق اُس شخص کا حقد ہے جسکو اپنے غم کی کمی یا زیادتی کا مطلق شعور نہیں۔
مرزا کہتے ہیں کہ میرے خیال میں دوست کی کجروی کا تصور ایسا جا ہوا ہے کہ مجھے یہ خبر نہیں کہ
اِس نوزد (یعنی کجروی) میں آسمان کی کس قدر شرکت ہے۔ مرزا کا بیان کسی قدر ظہوری کے
بیان سے صاف ہے مگر مضمون کے لحاظ سے دونو شعروں میں کچھ لطافت یا خوبی معلوم نہیں ہوتی۔

ظہوری غالب

شوگستہ با یام گر چہ زنجیر ست
برخ از پے رحمت نگاہ داشتہ اند
اسیر آنکہ تبار نگاہ در بند ست
ز حکمت است کہ پای شکستہ در بند ست
ظہوری کہتا ہے کہ ایک مدت کے بعد لوہے کی بیڑی بھی کٹ جاتی ہے اور قیدی رہا ہو جاتا ہے
پس در حقیقت قیدی وہی ہے جو تازہ نگاہ معشوق میں الجھا ہوا ہے جسکو اس قید سے کبھی ہمت نہیں
مرزا کہتے ہیں کہ یہاں تکلیف میں اس لئے رکھا جاتا ہے کہ راحت حاصل ہو۔ اور اسکی مثال یہ ہے

نبیم آنکہ مبادا بمیرم از شادی
نہ گوید ارچہ بمرگ من آرزو مند

بگو حدیث وفا از تو باورست بگو
شوم فداے دروغی کہ راست بماند

مرزا نے ماتر کا قافیہ مطلع کے سوا پھر کسی شعر میں نہیں باندھا۔ اور ظہوری کے ہاں
آرزو مند کا قافیہ کہیں نہیں بندھا۔ اس لئے یہ دونو مختلف القوافی میں ایک جگہ لکھ گئی
ہیں۔ یعنی دونو کے ظاہر ہیں۔ ظہوری کا شعر بہت صاف اور لطیف اور مرزا کے شعر سے
زیادہ نچرل ہے۔ مرزا نے مضمون میں جدت تو پیدا کی ہے مگر۔ یہ سنکر کہ معشوق ہمارے مرنے
کا آرزو مند ہے خوشی سے مرجانا۔ واقع کے بالکل خلاف ہے۔

غالب

ظہوری

وجود ادبہست و ہستیم ہمہ عشق
بہجت و شمع اقبال است و سو گندست

ز اہل مہر و محبت نشان ارم کس
بہ مہر خویش بہ ہمیری تو سو گندست

ظہوری کا شعر صاف ہے۔ اول دعویٰ کرتا ہے کہ مہر و محبت کا دنیا میں کہیں وجود نہیں؛ اور اس
دعویٰ پر اپنی محبت اور معشوق کی بے مہری کی قسم کھاتا ہے جسکی غوی اور لطافت ظاہر ہے۔
مرزا کا دعویٰ یہ ہے کہ معشوق کا وجود سراپا حسن و جمال ہے؛ اور میری ہستی سراسر عشق و محبت
ہے۔ اور اس دعویٰ پر رقیب کے نصیب کی اور معشوق کے اقبال کی قسم کھاتا ہے جس میں
ظہوری کی قسم سے زیادہ لطافت اور نزاکت پائی جاتی ہے۔ رقیب کے نصیب کی قسم اس لئے
کھاتی ہے کہ جو وجود سراپا حسن و جمال ہے وہ بالکل اسی کے جیسے میں آگیا ہے۔ اور معشوق کے
اقبال کی قسم اس لئے کھاتی ہے کہ مجھ جیسا شخص اس کے سودا میں عشق و محبت کا تپلا انگیا ہے۔

جیسا کہ ظاہر ہے۔ مرزا کے ہاں نسبت ظہوری کے زیادہ گرم بندہا ہے۔

غالب

ظہوری

دراز دوستی میں چاکی از فلندہ عیب
زمینش۔ دلق و رع با ہزار پیوند

چہ غم کہ عہد گسل دارد کشاکش ناز
کہ ہر گسختنی صد ہزار پیوند است

ظہوری کہتا ہے کہ اگر ناز و غمرے کی کشاکش تجھے عہد گسختنی کراتی رہتی ہے تو کچھ افسوس کی بات نہیں؛ کیونکہ ہر گسختنی (یعنی ہر عہد گسختنی) لاکھ پیوند کا حکم رکھتی ہے۔ مطلب یہ کہ جس قدر تو عہد توڑتا ہے اسی قدر پیوندِ عشق زیادہ مستحکم ہوتا جاتا ہے۔

مرزا کہتے ہیں کہ اگر میری دراز دوستی اور بے باکی و رند مشربی نے دلق و رع و تقوے کو کسی قدر بچاڑ دیا ہے تو میرا چندان قصور نہیں ہے؛ کیونکہ اُسیں تو پہلے ہی سے ہزاروں پیوند لگے چلے آتے ہیں۔ یعنی خود اہل و رع و تقویٰ ہی اُسکی دھجیاں اڑا چکے ہیں؛ مگر ریاکاری سے پیوند لگا لگا کر اُسکا عیب ڈھانکتے رہتے ہیں۔ ظہوری کے شعر میں عشق و محبت کے ایک دقیق معاملے کی طرف اشارہ ہے۔ جو عشاق پر ہمیشہ گذرتا ہے۔ اور صنعتِ تضاد کا التزام بھی یہ چھوڑا، کہ گسختن پر اُسکے ضدِ حقیقی یعنی پیوند کا اطلاق کیا ہے۔ باوجودیکہ ظہوری کے ہاں یہ قافیہ نہایت عمدگی سے بندھا تھا۔ مرزا نے بھی اس قافیے کے باندھنے میں کچھ کم دادیلا نہیں دی؛ یہاں تک کہ ظہوری کے شعر کو شکل سے اُس پر ترجیح دیا جاسکتی ہے۔

غالب

ظہوری

معتوق کے شکر خند کو طراوت دیتا ہے (یعنی ہمارے رونے پر اسکو بے اختیار ہنسی آتی ہے) گویا ہمارے آنسو خندہ معتوق کی جڑ کو تروتازہ رکھتے ہیں۔ مرزا کے شعر کا مطلب یہ ہے کہ معتوق گویا ہر عیسے ہنسی خوشی کے ساتھ ملتا ہے مگر کوئی دلی محبت کی بات اب تک ظہور میں نہیں آئی جس سے ہمارا دل باغ باغ ہو جائے۔ اس مطلب کو اس طرح ادا کیا ہے کہ ابھی تک اسکی نگاہ مہر محبت نے لذت و علاوت کی سوت ہمارے دل میں جاری نہیں کی، بلکہ ہم صرف اس کے ظاہری شکر خند پر فریفتہ ہو رہے ہیں۔

ظہوری کے ہاں وہی لفظی مناسبیتیں جیسے دیدہ تراور ترو زبانی یا زہر گرہ اور شکر خند نسبت مرزا کے زیادہ ہیں مگر مرد کا شعراؤں سے زیادہ بلیغ نچرل اور عاشقانہ ہے۔

غالب

ظہوری

نہ گفتہ کہ بہ تلخی باز و پند پذیر

مگر کہ رخصت بے طاقتی شود مہم

برو کہ بادۂ تلخ ترازیں کینہ

کہ گوش دل شد گاں ریش گشتہ پند

ظہوری کہتا ہے کہ دل شد گاں (یعنی ہم عاشقوں) کے کان ناصح کی نصیحتوں سے زخمی ہو گئے ہیں، اُس کے اس زخم کا مرہم ہی ہو سکتا ہے کہ اُنکو بے طاقتی (یعنی بے حوصلگی اور عدم تحمل) کی اجازت دی جائے تاکہ وہ ناصح سے گلچپ ہو کر اپنے دل کی بھراس نکال لیں۔

مرزا ناصح سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ اے ناصح! تو نے یہی نہیں کہا کہ تلخی (یعنی ہمارے نصیحت) سے موافقت کر لے، اور ہمارا کتنا مان لے۔ جا! اپنا رستہ لے، ہماری شراباں سے بچتے زیادہ تلخ ہے، پس ہمکو تیری نصیحت کی تلخی سے اشتی کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ قافیہ بھی

یعنی دہش دہش میت کی ہیں۔

ظہوری

غالب

چو صبح من ز سیاہی بشام مانند
چلو نیم کز شب چند رفت یا چند

بمشق قابل دیوانگی خردمندست
بیرز جملہ کہ آزاد مرداں بندست

ظہوری کہتا ہے کہ عشق میں جو شخص دیوانگی کی قابلیت رکھتا ہے اسی کو خردمند سمجھنا چاہئے پس چاہئے کہ تو سب سے قطع تعلق کر دے؛ کیونکہ جو شخص تعلقات سے آزاد ہے وہی بندہ عشق کا فرد (یعنی اسکے لائق) ہے۔

مرزا کہتے ہیں کہ جبکہ میری صبح تاریکی کے سبب شام سے مشابہ ہے تو مجھے یہ کیا پوچھتے ہو کہ رات کتنی گزری یا کتنی باقی ہے؟ مطلب یہ کہ صبح سے شام تک اور شام سے صبح تک میرے دن اور رات پر تاریکی ہی تاریکی چھائی رہتی ہے؛ پس مجھے کیا خبر ہے کہ کتنی رات گزری اور کتنی باقی ہے؟ ظہوری کے شعروں اسکے سوا کچھ جدت نہیں ہے کہ اُس نے اپنی عادت کے موافق اُس میں بھی صنعت و تقاضا کا التزام کیا ہے (یعنی دیوانگی پر خردمندی کا اطلاق کیا ہے اور آزاد پر مقید کا) مرزا نے ایک معمولی خیال میں جدت پیدا کی ہے اور نہایت صفائی سے مطلب ادا کیا ہے۔

ظہوری

غالب

نگاہ مہربان سرزادہ چشمہ نوش
ہنوز عیش باندا زہ شکر خندست

بشکر دیدہ تر - ترزبانے دارم
کہ زہر گریہ - طراوت دہ شکر خندست

ظہوری کہتا ہے کہ میں دیدہ تر کے شکر میں تر زبان اور طرب اللسان ہوں؛ کیونکہ گریہ کا زہر

اور جس قدر غزلیں مرزا نے نظیری کی غزلوں پر لکھی ہیں اُن میں شاید ہی کوئی غزل ایسی ہو گئی جسک
نظیری کی غزل کا پتہ مرزا کی غزل سے غالب نہ ہو۔ کیونکہ اکثر کچھلے شعر اگلوں کی انھیں غزلوں پر
طبع آزمائی کرتے ہیں جو انکے سارے دیواں میں چیدہ دہر گزیدہ اور منتخب ہوتی ہیں۔ پس ایسی میزوں
میں اگلوں سے پچھلوں کا سبقت لیجا نا کچھ منہسی کیل نہیں ہے۔

اب ہم مرزا کی ایک غزل کا موازنہ ظہوری کی غزل کے ساتھ کرتے ہیں کہ یہ دونوں غزلیں
شیخ سعدی کی اس غزل پر لکھی گئی ہیں۔

”شب فراق چہ دانہ کہ تا سحر خیز است مگر سیکہ بزندانِ عشق در بند است“

اگرچہ مرزا نے ظہوری کی غزلوں پر بہت کم غزلیں لکھی ہیں۔ مگر چونکہ وہ اپنے تئیں ظہوری کا
متبع ظاہر کرتے ہیں اس لئے اسکی ایک غزل کے ساتھ بھی مرزا کی غزل کا موازنہ کرنا ضرور تھا۔
ظہوری کا دیوان جو ہمارے پاس موجود ہے اُس میں۔ یا تو کاتبوں کی تصحیف سے، اور یا خود ظہوری
کی جمیدہ بیانی کے سبب۔ اکثر اشعار کے معنی سمجھ میں نہیں آتے۔ بہت مشکل سے صرف ایک غزل
یسی نکلی ہے جسکے ہر ایک شعر کے کچھ نہ کچھ معنی اپنی سمجھ کے موافق لگائے گئے ہیں، اور اُسکے تمام
اشعار کا مقابلہ بعض اصحاب کی معرفت دوسرے صحیح نسخہ سے بھی کر لیا گیا ہے۔ اس لئے وہی غزل
موازنے کے لئے انتخاب کی گئی ہے۔ اور چونکہ وہ شیخ کی غزل پر لکھی گئی ہے اس واسطے خیال
کیا گیا ہے کہ ظہوری نے اُنہیں اپنی پوری طاقت صرف کی ہوگی۔ ایک اور وجہ اس غزل کی تخصیص
کی یہ ہے کہ مرزا نے اپنی تمام غزل میں ایک شعر کے سوا تمام اشعار میں وہی قافیہ باندھے ہیں جو
ظہوری کے ہاں بندھے ہوئے تھے۔ اور نیز دونوں غزلیں ابیات کی تعداد کے لحاظ سے بھی برابر یعنی

دلم بسیم و سجدۂ وردا لرزد کہ در درجہ بیدار و پار ساقست

براہ حققتن من ہر کہ بنگر و داند کہ میر قافلہ در کار و اس سر حقست

پہلا شعر محض زندانہ ہے، اور زبان کی گرمی اور شوخی کے سوا اور کوئی سنوئی لطافت نہیں رکھتا۔ اس کے بعد کے تینوں شعر ہم قافیہ کی رویت کے انتخابی اشعار میں سے ہر ایک کی شرح کے لکھائے ہیں۔ انہیں سے پہلا شعر ہمارے نزدیک مرزا کی تمام غزل میں بیت الغزل ہے۔ اور پچھلے دو تو شعر بھی نظیری کے غزل کے عام اشعار سے کسی طرح رتبے میں کم نہیں ہیں۔ پس اگر نظیری کا بیت ادب کیا جائے تو ہم اس سے آگے نہیں بڑھ سکتے کہ دو نو غزلوں کو مساوی درجے میں رکھیں۔ ورنہ انصاف یہ ہے کہ ہیات مجموعی کے لحاظ سے مرزا کی غزل نظیری کی غزل سے یقیناً بڑھ گئی ہے۔ لیکن ایک آدھ غزل میں نظیری سے سبقت لی جانے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ مرزا کی غزل کو مطلقاً نظیری کی غزل پر ترجیح دی جائے۔ نظیری وہ شخص ہے جسکی نسبت مرزا صاحب کہتے ہیں۔

”صائب چہ بال است شوی بچو نظیری عرفی بہ نظیری ز سائید سخن را“

اور مرزا جلال اسیر کہتے ہیں۔

بچہ شمی نظیری حد بشر نباشد

اور شیخ ابو الفضل آئین اکبری میں اسکی نسبت لکھتے ہیں ”دورے از ترہگاہ معنی بردی کشودہ اند“ پس ہماری غرض مذکورہ بالا غزلوں کے مقابلہ کرنے سے صرف اس قدر تھی کہ مرزا نے غزل میں نظیری کے متبع کو جس درجے تک پہنچایا تھا اس سے لوگ اچھی طرح مطلع ہو جائیں۔ ورنہ اس غزل کو

کام تھا تشبیہ نہایت بلیغ اور دل نشین واقع ہوئی ہے۔ یعنی مجھ جیسے اونٹے درجے کے آدمی کو جو تیری جناب میں نیاز ہے اُسپر مجھ کو ایسا ہی ناز ہے جیسا اُس فقیر کو ہونا چاہئے جو بادشاہی محل کی دیوار کے سائے میں پڑا ہو۔

غالب

نظیری

فسانہ صرف نظیری مکن کہ خواب کند بخواب چوں خم آسودہ دل اں غالب
شکستہ رک بصر درو مبتلا خفتست کہ خستہ غرقہ بخون خفتہ است تا خفتست

نظیری کے شعر کا یہ مطلب ہے کہ نظیری کو فسانہ اس لئے سنا نا فضول ہے کہ ایک شکستہ وقت آدمی (نظیری) جو طرح طرح کی تکلیف میں مبتلا ہو کر پڑ رہا ہے۔ وہ سو رہے گا۔

مرزا کے شعر کا حاصل یہ ہے کہ اگر میں سو بھی جاؤں تو اسے غالب! مجھ کو اپنی طرح آسودہ اور خوشحال نہ سمجھنا، کیونکہ بیمار (یعنی میں) جب سویا ہوں تو خون میں ڈوبا ہوا سویا ہوں۔ پس ایسے شخص کو جاگتے یا سوتے کیا راحت نصیب ہو سکتی ہے۔

یہاں تک دو نوغزلوں میں سے صرف آٹھ آٹھ شعر ہم نے نقل کئے ہیں اور مرزا کے آٹھ شعر وہ لکھے ہیں جو کسی نہ کسی قدر نظیری کے اشعار سے لفظی یا معنوی نسبت رکھتے تھے۔ اب مرزا کے باقی اشعار جو نظیری کی غزل سے تعداد میں زیادہ ہیں۔ لکھتے ہیں۔

خروشِ حلقہ بر زدن نازین سپرست کہ سر زانوے زاہد بہ بوریا خفتست
ہوا مخالفت و شب تار و بحر طواف خیز گستاخگر کشتی و نا خدا خفتست

کہ چند شب ہم آغوش خود جدا خفتست ز بخت من خبر آید تا کجا خفتست

نظیری کا شعر صاف ہے۔ کس۔ اُن کس کی جگہ لایا ہے۔ معانقہ روز وصل۔ وہ معانقہ جو وصل کے دن عاشق و معشوق میں واقع ہو۔ شعر کا مضمون معمولی ہے؛ مگر الفاظ نے جان ڈال دی ہے۔

مرزا کہتے ہیں کہ شب بھر کی درازی اور میری بیداری کا کیا خیال کرتے ہو؛ یہ تو کچھ بھی بات نہیں۔ ہاں یہ تلاش کرو کہ میرا نصیب کہاں پڑا سوتا ہے؛ کیونکہ رات کی دازی، اور میری بیداری، اور ایسی ایسی اور سیکڑوں مصیبتیں۔ سب اُسی کے سو جانے سے پیدا ہوئی ہیں۔ مجاہدہ دونوں یہ ہے کہ نظیری کا شعر زیادہ نیچرل اور حالی ہے۔ اور مرزا کے شعر میں شاعرانہ لطافت اور خوبی نظیری کے شعر سے زیادہ ہے اور کوئی بات اُس میں اُن نیچرل بھی نہیں ہے۔

غالب

نظیری

شب امید باز و ز عید مے گذرد بدیں نیاز کہ با تست ناز می رسد مے
کہ آتش بہ تماے آتش خفتست گدا بہ سایہ دیوارِ پادشا خفتست

نظیری کا شعر اُسکی تمام غزل میں بیت القزل ہے بلکہ اُسکے سارے دیوان کے اُن ۲۷ نشروں میں سے ایک نشتر ہے جو اساتذہ نے اُسکی غزلیات میں سے انتخاب کئے ہیں۔

مرزا کا شعر کو نظیری کے شعر کی برابری نہیں کر سکتا۔ مگر ایسے بلند شعر یہ یہ شعر کا نام زری کا

اس تقریر سے ظاہر ہے کہ مالِ دُنو کا یہ ہے کہ معرفتِ ذاتِ محالات سے ہے۔ مگر ہمارے
نزدیک مرزا کا بیان نظیری کے بیان سے زیادہ بلیغ اور زیادہ دلکش واقع ہوا ہے۔

غالب

نظیری

بصبح حشرِ چنیں خستہ رو سیہ خیزد

طیبِ عشق بُترِ طمعِ زیارِ

کہ در شکایتِ دردِ دُغمِ دوا خفتست

کہ شبِ احتِ ازینِ دے دوا خفتست

نظیری کہتا ہے کہ مرضِ عشق کا طبیب اُس بیمار کے علاج سے مایوس ہو جاتا ہے جو کسی
رات کو اس درِ دے دوا یعنی عشق کی چپنی سے آرام کے ساتھ سو گیا ہو؛ گویا مرضِ عشق
کی علامتِ محمودی ہے کہ اُسکو کبھی راحت نصیب نہ ہو۔ مگر شعرا کے متصوفین کے اصول
کے موافق نظیری کے بیان میں یہ خلل تھا کہ وہ راحت کو ردی علامت بتاتا ہے؛
حالانکہ عاشق صادق کی علامت یہی ہے کہ اُسکو دوست کی راہ میں درد اور تکلیف
کبھی محسوس ہی نہ ہو؛ بلکہ ہر ایک درد اور تکلیف عینِ راحت معلوم ہو۔ پس نظیری
کے بیان سے گویا یہ لازم آتا تھا کہ عاشق صادق وہی ہے جو ہمیشہ چپنی اور بقراری میں
بسر کرے؛ اور جب ایسا ہوگا تو کبھی نہ کبھی شکایت بھی اُسکی زبان سے نکلے گی۔

مرزا نے اسی لئے اس مضمون کو الٹ دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ وہ بیمار حشر کے دن دُسیا
اُٹھے جو دردِ دل کی شکایت اور دوا کی تلاش کرتا ہوا سویا ہے۔

غالب

نظیری

در ازی شبِ بیداری من اینہم نیست

کس از معانقہ روزِ وصل یا یہ ذوق

آرام بالکل برباد کر دیتا ہے۔

مرزا کہتے ہیں کہ تیرا غم شہر میں لوگوں کے گھروں پر شیخوں مار رہا ہے اور کو تو ال اپنے گھر میں اور بادشاہ مجلسِ امین میں سے پڑے سوتے ہیں یہ سچ ہے کہ مرزا کے دل میں خیالِ نظیری کے شعر سے پیدا ہوا ہے مگر مرزا کی غیر معمولی اُچک اور بلند پروازی کے ثبوت کے لئے صرف یہی اقتباس کافی ہے کہ تھوڑے سے تشرف سے نظیری کے مضمون کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے۔ نیز مرزا کے بیان میں حقیقت و مجاز دونوں پہلو موجود ہیں اور نظیری کا بیان صرف مجازی معنی میں محدود ہے۔

نظیری غالب

شیم مہر ز باغ وفائے آید
بہر چین کہ تو نیکست صباست
بیس زد و رومو قرب شہ کہ منظر
دریچہ باز و پدر و ازہ آرد خفت

اگرچہ مالِ دونو شعروں کا واحد ہے، مگر دونوں کے بیان کا عالم الگ الگ ہے۔ نظیری اس طرح بیان کرتا ہے کہ وفا کے حقیقی کے باغ سے مہر و التفات کی خوشبو نہیں آتی، گویا جس چین میں وہ پھول (یعنی معشوقِ حقیقی) کھلا ہوا ہے وہاں کی صبا پڑی سوتی ہے (یعنی اُنکو بہتر از مطلق نہیں ہے جس سے اُس چین کی خوشبو عالم میں پھیلے۔

مرزا یوں کہتے ہیں کہ آثار و افعال کے ذریعے سے اُسکو دُور ہی سے دیکھ لو، اور قربِ شاہ یعنی ذاتِ مجتبیٰ کی تلاش مت کرو، کیونکہ اگرچہ جھروکے پر ٹکھلے ہوئے ہیں (یعنی اُسکے آثار و افعال سب پر ظاہر ہیں)، مگر اندر کوئی نہیں پاتا، کیونکہ عینِ دروازے پر اڑھا سوتا ہو۔

نظیری معشوق کی اس حالت کو جب کہ وہ سوتے سے اٹھا ہو، اور آنکھیں کچھ کھلی اور کچھ مندی ہوں اور اپنا جی اُسکے سامنے سے پرے ہٹنے کو چاہتا ہو۔ اس طرح ادا کرتا ہے کہ فتنہ اٹھ کھڑا ہو اسے، اور ہمارا پاؤں سٹو گیا ہے؛ پس اُسکی چشم نیم باز کے عشوے سے کیونکر۔ ہائی ہوگی۔

مرزا مسافر کی اس حسرت ناک حالت کو جب کہ راہ بے خطر اور منزل مقصود قریب ہو مگر مسافر میں نہ اُسکی سواری میں آگے قدم اٹھانے کی طاقت ہو اس طرح بیان کرتے ہیں دگر زبانی راہ الخ ان دونو شعروں میں سے کسی ایک کو دوسرے پر مطلقاً ترجیح نہیں دی جاسکتی جو عاشقانِ مضامین کو پسند کرتے ہیں وہ ضرور نظیری کے شعر کو پسند کریں گے مگر اس لحاظ سے کہ مرزا کا بیان عاشق اور غیر عاشق سب کے حالات پر عادی ہے اور ہر شخص جس پر ایسی حالت گذرے اُسکا مصداق ہو سکتا ہے یقیناً نظیری کے شعر پر فوقیت رکھتا ہے۔

نظیری

کسے یہ قلبِ بشیم ترکتا ہے آید غمتِ شہرِ شبنونِ تہاں پر بنگہِ خلوت
کہ بر فراشِ قصبِ پایِ درخت عینِ بجاؤ و شہِ در حرمِ سرِ خفت

نظیری کا شعر محض عاشقانہ ہے اور اس لحاظ سے کہ یہ مضمون اول اُسکو سوجھا ہے مرزا کے شعر پر ترجیح دینے کے قابل ہے کہتا ہے کہ میر گھر پر آدھی رات گئے وہ شخص آکر ڈاکا داتا ہے جو ریشمی پھونوں میں پانوں کو بھندی لگائے پڑا سوتا ہے مطلب یہ کہ اُسکا قصور اور اُسکا خیال بغیر اسکے کہ اُسکو اطلاع ہو رات کو آکر چھاتی پر سوار ہو جاتا ہے اور راحت

اجل رسیدہ چہ داند بلا کجا خفتست بینہ می سپر راہ گر چہ پا خفتست

نظیری نے اس بات کو کہ عشق ایسے طور پر دفعہ پیدا ہو جاتا ہے جسکا سان گمان تک نہیں ہوتا۔ ایک معمولی حالت کے پیرائے میں جو ہمیشہ صید اور صیاد کے باہم گزرتی رہتی ہے۔ بیان کیا ہے۔ نظیری کا بیان۔ جیسا کہ ظاہر ہے۔ بہت صاف اور نیچرل ہے۔ اور گو یہ مطلع اُسکے اعلیٰ درجے کے اشعار میں محسوب نہیں ہو سکتا لیکن مرزا کے مطلع سے بہر حال بہتر ہے۔

ہر ترانے کو یا اپنی ناگوار زندگی کا دشوار گزار مرحلہ خوشی خوشی طے کرنے کو اس تمثیل میں بیان کیا ہے کہ جس خطرناک وادی میں حضرت خضر بھی ٹھنڈے پٹ جاتے ہیں وہاں سینے کے بل ہلکتا ہوں۔ مرزا کے اس مطلع پر ان کی زندگی میں ”عصا خفتست“ کے لفظ پر اعتراض ہوا تھا؛ مرزا نے جواب دیا کہ سعدی نے بھی تو کہا ہے ”وے بجلہ اول عصاے پیر خفتست“، مگر اس جواب کو لوگوں نے تسلیم نہیں کیا؛ کیونکہ شیخ کے ہاں اس قدر غرائز موجود ہیں کہ وہ عصا خفتن، اسے جو معنی اُس نے بطور استعارے کے مراد رکھے ہیں ان کے سوا دوسرے معنی کی طرف خیال ہی نہیں جاتا۔ بخلاف مرزا کے شعر کے کہ جب تک یہ نہ بجایا جاسکے کہ سعدی نے عصا خفتن کے یہ معنی لئے ہیں۔ تب تک اُس سے یہ معنی مفہوم نہیں ہو سکتے۔

غالب

دگر زایمی راہ و قرب کعبہ چہ چنا
مرا کہ ناقہ زر قنار ماند و پا خفتست

نظیری

کیا ز عشوہ آں چشم نیم باز زہیم
کہ قنہ خاستہ از خواب پای پا خفتست

مرزا کی غزلیات۔ جو مقدار میں چار ہزار بیت سے کچھ زیادہ ہیں، اور جن میں منتخب اور برگزیدہ ہمارے ایک چوتھائی سے کم نہ ہونگے۔ انہیں سے کسی قدر اشعار جو سرسری نظر میں صاف اور عمدہ معلوم ہو بطور نمونے کے یہاں نقل کر دئے گئے ہیں تاکہ جو لوگ فارسی شعر کا صحیح مذاق رکھتے ہیں۔ مگر اتنا دماغ نہیں رکھتے کہ مرزا کے کلام کو اول سے آخر تک بغیر غور و دیکھیں۔ وہ مرزا کی غزل کا نمونہ دیکھ کر اس کا اندازہ کر سکیں کہ مرزا کی غزل شعراے ایران کے کون سے طبقے کی غزل سے مناسبت رکھتی ہے؟ اور انکی اور مرزا کی غزل میں کیا نسبت پائی جاتی ہے؟ اگرچہ مقتضائے مقام یہ تھا کہ اس موقع پر مرزا کی چند غزلوں کا موازنہ ان سب لوگوں کی غزل کے ساتھ کیا جاتا جنکی غزل پر مرزا نے اپنی غزل بلکہ اپنی تمام شاعری کی بنیاد رکھی ہے؛ یعنی نظیری، عرفی، ظہوری، طالب، اسیر وغیرہ مگر چونکہ اس مختصر میں زیادہ گنجائش نہیں؛ اور نیز عام طبائع کو اس قسم کی توقیعات سے کچھ دل بستگی بھی نہیں معلوم ہوتی اس لئے یہاں مرزا کی صرف دو غزلوں کا مقابلہ نظیری اور ظہوری کی غزلوں سے۔ کہ اس وقت ان دونوں کے دیوان ہمارے پاس موجود ہیں۔ کیا جاتا ہے۔

نظیری کی جو مشہور غزل پافخت اور بلاخفت ہے مرزا صاحب نے بھی اس پر غزل لکھی ہے۔ نظیری کی غزل نوبت کی ہے جس میں سے ایک شعر بڑھا نہیں گیا اور مرزا کی غزل بارہ بیت کی ہے۔ اس لئے مرزا کی غزل میں سے بھی اول صرف اٹھ بیتیں یہاں لجا بیٹگی تاکہ ٹھیک ٹھیک موازنہ ہو سکے اور بعد موازنے کے مرزا کے باقی اشعار بھی نقل کر دئے جائیگے۔

طالب

نظیری

ہوا دئے کہ در اں خضر اعضا خفت

نظر بفا ہر وصیاد در خفا خفت

ہر کہ بستی در برش - داغ تور ویدیش نل - تا چو بد گیرے دہر - باز بری بد اور ی
 کتا ہے کہ جسکے پہلو میں دل ہے اسکے دل سے تیرا داغ رویدگی کی طرح اگتا ہے، اور یہ اس لئے
 کہ اگر وہ دل کسی اور سے لگائے تو تو اس محبت سے کہ تیری نشانی اسپر موجود ہے - وہاں سے اپنی
 چیز یعنی دل واپس لے لے۔ داوری جھگڑاٹٹا۔ اور محبت۔

ریشک ملک چو چرا چوں بتورہ نئی برد - بیدہ دیہو اے تومی پرداز سبکری
 یعنی ہم ملا کہ پر کیوں ریشک کریں جبکہ وہ بھی بے فائدہ تیری تلاش میں پرواز کرتے پھرتے ہیں اور
 تجھ تک نہیں پہنچ سکتے۔

حیف کہ سن بختیم - وز تو سخن بود کہ تو - اشک بدیدہ بشمیری، نامہ بسینہ بگری
 یعنی افسوس ہے کہ میں تو خون میں پڑا ہوا لوٹوں اور تیری نسبت یہ کہا جائے کہ تو آنسو آنکھ کے اندر
 گن لیتا ہے اور فریاد کو سینے کے اندر دیکھ لیتا ہے۔

کوثر اگر بن رسد خاک خرم زبے نئی - طوبی اگر زمین شود ہمیشہ زبے بری
 یعنی میری شرمی بخت کا یہ حال ہے کہ اگر کوثر جھک کر لمبا ہے تو اُس میں باقی زبے اور مجھے اُس سے
 خاک کے سوا کچھ حاصل نہو اور اگر طوبی میری ملک ہو جائے تو وہ ایسا بے بر ہو جائے کہ اُسکی
 لکڑی ایندھن کے کام آئے۔

بیتیم از گداز دل در جگر آتش چو سیل - غالب اگر دم سخن رہ بضمیر من پری
 کتا ہے کہ اگر فکر شعر کے وقت تو میری حالت درونی کو ٹوٹے تو دل کو گداز سے ایک لگ کی رو بہتی ہوئی جھکنا نظر
 آئے۔ یہ اس جوش اور اس آگ کا بیان ہے جو اہلی شاعروں کے دلیں شعر کہتے وقت جھڑکتی رہتی ہے۔

یعنی اگر اس کہنے میں تیری کسر نشان نہ ہو تو اسے غالب تیری مثال ابر بہاری کی سی ہے کہ موتی بڑا سا
اور ان کی گنتی نہیں بتاتا یعنی بے شمار موتی برساتا ہے۔

دریا ز جباب آبلہ پاسے طلب بست نورِ نظر اسے گوہرِ نایاب کجائی
شورِ سیتِ نوارِیزی تارِ نفسم را پیدا نہ اسے خبیثِ مضرب کجائی
یعنی میرے تارِ نفسم سے جو نفسمے نکل رہے ہیں انھوں نے ایک شور برپا کر رکھا ہے؛ مگر اسے خبیث
مضرب کہ جس سے یہ تاجِ رہا ہے تو کہاں ہے؟ تیرا کہیں پتا نہیں۔

بنما سے بہ گوسا پرستماں یہ بھیا غالب بہ سخنِ صاحبِ تاب کجائی
فرتاب کر رہے، اور معجزے کو کہتے ہیں، گوسا پرستوں سے کہ وہ ایک ایسا عجیب و غریب شخص ہے جس سے
کو مانتے ہیں۔

دیدہ در آنکہ تانہ دل بشمارِ دلیری در دلِ سنگِ بنگرِ درِ قصبِ تانِ آری
دیدہ ورنہ یعنی صاحبِ نظر و شہ قصب ہے کہ جب اسکو یہ خیال پیدا ہو کہ دنیا میں کون سی چیزیں دلکش و دلربا
ہیں تو وہ انگڑ پیچ کے اندر تانِ آری کو قفس کرتے ہوئے دیکھ لے یعنی ماؤ سے میں جو قابلیت
اور تہاد و خدا نے دویت کی ہے وہ پہلے اس سے کہ قوت سے فعل میں آئے اس پر ظاہر ہو جائے۔
لے تو کو بیچِ ذرہ را جز برہِ نورِ دینست در طلبیتِ تو اں گرفتِ بادِ یہ را برہری

یہ خطاب ہے جنابِ حدیث کی طرف۔ کہتا ہے کہ جس ذرے کو دیکھے اسکا منہ تیرے ہی رستے کی طرف
پھرا ہوا ہے اور اس لئے تیری راہ طلب میں خود بادِ یہ یعنی صحران کو اپنا رہبر بنایا جاسکتا ہے کیونکہ
اسکا ہر ذرہ تیری طرف رہنمائی کرتا ہے۔

ایکہ قسم نہ ہی داد دل۔ آرے نہ ہی
تاچ من دل نہاں شہوہ نگارے نہ ہی
چشمہ نوش ہانا نہ تراود زوے
کش نگیری و در اندیشہ قنارے نہ ہی
کتا ہے کہ اُس دل سے یقیناً چشمہ نوش نہیں ٹپک سکتا جسکو کہ تو بھینچا تھوڑے میں قنارہ نہ یوے۔
یعنی جب تک کہ دل عشق مجازی کے صدمے میں جھیلیا اور طرح طرح کی کوفت ایس نہیں اٹھاتا
صفائی اور لطافت اور گھلاوٹ پیدا نہیں ہوتی۔

ماہ و خورشید ویں دائرہ بیکار نیند
تو کہ باشی؛ کہ بخود رحمت کارے نہ ہی
اور وہ کام ہی ہے کہ عشق کے خشکے میں دل کو قنارہ دیا جاوے۔

سربراہ دم شمشیر جوانی نہ ہی
تن بہ بندے غم فراق سوارے نہ ہی
خوں بزدق غم یزداں شناسے نخوری
دیں مہر حق الفت گذارے نہ ہی
یزداں شناس اور حق الفت گذار، دونوں مرکب صفتیں ہیں۔ باقی شعر کے معنی ظاہر ہیں۔
آخر کار نہ پیدا ست؛ کہ در تن فسرد
کف خونے کہ بدان ز نیت داکر نہ ہی

فسرد و فسر دون کا مضارع ہے۔ فسردن ٹھہر جانا خشک ہو جانا یعنی کیا یہ بات ظاہر نہیں ہے؟ کہ وہ
خون جس سے تو کسی صلیب کو زنگین نہ کر گیا مرنے کے بعد بدن میں خشک ہو کر رہ جائیگا۔

حیث گرتن بسگان سر کوئے زرد
واے گرجاں بسیرا بگدرے نہ ہی
ہزنان اجل اردست تو ناگاہ و بزد
نقد ہو شے کہ بسوداے بہارے نہ ہی
بجھ طرہ حوران بہشت آویند
ناز پروردہ دے را کہ بیارے نہ ہی
گر تزل نبود۔ ابر بہاری غالب
کہ در افتانی و ز افشا نہ شمارے نہ ہی

کہتا ہے کہ تو سینے میں دل کی طرح اور دل میں جان کی طرح بیٹھ چکا ہے؛ پھر بھی تیری گاہ و مہر فرا کا وہی حال ہے جو پہلے تھا؛ کہ محبت کی آگ بھڑکائے چلی جاتی ہے۔

عقاب و مہر تو از ہم شناختن نتوان خرد فریب ادائے کہ دہشتی داری
جانیاں ز تو برگشتہ اند گر غالب ترا چہ پاک؟ خدا لے کہ دہشتی داری
بیہودہ نیست سعی صبا در دیارِ ما اے بوے گل پیام تنائے کیستی
یادش بخیر تا چہ قدر سبز بودہ اے طرف جو بار چمن جاے کیستی

جائے کسے سبز بودں۔ اسکی جگہ کا خالی رہنا۔ اور سبز ہونے کے معنی سرسبز و شاداب ہونے کے بھی ہیں۔ طرف جو بار۔ کنارہ جو بار۔ چمن کی پٹری پر سبزہ دکھل کر کہتا ہے کہ اے کنارہ جو بار چمن! تو جو اس قدر سرسبز و شاداب ہے تو کس کی جگہ ہے۔ چونکہ وہاں معشوق کو نہیں پایا اس لئے بغیر نیلگون نیک کے اول یادش بخیر لکھ کر پھر سوال کرتا ہے۔

نشیدہ لذت تو فردوسیر و دبدل اے حرف! محو بل شکر خائے کیستی
از بیچ نقش غیسر نکوئی ندیدہ اے دیدہ محو چہرہ زیبائے کیستی
با بیچ کا مسر لیں ہمہ سختی لمیزود اے شب برگ من کہ تو فردا کیستی

برگ من۔ یعنی اے شب تجھ کو میری موت کی قسم۔ چونکہ اس وقت اپنی موت سے زیادہ کسی چیز کو عزیز نہیں سمجھتا اس لئے رات کو اپنی موت کی قسم دے کر پوچھتا ہے کہ تو کیسی فردا سے قیامت ہے؛ یعنی جو سختی کہ تجھ میں میرے اوپر گزر رہی ہے کسی کافر کے ساتھ نہ گزرتی ہوگی۔ پھر تو کافر سے بھی بڑھ کر کون سے کنگار کی قیامت کا دن ہے؛ بتا تو ہسی؟

زردشت کیشے آتش پرستے برسم گزارے زرم سرانے

برسم۔ جھاؤ یا نار وغیرہ کی بالشت بالشت بھر کی لکڑیاں کاٹ کر آتش پرست رکھ لیتے ہیں، اور عبادت، یا نہانے، یا کھانے کے وقت ان کو ہاتھ میں لے کر پڑھتے ہیں۔ برسم گزار اور زرم سرانے آتش پرست کو کہتے ہیں۔ زرم اور زرمہ وہ دعا ہے جو آتش پرست برسم ہاتھ میں لیکر پڑھتے ہیں۔

درکینہ ورزی تفسیدہ دشتے درمہ ربانی بتاں سرانے

تفسیدہ دشت پتا ہوا صحرا۔ باقی شعر کے معنی صاف ہیں۔

اوزلف پرچم مشکین نقابے از تابش تن زریں روانے

یعنی زلف پرچم اسکے چہرے پر ایسی معلوم ہوتی ہے جیسے سیاہ نقاب منہ پر پڑی ہوتی ہو۔ اور جو کپڑا وہ بدن پر ڈالتا ہے وہ بدن کی چمک دکھ سے سنہری معلوم ہوتا ہے۔

در عرض دعویٰ لیے نکو ہے برز عزم غالب مجنوں ستانے

یعنی جب دعویٰ حسن و جمال کرتا ہے تو لیلیٰ کی ہجو کرتا ہے، اور غالب کے چڑانے کو مجنوں کی تعریف کرتا ہے کہ وہ بڑا عاشق صادق تھا۔

تو کے زور پشیاں شدی۔ چرمی گوئی دروغ راست نمائے کہ دشتی داری

یعنی تو جو یہ کہتا ہے کہ میں ظلم سے پشیاں ہو گیا ہوں، تو کب پشیاں ہوا ہے؟ کیونکہ وہ جھوٹ جو سچ معلوم ہو۔ جیسا تو پہلے بولتا تھا اب بھی بولتا ہے۔ پس تیرا یہ کہنا کہ میں ظلم سے پشیاں ہوں یہ بھی اسی ظلم میں داخل ہے۔

بیمہ چوں دل در دل جہاں خریدی باز نگاہ مہر فزائے کہ دشتی داری

عاشق

عاشق

موت ہے میری اس پر جاننا کہ ساتھ ساتھ میری، اور یہ بھی بھلا علی سنگٹ گیا وہی، حدیثات اور
 شہادتیں یہ تو ہیں تو سنئے یا نہ سنا، وہ سب پیدا کرنے سے پہلے سنگ و گیاہ کو مٹا کر دیا۔ یہاں کہ
 لکھو یہ کہ میری سب پیدا کر دی اور رشتوں کا یہ دوان اور انسان سے پہلے پیدا ہونا ثابت کیا گیا ہے۔
 یہ اس قدر عظیم الشان ہے کہ نہ وہ دل ہی تپد غمزدہ با از کار نامہ سب سب سرسبز و اگر دہ
 شمع میں سپر اپنی عادت کے موافق شوقی کی ہے، تمام نامہ تمام حالتوں کو جو قائل پر گذر رہی ہیں
 ات کو ان کی شوقی، یہ خوش کے عمدہ میرا ہے میں ڈھار ہے، کتا ہے کہ انکے روتی ہے، زبان فریاد کرتی
 ہے، ہر اس قدر تپ ہے کہ ان کو تمام عتد سے ترئے مل کر دے میں، چونکہ انکے کار و نامہ بیان کا فریاد
 ہوتا، وہ دل تپتا، ان تپتوں میں ایک کشائش کی صورت محسوس ہوتی ہے اس لئے
 ان تمام حالتوں کو اپنے غمزدوں کے مل کر دے سے تعبیر کیا ہے، اگر اس ضمن میں کو شوقی پر محمول
 کیا گیا ہے تو میری بھی ہو سکتے ہیں، جو عشق کی معراج میں ہے کہ انکے روتے، زبان فریاد کرے، اور
 دل تپے، پس غالب پر جو یہ باتیں ملاری ہیں گوئے عشق کی راہ میں تپتے، تپتے تپتے وہ
 آیتیں سب مل کر دے۔

تا ہم ز دل بزد کا منہ را دئے	بالا باند کے کوتہ قبائے
چوں مرگ ناگر بسیار تلخ	چوں جان شیریں اندک وفائے
در کام بخشش مرگ سیرے	در دستانی بہر گدائے
گستاخ ساز، چو زنی پندے	طاقت گدازے صبر آزمائے
از خوش و خوش و خوش سبے	وزر دے دلکش مینہ قنائے

غزل
 سلسلہ
 عاشقانہ

تو نے گنہگار کے ساتھ مدار یعنی رعایت کی اور اسکو بخش دیا تو یہ عین انتقام ہے ؛ وہ اس منہ کو
سے کہ باوجود اس قدر گناہوں کے کہ کو کچھ سزا نہیں دی۔ گویا سات و ذرخوں میں چھوٹک یا گیا۔

صد کشاد آنرا کہ ہم امر و زنج نموده
خستگان را دل بشیرهای بنیاد

مژدہ باداں را کہ محو ذوق فردا کردہ
بادرستاں گرنواز شہاے پیدا کردہ

خستگان - زخمی اور شکستہ دل لوگ یعنی خلی حالت زار بظاہر ایسی معلوم ہوتی ہے کہ گویا انپر خدا کا عقد
ہے ۔ درست - صحیح و سالم کہتے ہیں ؛ درشتاں اسکی جمع ہے یعنی وہ لوگ خلی حالت درست اور
ہر ایک خلی اور شکستگی سے محفوظ ہے۔ گویا انپر خدا کی عنایت و مہربانی سب سے زیادہ ہے ۔ کہتا ہے کہ اگر
تو نے درستوں پر ظاہری عنایتیں سبزل فرمائی ہیں تو زخمی دلوں کو پوشیدہ مہربانیوں سے مفتوں
کیا ہے ۔

تلخی نے در مذاق ما گوارا کردہ

چشمہ نوش است از زہر عتاب کام جاں

خدا تعالیٰ کے غصے اور عتاب کو چشمہ نوش قرار دیتا ہے ؛ اور اسکو شراب سے تشبیہ دی ہے کہ جس
طرح شراب کا ذائقہ ہر شخص کو تلخ معلوم ہوتا ہے ؛ مگر شریبوں کے مذاق میں اس سے زیادہ کوئی شے
خوشگوار نہیں ۔ اسی طرح تیرا عتاب گویا ہر تلخ معلوم ہو مگر تیرے عشاق اسکو چشمہ نوش سمجھتے ہیں ۔
جلوہ و نظارہ پنداری کہ از یک گوہر
خوش را در پردہ خلقے تماشا کردہ

کہتا ہے کہ تو نے مخلوقات کو پیدا کر کے انہیں اپنے حسن کا آپ تماشا دکھا ہے ؛ تو گویا جلوہ حسن اور

نظارہ عشق و حقیقت ایک ہی جنس سے ہیں یعنی ناظر اور منظور ایک چیز ہیں ۔

چارہ در سنگ و گیاه و رنج با جاندار بود
پیش از ان کیں در سدا آنرا میا کردہ

دم سے مراد بات ہے دوسرے مصرع کے یہی ہیں کہ اُسکے غم میں آدم کہ گندم بیسی عزیز چیز
ز اسوش ہو جاتی ہے۔

گئے لعنہ بر حن مطرب سرودہ گئے خسروہ بر نطق ہدم گرفتہ

یہ بیدار وعدہ کشتہ بر ہم نہ سادہ بیاز بیچ صد گونہ ماتم گرفتہ

یعنی آپ ہی مارتا ہے اور آپ ہی بطور کیل کے ماتم کرتا ہے۔

بروش ز گرمی نگہ تاب خورہ بکوش بر فتن صبا دم گرفتہ

نیار د ز من بسیج کہ یاد ہرگز مگر خوے خاقان اعظم گرفتہ

ظفر کز دم دوست در نکتہ سنجی کہ غالب باوازہ عالم گرفتہ

یہاں دم کے سنی افسون اور کراست کے ہیں تقدیر عبارت یوں ہے کہ غالب در نکتہ سنجی

یہ آوازہ عالم گرفتہ۔

چوں ز بانہا لال جانہا پزغوغا کردہ بایت از خویش پر سید انجہا با کردہ

یہ تمام غزل توحید میں ہے۔ کتا ہے جبکہ تو نے ہماری زبانیں گونگی کر دی ہیں اور باوجود اسکے

جانوں کے اندر شورش بھردی ہے۔ اب تو اپنے ہی سے پوچھ لے کہ تو نے ہمارے ساتھ کیا

سلوک کیا ہے۔

گرہ مشتاقِ عرضِ مستگاہِ حسنِ خویش (طاںِ فدایت) دیدہ از بہر چہ بینا کردہ ✓

ہفت دوزخ در نہادِ سرساریِ منہست انتقام ست ایں کہ با مجرم مدارا کردہ

کتا ہے کہ شرمندگی وہ عذاب ہے جسکی نہاد یعنی ذات میں ساتوں دوزخ چھپی ہوئی ہیں۔ پس اگر

تاکہ مجھے ضبط نہ رکھے، اور کھل کھیلوں، اور اس عجزِ خواری کے عذاب سے نجات پاؤں۔

لیکھتے

سرمایہ کراست کن و انگاہ بغارت بر
بر خرمن مابر تے بر مزرعہ باراں شو

اگرچہ ہوتا ہمیشہ یہی ہے کہ اول سرمایہ دیتے ہیں پھر جب چاہتے ہیں اُسکو تباہ کر دیتے ہیں مگر شاعر بطور بیانہ کے یہ جانتا ہے کہ ہماری کھیتی پر بیخہ تو کبھی نہیں برساتا مگر خرمن پر بجلی گرا تا رہتا ہے یہ انسان کی ایک قدرتی خاصیت ہے کہ مصیبتوں کے وقت نعمتوں کو بالکل فراموش کر دیتا ہے اسی خاصیت پر شاعر نے شعر کی بنیاد رکھی ہے۔

ذیل کی غزل مسلسل اور محض عاشقانہ ہے جس میں معشوق کی خصلتیں بیاں کی ہیں، اور اُسکو بہادر شاہ کی تعریف اور شکایتِ طرفیانہ پر ختم کیا ہے۔ اس غزل میں صرف حسن بیان کا لطف ہے، خیالات بلند نہیں ہیں۔

۴
سلسل
عاشقانہ

بے دارم از اہل دل رم گرفتہ
بشوخی دل از خوشنیتن ہم گرفتہ
دل گرفتن اکتا جانا یعنی اس قدر شوخ اور نازک مزاج ہے کہ اپنے اپنے سے بھی بگڑ جاتا ہے۔
و سفاک گفتن چو گل پر شکفتہ
دریں شیوہ خود را مسلم گرفتہ
یعنی اگر کوئی اسے سفاک کہتا ہے تو برا نہیں مانتا بلکہ خوش ہوتا ہے گویا اپنی سفاکی کو مسلم التبتاً ماننے ہوئے ہے۔

غنوں خواندہ و کارِ عیسے نمودہ
پری بودہ و خاتم از جسم گرفتہ
یعنی غنوں سے معجزے کا کام لیتا ہے اور پری ہو کر جمشید کی انگوٹھی چھین لیتا ہے۔
دش ز خنہ در زہرِ یوسف فگندہ
غمش گندم از دست آدم گرفتہ

کسی کے ذہن نشین کرنے نہایت مشکل تھے؛ مگر الحمد للہ کہ خود ہماری قوم میں حسن اتفاق سے اس وقت ایک شخص موجود ہے جسکی حالت پر نظر کرنے کے بعد اس شعر کے کوئی دوسرے معنی ان معنوں سے زیادہ چسپاں نہیں معلوم ہوتے۔ یعنی ڈاکٹر سر سید احمد خاں جنہ کا فرامحد، نیچری، دجال، سب کے کماواتا منظور کیا مگر قوم کی خیر خواہی سے دست بردار نہوا۔

ازہرہ ردائ گشتن قلم نتوان گشتن جوئی! بر خیاباں رو سیلی! بر بیاباں شو

ہر زہ یعنی برائے نام جاری ہو جانے سے قلم نہیں ہوا جاسکتا۔ اسے مخاطب تو ایک نالی ہے باغ کی کیاریوں میں جا؛ اور ایک رُو ہے جنگل کی راہ لے۔ یہ اُن ناقص العیار لوگوں کی طرف خطاب ہے جو کسی فن میں تہذیبی سہ شد بد حاصل کر کے اپنے تئیں کاملین میں شمار کرنے لگتے ہیں۔

گر چرخ فلک گردی سر بر خط فرماں نہ در گوئے زیریں باشتی وقت خم چوگان شو

یعنی تو کیسا ہی عالی رتبہ اور گراناہ ہو جائے اطاعت و فرمانبرداری کرنی ضرور ہے چاہو طاعت کو عام لو اور چاہو خاص خدا کی فرمانبرداری مراد رکھو کیونکہ جس طرح دین میں بغیر خدا و رسول کی فرمانبرداری کے کام نہیں چلتا اسی طرح دنیا میں سلاطین و ملوک اور ماں اور باپ اور افسلہ و آقا و غیرہ کی اطاعت کہ بغیر کچھ بن نہیں آتی۔

در بند شکیبائی مردم ز جگر خالی اے خوصلہ تنگی کن۔ اے خصلہ فراوان شو

کتاب ہے کہ صبر کے شکنجے میں نہیں کلیجہ مسوتا مسوتا مر گیا۔ یعنی تھک گیا۔ اب سوا اسکے اور کسی طرح اس بلا سے چھٹکارا نہیں کہ خوصلہ تنگی کرنے لگے اور غم حد سے بڑھ جائے۔ پس کتاب ہے کہ اے خصلہ! تو جیسا کہ اب تک فراخ اور وسیع رہا ہے اب برخلاف اُسکے تنگ ہو جا؛ اور اے غم! تو زیادہ بڑھا

خطبات
مختصر

رحمت

مکمل

کہتا ہے کہ ہستی کے دھوکے کا عبا ر جواہ میں اٹھا ہوا نظر آتا ہے یہ سب بیٹھ جائیگا یعنی سب
 فنا ہو جائیں گے اور توحید عیانی کا دریا سو خن ہوگا یعنی ذات واحد کے سوا کچھ باقی نہ رہیگا۔
 دولت بخلط بنود از سعی پیشیاں شو کا فر نتوانی شد ناچار مسلمان شو
 کہتا ہے کہ دولت یعنی سعادت کبھی غلطی نہیں کرتی، وہ اسی کے پاس جاتی ہے جو اسکے لائق
 ہوتا ہے۔ پس تو اسے مخاطب اپنی سعی سے پیشیاں ہو۔ اور وہ دولت کیا ہے؟ کا فر نہ بنا۔ کہتا ہے
 کہ تو کا فر تو نہیں ہو سکتا لاچار مسلمان پر فطاعت کرو غالباً مرزا نے کفر سے وہ کفر مراد لیا ہے جو فضیلت
 کی اصطلاح کے موافق ایک بڑا مرتبہ مراتب فقر و رویشی میں سے شمار کیا جاتا ہے۔ لیکن قطع نظر
 ان معنوں کے اس شعر کے ایک اور معنی نہایت لطیف و پاکیزہ زمانے کے حسب حال بھی ہو سکتے
 ہیں۔ جو شاید شعر کہتے وقت مرزا کے خیال میں نگذرے ہوں، مگر ضرور ہے کہ انھیں کے نتائج نکالنا
 میں شمار کئے جائیں۔ کیونکہ بلغا اکثر کلام کی بنیاد ایسے جامع اور حاوی الفاظ پر رکھتے ہیں کہ گو قائل کا
 مقصود ایک خاص معنی سے زیادہ نہ ہو مگر کلام اپنی عمومیت کے سبب بہت سے محل رکھتا ہو۔
 مطلب یہ ہے کہ ایسا مسلمان ہونا جسکو سارا زمانہ مسلمان کہے اور مسلمان سمجھے۔ یہ تو بہت
 آسان ہے، مگر قوم کی بھلائی کی وہ تدبیریں کرنی۔ کہ اسکی بھلائی انکے بغیر دشوار معلوم ہو۔ اور ان
 تدبیروں کے اختیار کرنے میں لوگوں کے طعن و تشنیع سے نہ ڈرنا۔ یہاں تک کہ بد مذہب اور کافر
 مشہور ہونا مگر قوم کی خیر اندیشی سے دست کش نہ ہونا۔ نہایت دشوار بلکہ بعض حالتوں میں قریب
 ناممکن کے ہے، کہ ہزاروں اور لاکھوں میں نہیں بلکہ کروڑوں میں ایسا ایک فرد دنیا کی عجائبات
 میں سمجھا جاتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ ایسا کا فر دنیا تو بہت مشکل ہے، ناچار مسلمان پر اکتفا کر۔ یہ معنی

ہے چہ می گویم؟ اگر اینست وضع روزگار
دستِ اشعار بابِ سوختنِ خواہد شدن
آس سے پہلے بطورِ فخر کے کہا تھا کہ یوں ہوگا اور دُوں ہوگا؛ پھر کہتا ہے کہ ہے نہیں
کیا کہتا ہوں؟ اگر زمانے کا حال ایسا ہی رہا تو دفترِ شعر بابِ سوختنِ یعنی جلا دینے کے
لائق ہو جائیگا۔

چشم کو رآینتہ دعویٰ کفِ خواہد گرفت
دستِ شلِ مشاطہ زلفِ سخنِ خواہد شدن
شاہِ مضمون کہ اینک شہری جانِ دست
روستا آوارہ کام و دہنِ خواہد شدن
یعنی آئندہ یہ حال ہوگا کہ شاہِ مضمون جوابِ جانِ دول کے شہر میں تمام رکھتا ہے وہ کام
دہن کے دیہات میں آوارہ ہو جائیگا۔ یعنی جن اشعار اور خیالات میں اب نہایت دقیق
اور گہری نگاہ سے غور کی جاتی ہے وہ صرف لوگوں کی زبانوں پر چبائینگے اور انکی تہ کو کوئی نہ پہنچے گا۔
زراغِ رازِ اندر ہوائے نغمہ بالِ پرِ زناں
ہم نوائے پردہ سنجانِ چینِ خواہد شدن
جنگلی کوتے (یعنی تنگ بندی کرنے والے شاعر) نغمہ سنجی کی ہوا میں پلکھ پھارے ہوئے چین کے
نغمہ سنجوں (یعنی عالی درجہ شاعروں) کی برابری کرینگے۔

شاد باش ایدل دریں محفل کہ ہر جانِ نغمہ است
شیونِ ریخِ فراقِ جانِ تنِ خواہد شدن
آبِ کتاب ہے کہ دنیا میں ان باتوں کا فکر کرنا بے سود ہے؛ یہ سب نئے موزوں ہوں یا موزوں
ایک دن موت کے نوحے بجائیں گے۔

ہم فروغِ شمعِ ہستی تیرگیِ خواہد گزید
ہم باطنِ بزمِ مستی پر شکنِ خواہد شدن
اگر دیندار وجودِ از رگہ ز خواہد نشست
بھرِ توحیدِ عیانی موزِ سخنِ خواہد شدن

ہومن یعنی حکیم مومن خاں۔ جنکے دیوان اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں موجود ہیں
 مشیر۔ یعنی نواب ضیاء الدین احمد خاں رئیس لوہارو۔ جنکا کلام دونوں زبانوں میں بقدر
 معتد بہ موجود ہے مگر کوئی دیوان مرتب نہیں ہوا۔ صہبائی۔ یعنی مولانا امام بخش۔ جنکی نظم و
 نثر فارسی اور دیگر رسائل اور شروح تین جلدوں میں چھپ کر شائع ہو چکی ہیں۔ علوی
 مولانا عید اللہ خاں علوی استاد مولانا صہبائی۔ جنکی نظم و نثر فارسی چھپ چکی ہے، اور عربی
 میں بھی انکے قصائد موجود ہیں۔ حسرتی۔ نواب محمد مصطفیٰ خاں رئیس جہانگیر آباد۔ جنکے دیوان
 اردو و فارسی دونوں زبانوں میں چھپ چکے ہیں؛ اور اسکے سوا سفر نامہ حج، تذکرہ گلشن بخارا
 اور رقعات فارسی بھی انکی تصانیف سے شائع ہو چکی ہیں۔ آذرودہ مولانا مفتی محمد صدیق خاں
 جنکا کلام اردو و فارسی اور عربی تینوں زبانوں میں موجود تھا مگر افسوس ہے کہ آئیں سے
 بہت کچھ ضائع ہو گیا ہے۔ لیکن بعض مذہبی رسالے جو ان سے یادگار گئے ہیں شائع ہو چکے ہیں۔
 تازہ دیوانم کہ سرست سخن خواہد شدن
 کو کبسم را در عدم اوج قبولے بودہ است
 ایں مئے از قحط خریداری کہن اہد شدن
 شہرت شہرم بہ گیتی بعدین خواہد شدن
 چاک ہا ایتار حبیب پیرین خواہد شدن
 حرف حرم در مذاق فتنہ جا خواہد گرفت
 دستگاہ نازشخ و برہمن خواہد شدن
 کتاب ہے کہ میرا ایک ایک حرف مذاق فتنہ میں جگہ پائیگا۔ یعنی فتنہ کو پسند آئیگا۔ جسکا نتیجہ یہ
 ہوگا کہ برہمن اسکو اپنے موافق سمجھے گا اور شیخ اپنے موافق خیال کرے گا؛ اور دونوں اپنی اپنی جگہ
 اسپر فخر کریں گے، اور ایک دوسرے کو جھٹلائیں گے؛ اور آپس میں گل خپ ہوں گے۔

یہ شعر
 تازہ دیوانم کہ سرست سخن خواہد شدن
 کو کبسم را در عدم اوج قبولے بودہ است
 ایں مئے از قحط خریداری کہن اہد شدن
 شہرت شہرم بہ گیتی بعدین خواہد شدن
 چاک ہا ایتار حبیب پیرین خواہد شدن
 حرف حرم در مذاق فتنہ جا خواہد گرفت

یعنی وہ اس طرح ناجست روائی کرتا ہے کہ اکثر مجھ کو شوق نہیں ہوا کہ کیونکر یہ کام نگیلا۔
 نزل کی غزل نواب مصطفیٰ انان مرعوم کے مکاں پر جو مشاعرہ ہوتا تھا اسیں پڑھی گئی
 تھی۔ چونکہ ذاتی کے تمام نام و بر شعرا کا۔ جو وہاں فارسی غزلیں لکھ کر لیجاتے تھے۔ مرزا نے
 اس غزل میں ذکر کیا ہے اور غزل بھی نہایت فصیح ہے اس لئے بطور یادگار کے ماری
 غزل یہاں نقل کیا جاتی ہے۔

دلِ مردم بچم طرہ خم در خم شاں	ناری چہ غزلانِ مردم ریم شاں
طرہ حور و لاویر تراز پرچم شاں	کافر آتش تہاں چوے کہ ہرگز نبو
آہ ازیں طائفہ وانکس کہ بوچرم شاں	آتشکار کش و بدنام دکانامی جو
نہر آسودہ دلالِ حرم و زرم شاں	رتک پرستہ تنہا ر دوادی دام
خستگانِ مذکور دانی و نزاری غم شاں	بگنہ رازستہ دلانے کہ ندانی ہش د

یعنی ان مصیبت زدوں کو جانے دے جنگ تو نہیں جانتا، مگر خبردار رہ کہ بہت سے ایسے
 آفت زدہ ہیں جنگ تو جانتا ہے مگر ان کا کچھ غم نہ جھکو نہیں۔

آتش است آتش اگر نہیہ دگر مہم شاں	دماغِ خوں گرمی اس چارہ گر انم گوئی
چہ بامنت بسیار نہی از کم شاں	ایکے راندی سخن از نکتہ سرایان
باو و خلوت شاں شیک شاں از دم شاں	ہند را خوش نصیبانند سخند کہ بود
حسرتی اشرف و آزرده بود عظم شاں	مومن و تیر و صہبائی و علوی و دنگا
ہست در بزم سخن ہم نفس ہدم شاں	غالب سوختہ جاں اگرچہ نیز و شہار

دانش و گنجینہ پنداری کیست حق نہاں داداں چہ پیدائند استیم
 پنداری اور گوئی اور گویا کے ایک معنی ہیں۔ کہتا ہے کہ علم اور خزانہ گویا ایک ہی چیز ہیں؛ کیونکہ
 جو چیز مٹے علانیہ مانگی۔ یعنی دولت۔ وہ خدا نے ہمو پوشیدہ طور پر دی۔ یعنی علم و ہنر
 رفت و باز آمد ہما در دام ما باز سر دادیم و عفت خواستیم
 کہتا ہے کہ ہمارے دام میں پھنس کر نکل گیا تھا پھر آن بھنسا؛ اب چاہئے تھا کہ اُسکی زیادہ نگہ رانی
 کرتے اور اُسکو کھنے نہ دیتے؛ مگر مٹے اُسکو خود چھڑ دیا اور عفت کی خواہش کی۔ ہمارے مراد دولت دنیا
 اور عفت اسے مراد احدیت ذات۔

وختے در سفر از برگ سفر داشتہ ایم تو شہ راہ۔ دے بود کہ برداشتیم
 داغ احسان قبولی لیمانشیت ناز بر خرمی بخت ہند داشتہ ایم
 قبولی اور قبول ایک معنی میں آتا ہے۔ خرمی بخت، ہنرمی سر سبزی بخت ہنر۔ کہتا ہے کہ ہمکو
 اپنے ہنر کی خوش نصیبی پر ناز ہے کیونکہ اُسپر کمینوں کی قبولیت کے احسان کا داغ نہیں ہے۔
 یہاں خرمی بخت کا لفظ استہزاؤ نامازی بخت پر بولا گیا ہے۔

زخم جگرم بخجہ و مرہم نہ پسندم موج گہرم۔ جنش و زرقارند اغم
 یعنی جس طرح زخم جگر تک بخجہ و مرہم کی رسائی نہیں ہے اور آپ کو ہر کی موج میں غنیش و زرقار
 نہیں ہے؛ ایسا ہی میرا حال ہے۔ یعنی نہ کسی کو میرے درد کی خبر ہے؛ نہ میرے کمال کی اطلاع
 نقد خروم۔ سکھ سلطان پیریم جنس ہنرم گرمی بازارند اغم
 غالب نبود کو ہتی از دوست۔ ہمانا نذاں ساں و ہدم کام کہ بسیارند اغم

جو ہم شبِ ہمہ را در غلط مبتدا یم ز نیمہ رہ ز مہ را با تباں بگردانیم
یعنی سب کو راستہ کے دھوکے میں ڈال دیں۔ یہاں تک کہ چرواہے کو ریڑھ سمیت اُدھے رستے
سے شہر کی طرف اُلٹا پھیر دیں۔

بجنگِ باج ستانانِ شاخساری را تنہی سب ز درِ گلستاں بگردانیم
یعنی جو لوگ درختوں سے میوہ اور فواکہ کی ڈالی لینے کو آئیں انکو ڈکرا بغ کے باہر ہی سے خالی ہال
کے ساتھ پھیر دیں۔

بصلحِ بالِ نشانانِ صبحگا ہی را ز شاخسار سوے آتیاں بگردانیم
یعنی جو پرندے صبح کو گونسلوں سے درختوں پر آکر کھیل کرتے ہیں ان کو نرمی اور چکار کے
ساتھ گونسلوں کی طرف لوٹا دیں۔

ز حیدریم من و تو۔ ز ما عجب نبود گرا آفتاب سوے خادراں بگردانیم
کتاب ہے کہ ہم تم حیدری ہیں! ہم سے تعجب نہیں کہ جس طرح بقول بعض حیدر کرار سے معجزہ
رؤ الشمس ظاہر ہوا تھا۔ ہم بھی آفتاب کو مشرق کی طرف واپس پھیر دیں۔

رفت بر ما انچہ خود ما خواستیم وایہ از سلطان بغوغتِ اخویم
قاعدہ ہے کہ جب فقیر بادشاہ سے بھیک مانگتے وقت شور و غل کرتا ہے تو اسکو مار کر مٹا دیتے
ہیں اور کچھ نہیں دیتے۔ کتاب ہے کہ ہمیر جو سختی گزری وہ خود ہم نے ہی چاہی تھی! کیونکہ پادشاہ سے
بھیک مانگتے وقت غل شور بہت کیا! اس لئے وہاں سے دھکاکے لگے اور کچھ نہ ملا۔ سلطان
مرا و خدا قاتلے ہے۔

چھین لیا ہے۔ مرزا کے مقطع کا مطلب اب یہ ہو گیا کہ نظمیں کی غزل پر غزل لکھنی تھی تو
خطا۔ مگر میں نے اسپر ایسی غزل لکھی ہے کہ اپنی اس خطا پر آفریں کا امیدوار ہوں۔

بیا کہ قاعدہ آسماں بگردانیم قضا بگردشِ ظلِ گراں بگردانیم

مشتوق سے کتا ہے کہ تو آتا تاکہ آسماں کا یہ قاعدہ کہ وہ دوست کو دوست سے نہیں ملنے دیتا

ہم تم دونوں ملکر لپٹ دیں؛ اور حکم قضا کو ظلِ گراں یعنی جامِ شراب کی گردش سے پھیر دیں

بگوشہ بنشینیم دور سے اذکنیم بگوچہ بر سرِ رہ پاسبان بگردانیم

دور سے اذکنیم یعنی دروازہ بند کر دیں اور چوکیدار کو حکم دیں کہ کوچے میں پھرتا رہے اور کسی کو آنے کو

اگر ز شمعہ بود گیر و دار بندیشیم و اگر ز شاہ رسد ارغماں بگردانیم

اگر کلیم شود ہجر باں سخن نہ کنیم و اگر خلیل شود میہاں بگردانیم

گل افکنیم و گلابے برگز پاشیم مے آوریم و قح دریاں بگردانیم

نذیم و مطرب ساقی ز انجمن راسیم بکار و باز نہیے کار داں بگردانیم

گئے ہلا سخن با ادا بیامیزیم گئے یوسہ زباں در داں بگردانیم

لا بہ تعلق و خوشامد سخن کو ادا کے ساتھ ملانا راؤ چاؤ اور راز و نیاز کی باتیں کرنا۔

نیم شرم یک سوؤ با ہم آویزم بشوئے کہ رخِ اختراں بگردانیم

ز جوشِ سینہ سحرِ نفس فرو بندیم بلائے گرمی روز از جہاں بگردانیم

یعنی احتلاط کے موقع پر ہم دو تو ایسے زور زور سے سانس لیں کہ صبح کا دم بند کر دیں، اور اسکو

طلوع نہونے دیں، اور دن کی گرمی کی بلا جہاں سے ٹال دیں۔

اس شعر کے مصداق وہ مکار اور بیکار لوگ ہیں جن کا مستخرج اور متدس سمجھ کر ان کے آگے کوئی بات سنسی یا بے تندی یا رند مشربی کی کہتے ہوئے شرم آتی ہے، گراگو ذرا ٹٹول کر دیکھئے، انودہ ٹٹی کی ادھیل شکا رکھینے والے نکلتے ہیں، اس میں خطاب شہق کی طرف ہے۔ جو نو عمر ہونے کے سبب مقدس آدمیوں کی محبت سے بھاگتا ہے۔

نشتہ ام بگدائی بٹا براہ و بنیز ہزار درو بہر گوشہ دکیں دام
 بنو ز کا لفظ میاں ایسا ہے جیسا اردو میں درتہم، "ایا در وجود اسکے" بولتے ہیں، کتاب کے
 کہ میں امیروں کی طرح سرائی کے لحاظ سے تو ایسا ہوں جیسے شاہراہ میں ایک گدا بیٹھا ہو
 مگر اس لحاظ سے کہ لوگ میرے معنوں پڑاتے ہیں۔ میرا یہ حال ہے کہ ہزاروں چوٹے میری
 لگات میں لگے ہوئے ہیں۔

زود عدد و وزیریاں را فردن نیازا ند توقعی عجب از آہ آتشیں دام
 کتاب کے کہ اہل دوزخ کو ظاہر ہے کہ میعاد معین سے زیادہ دوزخ میں نہ کھینگے؛ پس اس خیال سے
 میں اپنی آہ آتشیں سے ایک عجیب توقع رکھتا ہوں؛ یعنی یہ کہ آہ آتشیں بھی ہمیشہ نہ رہے گی
 اس توقع کو عجیب اس لئے کہا ہے کہ اسکو بھی دوزخ پر قیاس کر کے اس سے آخر کار نجات
 کا امیدوار ہے۔

جواب خواجہ نظیری نوشتہ ام غالب خطا نو دہ ام و چشم آفریں دام
 دوسرا مصرع نظیری کا ہے جس کا پہلا اصل مصرع یہ ہے دمرایہ سادہ و لیہاے سن تو ان کشیدہ
 نظیری کا یہ شعر بڑے رتبہ کا ہے؛ مگر حق یہ ہے کہ مرزا نے یہ مصرع تقنین کیا کیا ہے گویا اسکو

یاد باداں روزگار کا اعتباری شتم آہ آتش ناک و چشم شکبارے و شتم
 جوانی کے زمانے کو یاد کرتا ہے۔ جبکہ بواہوسی یا عشق و محبت زور شور پر تھا، آہ آتش ناک
 تھی اور آنکھ اشکبار۔

دیگر از خویشم خبر نبود تکلف بر طرف۔ ایں قدر داتم کہ غالب نام یارے شتم
 ایں چہ شورست کہ از شوق تو در دادم دل پروانہ و تکلیف سمندر دادم
 اں چرا و طرف۔ ایں چہ و در تعب خندہ پر غفلت درویش تو نگردادم
 کتا ہے کہ میں درویش اور تو انگرد و نوں کی غفلت پر ہنستا ہوں جبکہ دنیا کا طرف بے رعب
 و زور پہنچ ہیں تو ایک خوش کیوں ہے؟ اور دوسرا بچیدہ کس لئے ہے؟

راز دار تو بدنام کن گردش چرخ ہم سپاس از تو وہم شکوہ ز اختر دادم
 خدا سے کتا ہے کہ جو کچھ تکلیف پہنچتی ہے اسکی مصلحت کو خوب سمجھتا ہوں؛ مگر آسمان کی بدنام
 کرتا ہوں۔ پس در حقیقت تیرا احسان مند ہوں مگر بظاہر تارے کا شکوہ گزار۔
 خوشنودم از تو وز پے دور باش خلق آوازہ جفاے تو در عالم فلک شتم
 کتا ہے کہ میں نے تجھ کو جفا کار اس لئے مشہور کر رکھا ہے کہ اور کوئی تیری طرف رغبت نہ کرے
 ورنہ میں در حقیقت تجھے ہر طرح راضی اور خوشنود ہوں۔

دو ز بندہ بر فرض زمین اب آسمان حاشا کہیں فشار درابر و ہم آفکنم
 ہم بعالم زابل عالم بر کنار افتادہ ام چون امام سجد بیروں از شمار افتادہ ام
 زمین حذر کنی گر لباس میں دادم نفقہ کا فرم و بت و استی دادم

عاشقانہ

عاشقانہ

عاشقانہ

عاشقانہ

عاشقانہ

روانہ کردہ ایم یعنی جاری کردہ ایم۔ کتاب ہے کہ چونکہ لب پر یا علی جاری ہے اس لحاظ سے
تو مجھے مذہب حق اختیار کیا ہے، اور چونکہ اسپر شراب جاری ہے اس لحاظ سے معنوں یعنی
آتش پرستوں کا سائیش کرتے ہیں یعنی دنیا اور دین دونوں کو حاصل ہیں۔

بادہ بوم غوردہ وزیر تہمارا بختہ وہ کہ نہ ہرچہ نامتراست ہم ہنر کردہ ایم
یعنی شراب پینا اور روپیہ ضائع کرا تو برا انتہا ہی، ہنسنے ان بڑائیوں کو بھی خوبی کے ساتھ کیا
شراب پی تو قرض کی، اور روپیہ کھو یا تو جوئے میں۔

نار بنگستہ ایم۔ داغ بدل ہفتہ ایم دولتیان نمسکیم نہ بختہ نہ کردہ ایم
نار لب بنگستہ ایم یعنی اسکو تنہ سے نہیں نکلنے دیتے، اور ضبط کرتے ہیں، اور داغ کو دل میں
چھپائے رکھتے ہیں، ہم دولت مند تو ہیں مگر خسیس ہیں اپنی دولت کو خزانے میں رکھتے ہیں۔
گرفرا موشی بفریاد دم۔ وقتت قبت رفتہ ام از خوشین چند انکہ دریا چو دم
کتاب ہے کہ میں اپنے آپ سے تو گدہ لگیا ہوں مگر ابھی آپے کو بھولا نہیں ہوں اگر فراموشی
اس وقت میری فریاد کو پہنچے اور آپے کو بھلا بھی دے تو بہت مناسب ہے۔

ہر قدم نشتے ز خود رفتن بود در بارین ایچو شمع بزم در راہ قنار و خودم
کتاب ہے کہ راہ قنار میں جو کچھ کہ میرے بار یعنی خورجی یا زنبیل میں ہے وہ صرف یہی ہے
کہ ہر قدم پر تھوڑا تھوڑا اپنے آپ سے دور ہوتا جاتا ہوں۔ گویا جس طرح کہ شمع راہ قنار
میں آپ ہی اپنا راہ و راہ ہے کہ برابر بگھلتی جاتی ہے اور راہ و راہ کی طرح بٹرتی جاتی ہے۔
طرح میں بھی آپ اپنا راہ و راہ ہوں۔

نابلد ہیں؛ یا یوں کہو کہ اس رستے میں گمراہ ہیں؛ وہ معرفت الہی کو اس قدر دشوار نہیں سمجھتے جس قدر کہ عوفا اور گئل او یا سمجھتے ہیں۔ اس مطلب کو یوں بیاں کرتا ہے کہ میری گمراہی کی شامت سے راہ اپنے اوپر اس طرح بل کھاتی ہے جس طرح رستی یا ڈور زیادہ بل کھانے سے چھوٹا ہو جاتا ہے پس دو یعنی راہ معرفت باوجودیکہ بہت دور و دراز ہے مجھ کو کوتاہی کا غشہ یعنی فریب دیتی ہے۔

شعلہ چاہے غم کرا۔ گل تلگد مزد کو شمع شبستانیم۔ بادِ سحر گاہیم
اپنی مصیبت اور اپنی فیفرسانی اور اسپر لوگوں کی بید روی اور ناقدر دانی ظاہر کرتا ہے کہتا ہے کہ میں گویا شمع شبستانی ہوں کہ آہیں سے شعلے جھڑتے ہیں مگر کسی کو اس کے ساتھ بھڑی نہیں۔ اور گویا میں بادِ سحر گاہی ہوں جو پھول کھلاتی ہے مگر اسکی بھرت کوئی نہیں ادا کرتا۔
اوصف طفلان و سنگ رہ نہ بختیگ زود ز کو نگدزد کو کبیشاہیم
یعنی میری شاہانہ سواری کو بچے سے جلد نہیں گذرتی کیونکہ لڑکوں کے ہجوم اور پتھروں کے سحر او سے راہ تنگ ہو جاتی ہے۔

جذب تو باید قوی کاں ہر دہاگست گرتواندر سید بخت بہمراہیم
کہتا ہے کہ تیرا جذبہ قوی چاہئے جو مجھ کو منزل تک لیجائے۔ پس نصیب اگر میرے ساتھ نہ چل سکے تو کچھ حرج نہیں۔

ہم اسد اللہم و ہم اسد اللہم
شرابِ حق گزیدہ ایم عیشِ منانہ کردہ ایم

غالب نام احمد نام و نشاۃم پیر
بر لبِ یاعلیٰ سراے۔ بادہ وادہ کردہ ایم

خطرہ ہوتا ہے اور اسکی ملک کے لئے کوئی سوار آتا ہے تو اول گرد نظر آتی ہے با پھر سوار نمودار
 ہوتا ہے مگر اس دشت میں گرد پتی آثار و علامات تو سب موجود ہیں مگر سوار کا کہیں پہ نہیں
 چھیں کہ نخل بلند سے سنگ پیدا زمیوہ تانہ فتنہ خود ز شاخسار چھ خط
 یعنی جبکہ نخل اس قدر بلند ہے اور پھل جھاڑنے کے لئے پتھر ناپید ہیں تو جب تک میوہ خود
 درخت سے نہ گرے۔ یعنی جب تک جائزہ عنایت ہکو خود اپنی طرف نہ کھینچے اور شاہد حقیقی
 خود اپنی بھلکی نہ دکھائے۔ ہکو کیا فائدہ؟

نہ مراد ولت دنیا۔ نہ مرا اجر جمیل نہ چو مزود توانا۔ نہ شکیبا چو خلیل
 بنہ و بارہ شبگیر در افگندہ براہ آنکہ دانست سراپگی صبح خیل
 بنہ و بار۔ ساز و سامان شبگیر بھلی رات۔ یعنی جو شخص جانتا ہے کہ کوچ کی صبح کو کیسی گھبرا
 اور کھل پٹی پڑتی ہے وہ رات ہی سے تمام ساز و سامان باندھ جوڑ کر رستے کے سر پہ
 ڈال دیتا ہے۔

نہ کنی چارہ لب خشک سلمانے را اسے بر تر سا بچکاں کہ وہ بے تابیل سبیل
 یہ خطاب ہے ہمدانی طرف۔ معنی ظاہر ہیں۔
 غالبیہ شہ جاں را چہ بگفتار آری بدیا کے کہ نہ مانند نظیری قاتل
 نہ مانند نظیری قاتل یعنی نظیری اور قاتل میں فرق نہیں کرتے۔

یسکہ بچہ پر خوش جاہدہ گزائیم رہ ہد رازی دہر عشوہ کوتا ہیم
 ایک بھٹل بات کو محسوسات کی تمثیل میں ظاہر کیا ہے ظاہر ہے کہ جو لوگ طریق معرفت سے

جان کہ اٹھا یعنی جو جان کے جانے سے کیفیت ہوتی ہے وہی اسکے جانے سے ہوئی۔
 دل زباں را راز دان آشنایمانخواست
 گاہ بہاں گفتمش گاہے فلان نامید
 در سلوک از ہر چہ پیش آمد گذشتن و اتم
 کعبہ دیدم نقش پایے رہروان میدش
 دل و غمش بسوزا کہ جاں میدہد عمن
 ورجاں وہی نغمے بہ ازاں میدہد عمن
 بنود سخن سرائی مارا نگاہاں کہ دوست
 دل می برد ز ما و زباں میدہد عمن

کہتا ہے کہ سخن سرائی ہمو گفت نہیں ملی ہے؛ بلکہ دوست جب دل لے لیتا ہے تو اسکے عمن زبان عنایت کرتا ہے۔ زبان کو دل کا عوض قرار دینے میں شاعر نے لطافت یہ رکھی ہے کہ فی الحقیقہ جب تک انسان کہیں دل نہیں دیتا اور عاشق نہیں ہوتا تب تک زبان میں گرمی اور شعلہ بیانی پیدا نہیں ہو سکتی؛ خواہ عشق مجازی ہو اور خواہ عشق حقیقی۔

مرا کہ بادہ ندارم ز روزگار چہ خط
 ترا کہ بہت دنیا شامی از بہار چہ خط
 خوش بہت کو ترو پاکست بادہ کہ درو
 ازاں ر حیق مقدس دریں خار چہ خط
 چمن پراز گل و نسرن و دلربائی نیست
 بہشت فتنہ ازیں گرد بے سوار چہ خط

چمن پراز گل و نسرن سے مراد دنیا ہے؛ اور دلربائی سے مراد وہ ذات بے نشان ہے جو دیر و دریا سے باہر ہے۔ کہتا ہے کہ اس فتنہ خیز دشت یعنی دنیا میں۔ جہاں قدم قدم پر راہزن اور تفریق گھات میں لگے ہوئے ہیں۔ اس گرد بے سوار سے کیا مدد پہنچ سکتی ہے۔ قاعدہ ہے کہ جب راہزن فرکو

۴ بہاں اور فلان دونوں مراد یک گد گریں۔ جب کسی کا نام مراخہ نہیں لینا ہوتا تو وہاں یہ الفاظ بولے جاتے ہیں۔ اور ویں بھی

موقع پر وہ یا دہ شخص یا امکا ڈھکا بولتے ہیں ۱۲

و رجب امر یہ آتا ہے تو ضرور کسے مٹتی دیتا ہے۔

و دہرہ آئے تن نسبت، آسمانِ میسر
ویدہ بر خواب پریشان و جہانِ میسر

دنیا وافیہا کا بیج ہونا بیان کرتا ہے، اور کہتا ہے کہ ایک خیالی و ہواں اٹھکر شامیانہ سانگیا
ہم نے آسکا نام آسمان رکھ لیا۔ اور آٹکھ کو ایک پریشان خواب نظر آیا اسکو جہاں سمجھ گئے۔ اسی طرح
سکے بعد کے کئی شعروں میں اسی مضمون کی تفصیل ہے۔ مثلاً

دہم خاکے تخت در چشم بیابانِ میسر
قطرہ بگداخت - بحر بیکرانِ میسر
باد و اس ز در آتش نو بہاراں خرم
واغ گشت آل شعلہ از مستی خزاںِ میسر

چونکہ نو بہار میں تمام جذباتِ نفسانی جوش میں آتے ہیں، اور عشق و ہوس کی تحریک ہوتی ہے
اس لئے بار کو آگ سے تشبیہ دیتا ہے۔ کہتا ہے کہ ہوائے آگ کو دامن سے سلگایا میں نے اسکو
بہار قرار دیدیا۔ اور جب وہ شعلہ جل چکا تو میں نے اسکا خزاں نام رکھ دیا۔

غربتم ناسازگار آمد - وطنِ نصید
کرد تنگی حلقہ دوام - آشیانِ میسر
کہتا ہے کہ جب پردیس میں مجھے تکلیفین پہنچنے لگیں تو میں اسکو وطن سمجھا، گویا جب دام کے حلقہ نے
تنگی کی تو میں اسکو اپنا آشیانہ سمجھ گیا۔ مطلب یہ کہ وطن میں اس قدر بے مہری اور مغائرت لوگوں
سے دیکھی تھی کہ جب پردیس محبکو اس نہ آیا تو میں نے اسکو بھی وطن ہی تصور کر لیا۔

بود در پہلو تب کیئے کہ دل مے گفتش
رفت از شوخی بآینے کہ جانِ میسر
میاں بود کی ضمیر عشق کی طرف راجع ہے۔ کہتا ہے کہ وہ میرے پہلو میں ایسی تکیں کے ساتھ
بیٹھا تھا جس طرح پہلو میں دل رہتا ہے۔ اور وہ شوخی سے اٹھکر اس طرح چلا گیا کہ میں اسکو

زبانہ شعلہ وہ تجلی جو سنگ و گیاہ یعنی کوہ طور و نخل امین پر ظاہر ہوئی تھی اسکی طرف خطاب کرتا ہے کہ اسے شعلہ بطور پتھر اور درخت سے جو کہ تیرے قابل نہیں ہیں کیوں لپٹتا ہے؟ ہماری آنکھ کی راہ سے دل میں اُتر اور جان سے بھڑک اُٹھ۔

عیادت است نہ پر خاش تند خوئی صیبت؛ بیاؤ، غمزدہ بنشین، و لب گزاں بر خیز
معتشوق عیادت کو آیا ہے اور عاشق کا حال نہایت سقیم دیکھ کر بے لطف ہوا ہے اُس سے کہتا ہے کہ تو عیادت کے لئے آیا ہے، لڑائی کے لئے نہیں آیا، پھر تند خوئی اور بد مزاجی کیسی ہے؟ یہاں آکر بے لطفی کے سوا اور کیا حاصل ہو سکتا ہے؟ پس آ۔ اور مغوم بیٹھ۔ اور ہونٹ کاٹا ہوا اُٹھ۔

نفس چون بوں گرد دیور ابرماں گیر محرم سلیمانم نقش خاتم از من پر
کہتا ہے کہ جب نفس مغلوب ہو گیا پھر جن کو محکوم کر لیا آسان ہے۔ میں سلیمان کا محرم راز ہوں، اُنکی آنکھوں پر یہی نگیں کندہ تھا جس سے تمام جن اس کے محکوم تھے۔

بوسہ از لبانم وہ، عمر خضر از من خواہ جام نئے بہ پیشیم نہ، عشرت جم از من پر
و در من بود غالب، یا علی بوطالب نیست بخل با طالب، یا عظم از من پر
کہتا ہے کہ میرا وظیفہ یا علی ابن ابی طالب ہے، مجھ کو طالب صادق سے کچھ بخل نہیں ہے، یا عظم
مجھ سے پوچھو کیسی ”یا علی“ اسم اعظم ہے۔

آرایش جبین شگرفاں ز چین شناس لطفے حجت ہر نگہ خشمگین شناس
ز نہار قدر خاطر اندو گھیں شناس بے غم نہاد مرد گرامی نئے شود
ز نہار کے معنی یہاں ضرور بالفور رکے ہیں۔ یہ لفظ جب نہی پر آتا ہے تو ہرگز کے معنی ہوتے ہیں

عاشق

اخلاق

مردانہ

عاشق

کتاب ہے کہیں جس وادی میں ہوں یہاں کا پانی تو تلخ ہے اسے ہم فرزانہ اگر تو فیاض ہے تو شہر سے
میرے لئے سرخیمپہ نوش یعنی شراب لا۔

دائم کڑے داری۔ ہر جا کڑے دار کیا
مے گزند ہر ساطاں از بادہ فروش آور
گر مرغ بیکہ و ریزہ دیر کف نہ در اہی شو
ورشہ بسیدو بخشہ بردار و بدوش آور

کتاب ہے کہ تیرے پاس دام بھی ہیں، اور تو سب جگہ آتا جاتا بھی ہے؛ اگر بادشاہ عطا کرے تو قبضہ۔
ورنہ بادہ فروش سے لا۔ اگر مرغ (آتش پرست) یعنی بادہ فروش تو نیچے میں ڈال دے تو تو نیا ہاتھ
رکھ اور چلے۔ اور جو بادشاہ گھڑا بھر کر عنایت کرے تو کندھے پر اٹھا اور لے آ۔

ریحاں درد از مینار آش جگہ از قتل
آں در رجہ چشم افکن این اپنے گوش آور

رامش۔ راگ۔ آں سے مراد ریحاں اور ایں سے مراد قتل۔

گا ہے بسبکدستی از بادہ ز خویشم بر
گا ہے بسبکدستی از نعمہ بیوش آور

گا ہے بسبکدستی یعنی کبھی جلدی سے مجھ کو شراب پلا کر مدہوش کر دے اور پھر حب میں بدست

ہو جاؤں تو مجھ کو گانا سنا کر ہوشیار کر دے

غالب کہ بقایش باد۔ ہمپاے تو گرنا بد
بارے غلے، فردے ازاں موئے تپن آور

ہمپاے تو یعنی ہمراہ تو۔ موئے پوش اوئی کپڑے پہننے والا۔ مزارا جاڑے میں روئی دار کپڑا پہننے
تھے؛ اکثر اوئی یا شیمینے کا چنہ کوٹ اور ٹوپی وغیرہ پہنتے تھے۔

یقین عشق کن و از سر گمان برخیز
باشتی بنشیں یا بہ امتحاں برخیز

چرا بہ سنگ و گیاہ بھی اسے زبانی طور
نہ راہ دیدہ بدل در موئے زجاں برخیز

سونے میں، جاگنے میں، غرض کہ ہر کام اور ہر چیز میں نچر کی ہدایت کے بغیر کچھ نہیں کرتا۔
 زاہد از جو بہشتی بجز این نشناسد کہ شود دست زد شوق بکارت ز رود
 دست زد شوق ہونا یعنی شوق کے زیر مشق ہونا۔ خلاصہ مطلب یہ کہ زاہد غیر رعیت کے تمام الفاظ
 انکے حقیقی معنی مراد لیتا ہے اور کسی بات کو تمثیل و استعارہ و کنایہ پر محمول نہیں کرتا۔
 بیاؤ جوش تنائے دید نم بنگر چو اشک سہر قرگاں چکید نم بنگر
 کتاب ہے کہ آ۔ اور دیدار کی تمنا جو میرے دل میں جوش مار رہی ہے اُسکو دیکھ۔ اور پلکوں کے رستے
 سے آنسو کی طرح میرا ٹپکنا ملاحظہ کر۔ جوش تنائے دیدار کی تصویر اس سے بہتر غالباً کسی نے
 نہ کھینچی ہوگی کہ ”میں آنسو کی طرح پلکوں کے رستے سے ٹپکا جاتا ہوں“

زمن بجز طہیدن کنارہ مے کردی بیا بخاک من و آرمید نم بنگر
 دسید دانہ و بالید و آشیاں گہ شد در انتظار ہما دام چید نم بنگر
 کتاب ہے کہ ہما کے انتظار میں میرا جال بچھانا تو دیکھو۔ جو دانہ جال کے نیچے ہما کے پھنسائے لے
 ڈالا تھا وہ آگا اور بڑھا، اور یہاں تک بڑھا کہ اسیں گھونسلے بنگتے، مگر ہما ہی دام میں نہ آیا۔
 اسے ذوقِ نوا سخی باز مہجروش اور غوغائے شیعخونے برنگہ ہوش اور
 گر خود بچند از سر از دیدہ فرو بارم دل خوں کن و آن خوں دینہ بچوش اور
 ہاں ہدم فرزانہ دانی رہد ویرانہ شمع کہ نخواہد شد از باد جنوش۔ اور۔
 ویرانہ یعنی غریب خانہ۔ جو شمع کہ ہوا سے نہ بجھے گی یعنی شراب۔

شرابہ این دادی تلخست اگر راوی از شہر بسوے من سرخیمہ نوش اور

یعنی اگر پیہرے عشق میں دوسرے کی شرکت گوارا نہیں مگر چونکہ کئی آدمیوں کے ملکر نالہ و فریاد کر رہے ہیں عجب لطف ہے اس لئے میں رشک سے قطع نظر کرتا ہوں اور کہتا ہوں کہ درخار بہت پیاسے عزیزاں غلیدہ باد۔

دریغ زدن منت بسیار بنادند : یزدند سر از دوش و سبکدوش نکرند

یعنی تلوار سے سرتار کو بھی معشوق نے سبکدوش نہ کیا پہلے سر کا بوجھ تھا اب اس احسان کا بوجھ ہے کہ اپنی تلوار سے یہ بے قدر سرتار رہے۔

روزیکہ بے زور دہنے شور نہفتند : اندیشہ بجا رخروہوش نکرند

یعنی شراب کا نشہ اور نئے کی آواز کا درد۔ دونوں عقل و ہوش کے دشمن ہیں۔ پس جب کارکنانِ قضا و قدر نے شراب میں زور اور نئے میں شور و دیت کیا تھا اُس وقت عقل و ہوش کے انجام کا کچھ خیال نہیں کیا۔

تاجر شوق بیاں رہ تجارت زرد : کرہ انجام و سرمایہ بغارت زرد

یعنی شوقِ الہی کا تاجر اُس رستے نہیں چلتا کہ جو رستہ چلتے چلتے ختم ہو جائے اور اُس رستے میں سرمایہ کو ٹٹانہ جائے۔

رمز شناس کہ ہر نکتہ ادائے وارو : محرم آنست کہ رہ جز باشارت زرد

کہتا ہے کہ ہر نکتہ یعنی کائنات کی اونٹے سے اونٹے چیزیں ایک ادوا۔ یعنی ایک معنی یا راز چھپا ہوا ہے۔ پس ہر چیز کی رمز کو سمجھنا چاہئے؛ کیونکہ محرم راز وہی شخص ہے جو بغیر اُدھر کے اشارے کے ایک قدم نہیں اٹھاتا۔ یعنی جو کچھ نیچر سکھاتی ہے اُسکے موافق عمل کرتا ہے۔ کھانے میں، پینے میں

کلیات

اسرار

تجربہ

تجربہ

مَشُوق کا آدھا لب شہد تھا کہ نین اُس میں بچپن کر رہ گیا، اور آدھا مصری تھا کہ قریب ستر اڑیا۔
دعوے اور ابودلیل بدیہی خندہ دندان نما بحسن گہرزد

کتنے بڑے خیال کو کن مختصر لفظوں میں اور پھر کس صفائی اور خوبی سے ادا کیا ہے۔ کہتا ہے کہ
مَشُوق موتی پر اس طرح ہنسا کہ اسکے دانت نظر آکر لگے پس اسکا خندہ گویا اس بات کا دعوے
ہے کہ موتی کی کچھ حقیقت میرے دانتوں کے سامنے نہیں، اور اس دعوے کی دلیل اسکا خندہ
دندان نما ہے؛ کیونکہ اسکے دانتوں کا سب پر ظاہر ہو جانا یہی اس بات کی دلیل ہے کہ موتی اسکے
دانتوں کے سامنے کچھ حقیقت نہیں رکھتے پس اسکے دعوے کی دلیل نہایت بدیہی اور ظاہر ہے۔

نہم جبین بدرشاں بگرداند نشنیش بر سر زہ عنان بگرداند

آہاں بگرداند یعنی چوٹ کے پتھر کو الٹ کر اور پر کا رخ نیچے اور نیچے کا رخ اوپر کر دیتا ہے۔

تو نالی از خلیہ خار و ننگری کہ سپہر سحر حسین علی بر سناں بگرداند
برو۔ بنادی و اندوہ دل منہ۔ کہ قضا ۱ چوتہ سرعہ بر منط امتحان بگرداند

یزید را بہ باط خلیفہ نشانہ ۲ کلیم را بہ لباس شباں بگرداند

تیغ ز فرق تا بہ کلیم رسیدہ باد شوخی ز حد گذشت ز با تم بریدہ باد

اول یہ آرزو کرتا ہے کہ تیری تلوار میرے سر پر پڑے اور علق تک اتر جائے۔ پھر یہ سمجھتا ہے کہ یہ مرتبہ ہر شخص کو
نصیب نہیں ہو سکتا۔ کہتا ہے کہ گستاخی حد سے گزر گئی میری زبان قلم ہو جو۔

گر رفتہ ام زد کوے تو آساں ز رفتہ ام ایں قحطہ از زبان غریزاں شنیدہ باد

ذوقیت ہمدی بقعاں۔ بگذرم نثرک خاور بہت پائے غریزاں خلیدہ باد

عاشقانہ

شکوہ
بی بی
امتحان
امتی

تھوٹ

عاشقانہ
تھوٹ

بہرِ خواری بسکہ سرگرم ملاشم کردہ اند
پارہ تزدیک در ہر دور باشم کردہ اند

دور باش - بڑبڑچی آواز کو کہتے ہیں - جو بادشاہوں کی سواری کے آگے آگے نقیب پکارتے چلتے ہیں۔
کتاب ہے کہ مجھ کو جو قضا و قدر نے سرگرم تلاش کیا ہے اُس سے مقصود میرا خوار و ذلیل کرنا ہے۔ پس
راہِ تلاش میں جو دھڑکا بچھیر پڑتی ہے اُس سے ظاہر ہے کہ میری ذلت و خواری زیادہ ہوتی ہے؛
اور اس طرح جو امر میرے سرگرم تلاش کرنے سے مقصود ہے وہ حاصل ہوتا ہے۔ پس گویا ہر دور باش
میں کسی قدر مقصود کے نزدیک ہوتا جاتا ہوں۔

چرخ ہر روزم غم فردا بخوردن میدہ
آقیامت فارغ از فکرِ معاشم کردہ اند

از چہ غالب خواجگاہی جہاں ننگِ نیست
گرنہ با سلمان و توذ خواجہ باشم کردہ اند
بخشم ناسرا میگوید از لطف گفتارش
گماں دادم کہ حرفِ دل نشینی بعد ازین گوید

لطف گفتار کی تعریف اس سے بہتر کسی پیرائے میں نہیں ہو سکتی۔ کتاب ہے کہ معشوق غصے میں برابر
مجھ کو برا بھلا کہتا ہے؛ مگر اُسکے لطفِ کلام سے میں ہمیشہ اسی امید میں رہتا ہوں کہ اب کوئی اچھی بات
کہتا ہے، اب کوئی مہربانی کا کلمہ سلی زبان سے نکلتا ہے۔

دل از پلو بردن آرم جمشٹ جام خود انگار
و گر نختے برافشانم سلیمان نش نگیں گوید

اپنے دل پر فخر کرتا ہے کہ اگر اُسکو پلو سے نکال کر دکھاؤں تو جمشید اُسکو اپنا جام جہاں ہیں سمجھے؛ اور اگر
اُسکا ایک لختہ نکال کر ڈال دوں تو سلیمان اُسکو خاتمِ سلیمانی کا نگیں بتائے۔

من بہ دوامِ دم و رقیب بدرزد
نیمہ لبش انگین و نیمہ تبرزد

بدرزد - یعنی نخل بھاگا۔ تبرزد - معری - کتاب ہے کہ میں تو نباہ کر تا کر تا مر گیا اور رقیب نخل بھاگا۔ گویا

مبادا وہ اپنی دروازہ گنیزداستان بیان کرے اور داستان کے ساتھ ہی اسکی جان بھی بھل جائے۔
گویند صنعاں تو بہ کردار کفر۔ نادانندہ کہ خود فروشیهای بخشش زبداں خوش نکرده
صنعاں کا قصہ مشہور ہے جو پہلے عابد تھا پھر فسق و فجور میں مبتلا ہو گیا یہاں تک کہ کفر تک نوبت
پہنچ گئی پھر متنبہ ہوا اور کفر سے توبہ کی۔ کہتا ہے کہ صنعاں کا کفر سے توبہ کرنا مشہور ہے۔ وہ عجیب
نادان بندہ ہے جسے دین کی خود فروشی کے سبب خدا کی بخشش کو پسند نہ کیا یعنی خدا کی خالص
بخشش تو وہ تھی کہ وہ توبہ نہ کرتا، اور کفر ہی پر مڑتا، اور پھر خدا اسکو بخش دیتا، اور اب جو وہ بخشا جا گیا
تو بخشش دین کی قیمت ہوگی پس گویا اسنے دین کی خود فروشی کے بھروسے پر خدا کی خالص بخشش
کو پسند نہ کیا۔ خوش کروں کے معنی میں پسند کرنا۔

اے خود یہ بازی سے بزد۔ دین دو جوئی نہ مرو
بموش میں خندہ زد۔ اور موش جاں خوش نکرده
باسن میا ویزاے پدر فرزند آذر را نگر
ہر کس کہ شد صاحب نظر دین بربگان خوش نکرده
میا ویز یعنی مجھے جھگڑا مت کر۔ فرزند آذر برابر اہم علیہ السلام۔ باقی شعر کے معنی ظاہر ہیں۔ یہ
زرا مضمون ہی نہیں ہے بلکہ مرزا کے حسب حال بھی ہے، کیونکہ جہاں تک معلوم ہے۔ مرزا
کے والد سنی المذہب اور خود مرزا اثنا عشری تھے۔

درستم حق ناشتا سش گفتن از انصاف است
اے چندین تکیہ بر علم خداوند شن بود
کہتا ہے کہ اُس ظالم کو حق ناشتا س کہنا انصاف نہیں ہے جیسا کہ خدا کے علم پر استغناء ہے
کہ اُسکے بھروسے پر ظلم کئے چلا جاتا ہے، اور اُسکے مواخذے سے نہیں ڈرتا۔
بخود گفتم نشان اہل معنی باز گوے
گفت گفتارے کہ با کردار پیوند شد بود

عالمی
نہایت

کوتی

اخلاق

برائے نے سب مجھ کو دیکھا کہ تنگی اور کلیت میں بھی خوش ہے تو مجھے ذلیل و خوار کر دیا کہ اتنے خوش نہ ہو گیا۔

درد دل ہی زینش میں کینہ دشت چرخ چوں دید کاں نما نہ نماں - اتکار کرد

یعنی میری دانش و بینش کے سبب مجھے آسمان پوشیدہ کینہ تو رکھتا ہی تھا، اب جو دیکھا کہ وہ کینہ لوگوں پر ظاہر ہو گیا ہے تو آسمان کھل کھلا اور علانیہ دشمنی کرنے لگا۔

نکرست سر و کشتی شکست موج دانا خورد و دریغ کہ ناداں چه کار کرد

یعنی جو کچھ ہوا وہ میری نادانی سے نہیں بلکہ قضا و قدر کے حکم سے ہوا۔

نوسیدی از تو کفر و تورانی نہ بکفر نوسیدیم و گریہ تو امیدوار کرد

اصل شعر کا یہ ہے کہ حقیقت میں ہوں تو ناامید گرچہ کہ تجھے ناامید ہونا کفر ہے اور تو کفر سے رہتی نہیں اس لئے مجبور اپنے تئیں امیدوار بنایا ہے۔

بشرع آئینہ حق سچو ز مجنوں کم تر بارے دلش با عمل است - آما زبان با ساراں دارد

یعنی شرع سے بھی تعلق رکھ اور خدا کو بھی ڈھونڈو، آخر تو مجنوں سے تو کم نہیں ہے کہ اس کا دل تو عمل میں اٹکا ہوا ہے، مگر زبان کو ساراں سے سروکار ہے۔ یعنی ساراں سے باتیں کر رہا ہے اور دل لیلی سے لگا ہوا ہے۔ شرع کو ساراں سے اور حق کو عمل سے تشبیہ دی ہے اور یہ نہایت بلیغ تشبیہ ہے اور شعر نوا اور افکار سے ہے۔

خدا وقت پرش نیست - گفتم - گدازغا کہم جان بر لب ہم داستان ہر زبان دارد

گفتم یعنی میں نے کہہ دیا ہے، یا میں کہے دیتا ہوں۔ کہ یہ پرش کا وقت نہیں ہے، تو غالب کے حال سے درگزر اور پرش کا خیال چھوڑ دے۔ کیونکہ اس کی جان لبوں پر ہے اور داستان زبان پر ہے۔

حد سے زیادہ بلیغ شعر ہے۔ اگرچہ مصنفوں عام ہے مگر خود شاعر کے حال پر خوب چسپاں ہوتا ہے اور اس نے یقیناً اپنی ہی نسبت کہا ہے۔ جب کوئی غیر ملک کا مسافر شہر میں وارد ہوتا ہے اور اسکی زبان کوئی نہیں سمجھتا تو ترجمان کی ضرورت ہوتی ہے۔ شاعر۔ کچھ تو اس لئے کہ کسی کو اپنا قدردان اور پایہ شناس نہیں پاتا، اور کچھ اس لئے کہ اپنے نازک اور باریک خیالات کا سمجھنے والا کسی کو نہیں دیکھتا۔ اپنے تئیں غریب شہر یعنی شہر میں بالکل اجنبی قرار دیتا ہے اور کہتا ہے کہ کسی ترجمان کو بلاؤ کہ اجنبی مسافر کچھ باتیں۔ جو کہنے ہی کے لائق ہیں۔ کہنی چاہتا ہے۔

پیشم ازاں پرس کہ پرسی و اہل کوے گویند خستہ زحمت خود زیں دیار بُرد
نازم فریب صلح کہ غالب ز کوے تو ناکام رفت و خاطر امیدوار بُرد
ہر کرار خست نمازے بنود از غمے جاے در حلقہ رندان قلعہ نوش مباد
جامہ یا رخت کا تازی ہونا اسکے آلودہ ہونے کو کہتے ہیں۔ باقی شعر کے معنی صاف ہیں۔
مفتیاں! بادہ غریت۔ مرزید بجاک جوشد از پردہ دگر خون سیاوش۔ مباد

دوسرے مصرع کی تقدیر عبارت یوں ہے در مباد اخون سیاوش۔ دیگر از پردہ بجوشد سیاوش کا قلعہ مشہور ہے کہ وہ بگیناہ اپنے سرے افراسیاب کے ہاتھ سے مارا گیا تھا، اور اسکے خون کے وبال میں تمام ملک کشت و خون میں مبتلا رہا۔ کہتا ہے کہ اسے مفتیو! شراب بھی بڑی عزیز چیز ہے، اسکو زمین پر ست گراؤ، ایسا نہ کہ خون سیاوش پھر جوش مارے۔

از رشک کرد آنچہ بزم روزگار کرد در خستگی نشاط مرادید۔ خوار کرد
یہ نغزل غالباً اُس زمانے میں لکھی گئی ہے جب فرار عدالت کے موافقہ میں پھنس گئے تھے۔ بینی

عاشق

دعا

دعا

نیل

ہاں

ہندوؤں باد سے گرا کر لکڑی سرزد
نہاں زپردہ آستیناں گہر پر دہانہ
نہ ترسے گشت شام سے قریب
ز بس راہ دہ ہوا خواہ بدو راہ

یعنی ہندو وزیر کو چوس گئے تھے پابنتے کہ اس سے کیستیاں اور باقی سرسبز و شاداب ہو تاکہ
حضرت شمس شہر پہنچے و اہلک غیر ہندوؤں کے تھیں تھے۔

یہ طعن مرزا نے اس کے توحش زانہ سے پڑا و بلکہ یہ طعن ان کی عبودیت کا اقصا تھا جس مکان
میں درخت تھے اُنکے دروازے پر ایک کمرہ تھا اور کمرے کے آگے ایک برآمدہ تھا جس کے نیچے
رستہ چلتا تھا یہ برآمدہ کمرہ کے دروازے پر چار کڑیوں پر بند ہوتا ایک روز چند برس ہوا تھا اور مرزا
برآمدہ سے میں تھے وہ بے پردہ دروازے کی درستی میں شرف تھے اس وقت عالم شرف میں
فرمانے سے رتی پابنتے ایسا بے رحمی کی یہ کہ پانی برآمدہ سے کہ پانی او میں میں چھوٹا بیٹا
جس پر چکر پانی پیوں کسی نے کہا حضرت برآمدہ سے کہ پانی آگیا تو شہر پہلے خوب جائیگا
مرزا بہتر نہ پھینکے ہوئے۔

چاندنٹ رہبر دی آواز کا غایا نیست
مرزا کعبہ اگر راہ ایسی دارد
لہذا غایا غایان کہتا ہے کہ جب تک کچھ عذرہ نو سفر میں کچھ مطلق نہیں پس اگر کعبہ کی راہ پڑا
ہے تو یہ پانا نہیں چہ ہے فی حقیقت جو لوگ نہایت کٹھن منزلیں ملے کر کے مقام مقصود تک
پہنچتے تھے۔ جو خوشی انکو منزل پر پہنچنے سے ہوتی ہوگی اسکا سوال ہم بھی ان لوگوں کو چاہئیں
ہوتا جو میل اور سبھ میں کل سفر کرتے ہیں۔
بیاوریدہ گرایں جا بود زباندانے
غریب شہر سخن ہاے گفتنی دارد

بلبل چمن سنگ رو پروانہ بہ محفل شوق بست کہ در وصل ہم آرام ندارد
یعنی شوق کو وصل میں بھی آرام نصیب نہیں، اسی لئے نہ بلبل کو چمن میں آرام ہے۔ اور نہ پروانے
کو شمع کی موجودگی میں قرار ہے۔

چہ خیزد از سخن کز درونِ جاں بنود بریدہ باد ز بانے کہ خوشچکاں بنود
کتاب ہے کہ جوابات دل سے نہیں نکلتی وہ کچھ اثر نہیں کرتی۔ پس کٹیوہ زبان جو خوشچکاں یعنی درد
دل سے بھری ہوئی نہو۔

حکیم ساقی و مے تند۔ دمن ز بدخونی ز رطلِ بادہ بختشم آیم اگر ایں بنود
حکیم سے مراد خدا ہے کتاب ہے کہ ساقی تو اندازے سے زیادہ نہیں دیتا اور شراب یعنی دولت دنیا
نہایت تند ہے مگر میں اپنی بدخونی اور زیادہ طلبی سے اگر شراب کا پیالہ ہلکا پاتا ہوں تو غصہ تو ہوں
ز خویش رفتہ ام و فرستے طمع دارم کہ باز گردم و جز دوست از مغاں بنود
قاعدہ ہے کہ جب آدمی کہیں سفر کو جاتا ہے تو وہاں سے کچھ سوغات و ہدیہ وار مغاں لیکر وطن میں
واپس آتا ہے کتاب ہے کہ میں اپنے آپ سے توجا چکا ہوں اب یہ چاہتا ہوں کہ واپس پھر کر اپنے
آپے میں آؤں تو دوست یعنی حق کے سوا کوئی سوغات لیکر نہ آؤں۔

ز نامِ ناقہ بدستِ ترققِ شوق بست بسوے قیس گز ایش ز ساریاں بنود
یعنی سیلی کا ناقہ جو قیس کی طرف چلا ہے یہ ساریاں کی طرف سے نہیں ہے بلکہ بروقت اسکی
باگ ترققِ شوق قیس کے ہاتھ میں ہے وہ جدھر چاہتا ہے لیجا تا ہے۔
بتانِ شہرِ ستم پیشہ شہر یارِ اند کہ در ستم روش آموز روزگار بند

خواجہ فردوس میراث تمنا دارد و ابے گرد و روش نسل بہ آدم بڑ

خواجہ کا لفظ فارسی میں اکثر ایسے مقام پر دیتے ہیں جیسے طنز کے موقع پر اردو میں تیسرے شخص کے لئے آپ یا حضرت بولتے ہیں۔ کتا ہے کہ آپ آدم کی میراث میں فردوس کے طلبگار ہیں۔ بڑا مزہ ہو اگر آپ کا سلسلہ نسب آدم تک نہ پہنچے۔ یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ مرزا کو یہ احتمال ڈارون کی تھیوری کے موافق سوچا ہوگا، شاید انکا یہ مطلب ہے کہ آپکے اخلاق و عادات انسانیت سے اس قدر بعید ہیں کہ ممکن ہے آدم کی نسل سے نہوں۔

جاں و غمت نشاندن مرگ از غما ندارد تن در بلا نکتدن بیم بلا ندارد

چوں لعل تست غنچہ آما سخن نداند چوں چشم تست تر گس آما حیا ندارد

فراغ کسیکہ دل را بادرد و اگر دارد کشت جہاں سر اسرار و گیا ندارد

باید ز بے ہر آئینہ پر ہیز گفتہ اند ارے دروغ مصلحت آمیز گفتہ اند

کو فتاہمہ آلایش بندار برد از صور جلوة و از آئینہ زنگار برد

عشوہ مرمت چنخ مخرکایں عیار یوسف از چاہ برآرد کہ بازار برد

عشوہ خریدن دھوکا کھانا اور فریب میں آجانا یعنی آسان کی مہربانی کے دھوکے میں نہانا کہ یہ عیار یوسف کو چاہ سے اس لئے نکالتا ہے کہ بازار میں لیجا کر بکوائے۔

بہر شہسے رامشامے درخوشت بوسے پیراہن بہ کنعاں می رود

جو ہر طبعم درختانست لیک روزم اندر ایرہنہاں می رود

نوسیدی ماگردش ایام ندارد روزے کہ سید شد سحر و شام ندارد

غرضی

تصنیف
حافظ

بہارِ حبیبی
غرضی

تصنیف
سیر

تصنیف

بازنالی

بازنالی

کہ جب معشوق مہربان ہو کر عاشق کی پرسش حال کرتا ہے تو اس وقت عاشق مجبور کا دل بھڑکتا ہے؛ اور وہ شکایت کرنی شروع کرتا ہے۔ پس کہتا ہے کہ تو میری پرسش حال کے وقت شکایت سے مجھ کو منع نہ کر؛ کیونکہ تو جو پرسش حال کرتا ہے تو گویا میرے زخم میں ٹانکے لگاتا ہے؛ اور ٹانکے لگاتے وقت کسی قدر خون کا ٹپکنا ضروری ہے۔ پس یہ شکایت وہ خون ہے جو زخم کے سیتے وقت ٹپکا کرتا ہے۔

اگر بدل نہ خلد ہرچہ از نظر گذرد زہے بردانی عسک کہ در سفر گذرد
یعنی عمر کا سفر میں گذرنا نہایت عمدہ ہے بشرطیکہ سفر میں جو کچھ نظر سے گذرے اسپر انسان فریفتہ نہ ہو جائے یا کرے۔

بوصل لطف با نذاذہ تجمل کن کہ مرگ تشنہ بود آب چوں ز سر گذرد
کہتا ہے کہ وصل کی حالت میں مہربانی اس قدر زیادہ نہ کر کہ میں اسکی خوشی کا تحمل نہ کر سکوں اور خوشی کے ارے مر جاؤں؛ کیونکہ پیاسے کے لئے وہ پانی موت ہے جو سر سے گذر جائے۔

ہر کجا دشنہ رشوق تو جراح تبارد جز خراشے یہ جگر گوشہ ادہم نرسد
طوبی فیض تو ہر جا گل و بار افشانہ جز نیسے یہ پرستش کہ مریم نرسد

جگر گوشہ ادہم یعنی ابراہیم بن ادہم کو ان زخموں میں سے جو تیرے شوق کی چھری برساتی ہے ایک خراش سے زیادہ نہیں پہنچی۔ اور جو پھول اور پھل تیرے فیض کے طوبی سے چھڑتے ہیں انہیں سے صرف ایک ہوا کا جھوکا محراب مریم تک پہنچا ہے۔

مے تر ہا دکن عرض کہ این مہربان پیش این قوم بہ شورا بہ زفرم نرسد

بستند رہ جرتہ آہے بسکندر در یوزہ گر میکدہ صہبا بکد و بُرد

یعنی سکندر کو ایک بے حقیقت پانی کے گھونٹ سے محروم رکھا اور میکدہ کا فقیر شراب
 بیسی نایاب چیز کا تو بنا بھر کر لے گیا مطلب یہ کہ پادشاہوں کو وہ دولت نصیب نہیں جو میکدہ
 یعنی خاندانہ کے اونٹے اگداؤں کو نصیب ہے۔

یک گریہ پس از ضبطِ دوسد گریہ مضادہ آتلخی آں زیر توانم بہ گلو بُرد

یعنی جب دوست و دفعہ رونے کو ضبط کروں تو ایک دفعہ تو رونے کی اجازت دے تاکہ اُس
 ضبط کے زہر کی کڑواہٹ ایک دفعہ رو کر حلق سے دور کروں۔

ز جوش شکوہ بیدار دوست می ترسم مباد مہر سکوت از بدہن فروریزد

ایک مقبول بات کو محسوسات کے لباس میں ظاہر کرتا ہے مطلب تو یہ ہے کہ اُسکے شکوے سے
 اِس قدر بھرا ہوا ہوں کہ شاید اُسکو ضبط نہ کر سکوں مگر اُسکو اِس طرح بیان کرتا ہے کہ اُسکی بیدار کا
 شکوہ دل سے اِس جوش کے ساتھ اُبلتا ہے کہ منہ پر جو مہر سکوت لگی ہوئی ہے کہیں اُسکے
 ریلے میں پہن جائے۔

بَریہ ام رہ دورے کہ گرفتارم بجائے گردواں از بدن فروریزد

یعنی میں نے اِسی راہ دراز طے کی ہے کہ اگر بدن کو جھاڑوں تو گرد کی جگہ جان بدن سے
 چٹ جائے۔ یہ تمثیل ہے اُس محنت و مشقت کی جو فکرِ شعر اور تکمیلِ فنِ سخن میں قائل نے کی ہے۔

مکن پیر شرم از شکوہ منع کایں نہایت کہ خود ز زخم دم دوختن فروریزد

عجیب غریب تشبیہ اور نہایت عمدہ خیال ہے اور نہرا خیال ہی نہیں بلکہ فیکٹ ہے۔ قاعدہ ہے

کفر و دین پست جز آلاشِ پندارِ جود پاک شو پاک کہ ہم کفر تو دین تو نشود

رفتہ بودی و گراز جا بہ سخن سازی غیر مشت از بخت کہ خاموشی مایا د آمد

یعنی تو نے رقیب کی سخن سازی سے بچہ دھوکا کھایا تھا؛ مگر شکر ہے کہ اسکی سخن سازی دیکھکر ہماری خاموشی تجھکو یاد آگئی۔ جس سے تجھکو یہ خیال ہوا ہوگا کہ سچے عاشقِ مینہ سے کچھ نہیں کہا کرتے۔

دوش کز گردشِ ختمِ گلہ بر روی تو بود چشم سوئے فلکست وی سخن سی تو بود

یعنی نصیب کی گردش کا شکوہ کرتے وقت آنکھ آسمان کی طرف تھی اور باتیں تجھسے کر رہا تھا ایک خاص حالت کی تصویر بہت عمدہ لفظوں میں کھینچی ہے۔

دوست دارم گر ہے را کہ بکارم زردہ اند کایں ہمانست کہ پیوستہ در بر روی تو بود

گر چنین ناز تو آمادہٗ عینما ماند بہ سکن در زردہ ہر چہ زوار اماند

مستحقِ حقیقی کی طرف خطاب ہے۔ سکندر سے مراد پادشاہِ فلج تھا؛ اور دارا سے پادشاہِ منقوج۔

ہم بسوداے تو خورشید پرستم آری دل ز مجنوں برد آہو کہ ہر لیسلا ماند

یعنی اگر میں آفتاب کی پرستش کروں تو وہ بھی درحقیقت تیری ہی پرستش ہے؛ جیسے مجنوں نہیں پراس لئے فریفتہ تھا کہ انکی آنکھیں لیلے سے مشابہ تھیں۔

شکوہٗ دوست ز دشمن نتوانم پوشید گر عینم ہر چنین حوصلہ فرسا ماند

یعنی اگر جدائی کا غم اسی طرح بے صبر کرنے والا رہا تو دوست کا شکوہ ضبط نہ کیا جاسکیگا یا نہ کہ اسکو دشمنوں سے بھی نہ چھپا سکو گا۔

دشیل دشمنہاں ساختہ غالب امروز مگذرید کہ ماتم زودہ تنہا ماند

ویرانی

اں کشتی بنگستہ ز موجم کہ تباہی افکندہ در آتش گرازا بم برد آورد
 جب کشتی موج کے تپسیروں سے ٹوٹ جاتی ہے تو اُسکے تختوں کو پانی سے کھال کراگ میں
 دیند من کی بگاہ جلاستے ہیں۔ اپنے تئیں کتاب ہے کہ میری مثال بھی اُسی کشتی کی سی ہے کہ دو بے
 سے بچا تو اک میں جھونکا گیا۔

قصید

ویرانی

ویرانی

گزیلوز رخ تو بہ ساعت بندیدہ ایم چندیں بذوق بادہ دل از جا چہ میزد
 بخت آسیا بگردش مادریاں او غالب دگر سپرس کہ برا چہ سپرد
 مجو آسودگی گمرو را ہی کا ندیں اوی چو خار از پا برآمد۔ پار و اماں بخی آید
 یعنی کسی حالت میں آدمی دنیا کے تھنوں سے نجات نہیں پاسکتا اگر کاٹا پاؤں سے نکل گیا تو
 پاؤں وہاں میں اُچھے گا۔

ویرانی

ویرانی

ویرانی

برازہ نرم بخت امی جذبہ توفیق غالب کہ ترک سادہ با باقیماں برنے آید
 ترک سادہ مابینی غالب جو کمالیک بھولا بھال ترک ہے۔ یہ ایسی ترکیب ہے جیسے موسائے من اور
 فراز من۔ یعنی خود میں۔ باقیماں برنی آید یعنی مولویوں کی دلیلوں اور محبتوں سے عمدہ برائیں
 ہو سکتا۔ باکسے برنیادن کے معنی ہیں اُس سے سربراہ و عمدہ برائے ہونا۔

قصید

چشم ددل با ختم ام۔ داد ہنر خواہد آنکہ چوں من ہمہ دان ہمہ بین تو نشود
 یعنی چونکہ میرے دل نے تجھ کو جانا ہے جیسا کہ تو ہے اور میری آنکھ نے تجھ کو دیکھا ہے جیسا کہ تو
 ہے اس لئے دل اور آنکھ دو تو کو کھو بیٹھا ہوں۔ پس میرے اس کام کی داد وہی دیگا جو میری
 طرح تیرا ہمہ داں اور ہمہ بین ہوگا۔

بہرے آدمی کے کان تک پہنچ کر گم ہو جاتی ہے کس قدر بلیغ تشبیہ ہے۔

دردِ دام بہرِ دانہ نیفتہ مگر قفس چنداں کنی بلند کہ تا آشیان رسد
اپنے اعزازِ نفس کا اظہار ہے۔ یعنی اگر عزت کے ساتھ قید کر دو مجھے قید ہونے سے کچھ انگار نہیں
ہے۔ پس یہ امید نہ رکھو کہ میں دانے کے لالچ سے جال میں آ پھونکا جائیگا؛ نہیں۔ بلکہ قفس کو اتنا اونچا
کر دو کہ میرے گھونسلے تک پہنچ جائے؛ میں قفس میں فوراً چلا آؤں گا۔

تیر تخت را غلط اندازہ گفتہ ام اسے دے کہ نہ تیر درگاہِ نشان رسد
غلط انداز اس تیر کو کہتے ہیں جو خطا کر کے غیر مقصود جگہ جا لگے چونکہ عشاق معشوق کے تیر کے شتاق
ہوتے ہیں اس لئے کہتا ہے کہ ایک تیر تو اسکا آکر لگا ہے مگر میں اسکو اپنی نحوست طالع کے خیال سے
غلط انداز سمجھتا ہوں۔ اب اگر دوسرا تیر بھی اسی جگہ آکر لگا تو میں سمجھوں گا کہ پہلا بھی ارادے سے لگایا گیا
تھا ورنہ تیرا خیال جو پہلے تیر کی نسبت تھا صحیح ہو جائیگا اور امید بالکل باقی نہ رہے گی۔

امید غلبہ نیست بکیشِ مغاں درآئے مے گر بہ جزیرہ دست نداد و امغاں رسد
یعنی اگر پارسوں پر غلبہ اور حکومت حاصل ہونے کی امید نہیں ہے تو اسکا نہ سب اختیار کر لے؛ کیونکہ اس
صورت میں اگر شرابِ جزیرہ میں نہ آؤ گی تو ہریہ اور سوغات میں ضرور آؤ گی۔ اس شعر میں گویا یہ
ظاہر کرنا مقصود ہے کہ آتش پرستوں پر غلبہ و استیلا حاصل کرنے کی علت غائی یہی ہے کہ جزیرے
میں شراب آیا کرے۔ پس جب غلبہ کی امید نہ تو لاچار کیشِ مغاں اختیار کرنا چاہئے تاکہ اگر جزیرے
میں نہیں تو ہریہ و امغاں ہی میں شراب وصول ہو کرے۔

جاں بر سرِ مکتوب تو از شوق نشانزدن از عمدہ تحریر جو اہم بدر آورد

نیکو

ہر چہ از دنگہ پاسبان نیو بزم
تا بنا لہم از ان مبلہ زیانم دادند
غیر کے چند شعروں پر اس بات کو بیان ہے کہ قصا و قد رستہ جو کچھ عرب کی فتوحات کے
دست پر سہا پیدائے اسے دوش میں منہلو کر کے بھی نہیں الاصل ہوں کچھ نہ پتہ دیا۔ جب آنگہ
بہل زور ہو گیا تو یہ لاشیٰ کی بلوغت میں زبان دی اور جب تھکا کر گیا تو مجھے ماترس کی جگہ
ہو قاتل دی۔ شہنشاہ پرستہ ہندوؤں کے موتی آواز دے اور اسکے عزم میں مجھے سار
تہذیب و تمدن کی مثال یہ ہے۔ ساری عورتوں کے سر سے ٹان رٹ یا اور مجھ کو شاعری میں اقبال
کی کافی و دست فرما۔ چہ ہر اس کے موتی کی تیج میں سے تو توڑے اور علم و دانش میں بڑے یعنی
جو کچھ اصل ان ملامت و تہادو مجھے پنپ کے دیدیا۔ اور دانش پرستوں سے جو شراب جزیے میں ل
و وادہ ہر ضلالت میں شب ہر کہ مجھے پانی۔ خلاصہ یہ کہ پارس کی جو کچھ پوچھی گئی تھی آپس سے
زبان مجھ کو فرمایا کرنے کے لئے دیدی۔

حاشیہ
و تصوف

خوبیوں ذات لایع کس زبان
دل بڑا تا دگر چہ از ان لسان
یعنی ہاں یا بے قوم و برائے عرف میں کچھ اس سے وصول ہو گا۔ کیونکہ اچھے لوگ ایسا کام نہیں
کرتے کہ کسی کو نقصان پہنچے۔

تصوف
تصوف

تصویر دما زور و ہر بزم حبیبیت
ہر جا کنیم سجدہ۔ ہاں آستان
گم شد نشان من چو رسیدم بہ پنج دیو
مانداں صدا کہ گوش گراں
شعرا کے تصوف میں ویر و خرابات و میکہ سے اکثر اتفاقاً یا وہ مقام جہاں فقر و فنا کی تعلیم ہوتی ہے
مراد لیتے ہیں۔ اپنا نشان دیرین پہنچا کہ ہر جانے سے مراد فنا ہے۔ اسکی تشبیہ اس صدا سے جو

پانے کا باعث ہے مجھے اُس میں مزا آنے لگا ہے اور اسے درد تیری بن آتی ہے کیونکہ مجھے
دوا سے تنگ آنے لگا ہے۔

مچھو راز سے کہ بستی ز دل آید بیروں در بہاراں ہمہ بویت ز صبا سے آید

اس شعر میں معشوق حقیقی کی طرف خطاب ہے اور اس حدیث کے مضمون کی طرف اشارہ
ہے کہ اِنَّ بَدَنِيْ اَيَّامٌ ذَهَبَتْ لَهَا نَفَاثَاتٌ اِلَّا فَتَرَحُّوْا لَهَا۔

خوش است آنکہ باخویش جز غم ندارد دے خوشتر است آنکہ ایں ہم ندارد

سزایے کہ خشد بویرانہ خوشتر ز چشمیکہ پیرایہ کم دارد

یعنی وہ سزایے جو صحرایں چلے اُس آنکہ سے بہتر ہے جو تر نہیں ہے۔

سخن نیست در لطف ایں قطوع غلاب بہشتے بود ہست رکاوتم ندارد

قطوع سے مراد قطعہ زمین ہے۔

شمع گشتند وز خورشید نثارم داوند

دل رہو دند و دو چشم نگراںم داوند

رحمت تجانہ ز ناقوس فغانم داوند

بعوض خامہ گنجینہ فغانم داوند

بہ سخن ناصیہ فتر کیا نم داوند

ہر چہ یزدند یہ پیدا یہ نہا نم داوند

بشب جمعہ ماہ رمضانم داوند

مژدہ صبح دریں تیرہ شبانم داوند

سرخ کشودند لب ہر زہ سرم لبند

سوخت آتشکدہ ز آتش نفسم بخشیدند

گہرا ز رایت شاہان عجم بر چیدند

افسر از تارک ترکان پشلی بردند

گوہر از تاج گستند و بدانش لبند

ہر چہ در جزیرہ ز گہراں نمی آو دند

فہم

راز دانی

معشوق

تصوف

تصوف

فہم

فہم

فہم

فہم

تہمت بندہ سوائے اللہ

اسے کہہ دینے تو تہمت ویدہ نہیں تو تہمت
تہمت وہی خود بخود ساقی و ناسی

یعنی ہمارا ساقی شریعت مست نہیں کرتا بلکہ اپنی طاعت و بندگی سے مست کرتا ہے چونکہ وہ غیر
پینے سے زیادہ دیر قیام اس لئے پیدا ہوا ہے ابھول جاتے ہیں اس کے احسان کے نشے
پر شرب کو نشہ غالب نہیں مئے پانا

اہل اسباب طلب لہر کو وہ بندہ غلام
یہ معنوں مرزا کے حسب حال ہے درعموہ مسلمانوں کی حالت پر صادق آتا ہے اول
عیش و عشرت اور بچہ فزون تیل الموسی کی فکر و راعت اور باغ کی مثال کس قدر مثل لہ کے
لہ باقی واقع ہوتی ہے

یہ اگر ہم است میں بنکر رہیں شکر و شکر ہستی
یعنی جو کچھ دنیا میں تھے اور فساد اور جنگ و جدال اور شر و غوغا ہے وہ انسان ہی کے
دست ہے الٰہ حضرت انسان نہرتے تو تمام عالم میں نشانما ہوتا

تھا از ذوق معنی شیر و شیر خوار در جانا
نئے از لاسے پالایش چکید و آب حیاں شد

اسے پالانہ مافی کو کہتے ہیں - باقی شعر کے معنی ظاہر ہیں -
جلوہ اسے داغ کہ در دم ز ننگ سے خیزد
یعنی اسے داغ اب تیرے ظاہر ہونے کا وقت آگیا کیونکہ ننگ جو تیرے طول پکڑنے اور ترقی

اس تمام غزل میں معشوق حقیقی کی طرف خطاب ہے۔

بجام و آنتہ حرفِ جم و سکندرِ حسیت کہ ہرچہ رفت بہرِ عہد در زمانہ نیست

یعنی یہ کیوں کہا جاتا ہے کہ جام جہاں نما جمشید کے عہد میں تھا اور آئینہ سکندر کے عہد میں کیونکہ جو کچھ جس زمانے میں گزرا وہ تیرے ہی زمانے میں تھا۔

ہم از احاطہ رست اینکہ در جہاں مارا قدم بہ تگدہ و سریرِ آستانہ رست

یعنی تو جو تمام عالم پر محیط ہے اسی کا نتیجہ ہے کہ ہم ہیں تو تگدہ میں۔ مگر ہمارا سر تیرے آستانے پر ہے۔ سپہر تو بتاراج ماگماشتہ نہ ہرچہ دزد زما بُرد در خزانہ رست؟

یعنی کیا یہ بات نہیں کہ جو کچھ ٹیڑھا ہے ٹوٹ کر لے گیا ہے وہ تیرے خزانے میں موجود ہے؟ مرا چہ جرم گر اندیشہ آسماں پست نیتیر گامی تو سن زما زیاہ رست؟

اس شعر میں غمنما اپنے خیال کی بلند پروازی کا اظہار ہے، اور اصل مقصد یہ ہے کہ جو کچھ ہے وہ تیری ہی طرف سے ہے۔ یعنی اگر میرا خیال اپنی حد سے تجاوز کر کے عالم بالا کے اسرار و خواص میں دغل دیتا ہے تو میرا کیا قصور ہے؟ تیرے تازیانے نے گھوڑے کو تیز رفتار کر دیا، شایانہ ہذا! چہ ناقدِ روانی ہستی است

بلا بجانِ جوانانِ پارِ ساریزد

آخر منزلِ خستِ خمی تو راہ میزند

اول منزلِ دگر بوی تو را و میدا

یعنی سالک جب تیری راہ میں قدم رکھتا ہے اور پہلی منزلِ قریب ختم ہونے کے ہوتی ہے تو سخت سخت مشکلات اور امتحانات کا سامنا ہوتا ہے۔ جب یہ مرحلہ طے ہو جاتا ہے اور دوسری منزل شروع ہوتی ہے تو لذتِ قرب حاصل ہونے لگتی ہے جو مثلِ زادِ راہ کے آگے بڑھتی

یہ ایک شاعرانہ شومخی معلوم ہوتی ہے؛ بلکہ درحقیقت یہ ایک نیکٹ ہے جو ہوا تو ہوس کے کوچہ
میں ہمیشہ گزرتا رہتا ہے۔ ہوا تو س لوگ سب ذلتیں گوارا کرتے ہیں؛ عبدائی کے صدمہ، رشک
کی طعن، ذلت و بے ابروئی، معاشیق کی بے اتفاقی و بیہ اعتنائی وغیرہ سب کچھ سہتے ہیں
نکمر ہوا تو ہوس کے باز نہیں آتے؛ اور پارسائی و عفت کا طریقہ جو باعث خوشنودی خدا ہے
اسکو اختیار نہیں کر سکتے۔

رغصاں چو شہد و شیر نیا لب الکرذ بے چارہ باز داد و فتنے مشکبو گرفت
رموز دیں قشاسم درست - و معذوم نناد من عجمی و طریق من بی ست
یعنی میں پیدا تو عجم میں ہوا ہوں اور میرا مذہب عربی ہے پس اگر اصول مذہب کے واقف
ہوں تو مجھ کو معذور سمجھنا چاہئے۔

نشاط جم طلب از آسان شوکت جم قدح مباحث یا قوت بادہ گر عنبی
دوسرا مصرع مثال ہے پہلے مصرع کے مضمون کی۔ یعنی انگری شراب چاہئے جس سے جمشید کا
عیش حاصل ہو یا قوت کا پیا لہ جس سے جمشید کی سی شامانہ شوکت ظاہر ہو اگر نہ میسر ہو
تو نہ سی۔

ہر آنچہ و زنگری خبر عین مائل نیست عیا یکسی من شرافت نسبست
یعنی جسکو دیکھئے اپنی جنس کی طرف مائل ہے۔ چونکہ شرافت نسب میں کوئی میری مثل نہیں ہے
اسلئے میری طرف کوئی مائل نہیں ہے؛ اور یہی میری یکسی کی وجہ ہے۔
نشاط معنویاں از شرافت نماز تست فسون یا بلیاں فصلے از فساد تست

جو مناسب جج کے ختم ہونے تک حاجی پہنے رہتے ہیں۔

نہ بد جہتہ شرار و نہ بجا ماندہ رادہ سوختم۔ ایک نہ انم بچہ عنوانم خست

رادہ راکہ۔ پہلا سوختم لازمی۔ دوسرا سوختم متعدی۔ کتاب ہے میں جل تو ضرور گیا مگر معلوم نہیں اسنے کس طرح مجھے جلا دیا، نہ کوئی پتنگ اڑا اور نہ راکھ باقی رہی۔

بادوست ہر کردارہ بخلوت خورد مدام دانکہ عور و کوثر و دارالسلام چست

دوست کو حور سے۔ بادہ کو کوثر سے۔ اور خلوت کو دارالسلام یعنی جنت سے تشبیہ دی ہے۔

دلخستہ رغیم و بودئے دوائے ما باختگاں حدیث حلال و حرام چست

ازکاستہ کرام نصیب است خاک را تا از فلک نصیبہ کاس کرام چست

نیکی زتست از تو نخواہیم مزد کار در خود بدیم کار تو ایم انتقام چست

یعنی اگر ہمتے نیکی کی ہے تو وہ تیری ہی طرف سے ہے اسکی اجرت ہم نہیں چاہتے اور اگر ہم بد ہیں تو

تیرا فعل یعنی تیرے بنائے ہوئے ہیں پھر سزا کس لئے ہے۔

غالب اگر نہ خرقہ و مصحف بہم فروخت پرسد چرا کہ نرخئے لعل فام چست

یعنی غالب کے گھر میں صرف ایک پرانا خرقہ اور ایک مصحف تھا اور کچھ نہ تھا پس اسنے انکو اگر بیچ نہ دیا

تو شراب کا بھاؤ کیوں پوچھتا پھر تاہے بہم فروخت کے لفظ میں یہ شوخی رکھی ہے کہ اگر دونو کو ایک

ساتھ نہ فروخت کیا ہوگا تو شراب کی قیمت نہ ادا ہو سکیگی۔

لطف خداے۔ ذوق نشاطش نیدہ کافر دے کہ با ستم دوست خو گرفت

یعنی وہ کافر ذل جو مشوق کے ظلم سننے کا عادی ہوا اسکو خدا کی مہربانی میں بھی فرا نہیں آتا۔ بظاہر

عاشقانہ

عاشقانہ

عاشقانہ

عاشقانہ

عاشقانہ

اور توبہ کا عذاب نہ ہو اور پھر اگر توبہ نہ ہو تو توبہ کا عذاب ہے۔

اور توبہ کا عذاب نہ ہو اور پھر اگر توبہ نہ ہو تو توبہ کا عذاب ہے۔

توبہ کا عذاب نہ ہو اور پھر اگر توبہ نہ ہو تو توبہ کا عذاب ہے۔

اور توبہ کا عذاب نہ ہو اور پھر اگر توبہ نہ ہو تو توبہ کا عذاب ہے۔

اور توبہ کا عذاب نہ ہو اور پھر اگر توبہ نہ ہو تو توبہ کا عذاب ہے۔

اور توبہ کا عذاب نہ ہو اور پھر اگر توبہ نہ ہو تو توبہ کا عذاب ہے۔

اور توبہ کا عذاب نہ ہو اور پھر اگر توبہ نہ ہو تو توبہ کا عذاب ہے۔

اور توبہ کا عذاب نہ ہو اور پھر اگر توبہ نہ ہو تو توبہ کا عذاب ہے۔

اور توبہ کا عذاب نہ ہو اور پھر اگر توبہ نہ ہو تو توبہ کا عذاب ہے۔

اور توبہ کا عذاب نہ ہو اور پھر اگر توبہ نہ ہو تو توبہ کا عذاب ہے۔

اور توبہ کا عذاب نہ ہو اور پھر اگر توبہ نہ ہو تو توبہ کا عذاب ہے۔

اور جو موافق ہیں اُن کی جدائی تلخ ہے۔

برو آدم از امانت ہرچہ گردوں بزنافت
یعنی بار امانت میں سے جو کچھ آسمان سے نہ اُٹھ سکا وہ انسان نے اُٹھایا گویا جب شراب جام میں
نسما سکی تو خاک پر گر پڑی۔ خاک کا لفظ انسان کے لئے اور جام آسمان کے لئے کس قدر مناسب
واقع ہوا ہے۔ اور بار امانت جو انسان پر ڈالا گیا اُسکی تشبیہ اُس شراب سے جو پیالہ چھلکنے سے بین
پر گر پڑے کیسی لطیف و پاکیزہ تشبیہ ہے!!

الان

عاشقانہ
محبوب
مشتوقانہ

بہیں نیاز کہ با تبت۔ ناز می بدم
ہوا مخالفت و شب تار و بحر طوقاں خیر
عنبت بہ شہر شیخوں زناں بہ بنگہ خلق
گدا بسایہ دیوار پادشاخت بہت
گستہ لنگر گشتی و ناخداخت بہت
عسّس نمانہ و شہ در حرم مراخت بہت

یعنی کو تو ال اپنے گھریں اور پادشاہ حرم سرکریں آرام کرتے ہیں۔ انھیں کیا خبر ہے کہ تیرا غم یعنی عشق
شہر میں خلقت کے گھروں پر شیخوں مار رہا ہے۔

عاشق

دلہ یہ سچہ و سچا دے وردا لرزد
کہ دزد و مرعلہ بیدار و پار ساخت بہت

کتاب ہے کہ پار سا یعنی زاہد تو اس گھمنڈ میں کہیں عبادت میں مصروف ہوں غافل ہے اور دزد و مرعلہ
جو منہ لگا ہوں لگا ہوا ہے۔ یعنی نفسِ تارہ جاگ رہا ہے، یعنی تاک میں بیٹھا ہے۔ پس مجھے سچہ و سچا دے
ورد اسے زاہد کی خیر نہیں معلوم ہوتی؛ اسلئے میرا دل کانپ رہا ہے۔

عاشق

بہیں نہ دُور و محو قرب نہ کہ منظر را
دریچہ باز و بدر وازہ از دہاخت بہت

قرب در گاہِ آئی میں جو مشکلات و خطرات ہیں اُنکو بیان کرتا ہے۔ کتاب ہے کہ دُور ہی سے دیکھ لے

اختری خوشتر از نیم بچہاں می باشد
 تا تنک مایہ بدریوزہ خود آرا نشود
 گفتم بر دوزگار سخنور چون بسی است
 شکس غزالما کہ نہ بینی ہیچ دشت
 در صفحہ نبودم ہمہ آں چہ در دل است
 دراز دستی من چاکے از گندہ عیب
 نہ گفتہ کہ بہ تلخی باز و پند پذیر
 یہ خطاب نامح کی طرف ہے۔

اگر نہ بہر من - از بہر خود غمیزم دار
 در گرم روی سایہ و سر چشمہ بخونیم
 یعنی ہلو آگے جانے کی جلدی ہے ہم سایہ و سر چشمہ یعنی طوبی اور کوثر پر آرام نہیں لے سکتے
 آں راز کہ در سینہ نہانت نہ وعظ است
 کارے عجب افتاد بدیں شیفہ مارا
 گفتم ز کہ پرسم اثر عمر گذشتہ
 در قالب ملامت اثرش پردہ کشادہ
 اگر منافق - وصل نام خوش - در موافق - ہجر تلخ
 یعنی دوستوں کا منہ دیکھتا اور ان سے تعارف پیدا کرنا نہیں چاہئے تھا؛ کیونکہ جو منافق ہیں انکا ملنا ناگوار آتا

کہ بندہ - خوبی او خوبی خداوند است
 با ما سخن از طوبی و کوثر تو اں گفت
 بردار تو اں گفت بمنبر تو اں گفت
 مومن نہ بود غالب و کافر تو اں گفت
 ساقی بقیع بادہ دہ سالہ فردخت
 خاکے کہ قضا در تن گنج سالہ فردخت
 دیدہ داعم کرد روے دوستان یدین شد

دیدہ داعم کرد روے دوستان یدین شد

فہرست

بحث وجدل بجای ماں - میکہ جو مکی نذران

کس نفس از جبل نرود کس سخن از مذکر نخواست

بجائے ماں بمعنی بجائے دارمینی بحث وجدال کو یونہیں رہنے دے اور مینجانے میں جا کہ وہاں نہ جل

کا جھگڑا ہے نہ مذکر کا قتل ہے جل سے مراد جنگ جلی ہے جس میں حضرت عائشہ جل معنی اونٹ پر

سوار ہو کر حضرت امیر سے لڑنے گئی تھیں۔ مذکر ایک کھجوروں کا باغ تھا جس پر حضرت سیدہ النساء

فاطمہ زہراؑ حضرت ابوبکر صدیق کی خلافت میں وراثت کا دعویٰ کیا تھا یہ دونو جھگڑے منجملہ ان

بیشمار نزاعوں کے ہیں جس پر سنی شیعوں میں ہمیشہ سر پھٹول رہتی ہے۔

دل جلوہ میدہد ہنر خود در انجمن

رہے مگر بجان حسودش نماندہ است

یعنی جب تک میں اپنے تئیں چھپاتا تھا حسودوں کو کچھ آزار نہیں پہنچتا تھا اب علی الاعلان اپنے

ہنر ظاہر کرنے لگا ہوں گویا اب ماسد کی جان پر رحم باقی نہیں رہا۔

غالبے باں بریدہ واگندہ گوشت نیست

آما دماغ گفت و شنودش نماندہ است

بلیل دولت بنالہ خونیں بہ نیست

آسود و زری کہ یار تو مشکل پسند نیست

یعنی اسے بلیل تو اپنے نالہ خونیں کے سبب ضیق میں نہیں ہے؛ جب چاہتی ہے نالہ کرتی ہے۔ پس تو

آرام سے زندگی بسر کر کہ تیرا یار یعنی گل مشکل پسند نہیں ہے۔ بخلاف ہمارے کہ ہکوروں نے اور فریاد کرنے

کی بندی ہے؛ حالانکہ نالہ خونیں سے دل بھرا ہوا ہے۔

فرخ

یہ ہر ماں
عائشہ

فہرست

بے خود ز بریر سایہ طوبے غود و اند

شبگیر رہروان تما بلت نیست

یعنی جو لوگ امانی و آمال کے پھندے میں گرفتار ہیں انکا سفر کچھ لمبا چوڑا نہیں ہے انکا انتہائے مقصود

طوبے کے سایہ میں آرام کرنا ہے۔

بے تکلف در بلا بودن بہارِ نیمِ بلاست
 قعرِ دریا سلسبیل و رویِ دریا آتش است

دوسرے مصرعے میں عرفی کے مضمون کو اٹا ہے۔ اُسے۔ اس لحاظ سے کہ دریا کے اوپر کی سطح سے راحت حاصل ہوتی ہے اور دریا کی تہ میں پہنچنے سے وہی نتیجہ پیدا ہوتا ہے جو آگ میں جل جانے سے ہوتا ہے۔ یوں کہا تھا ”رویِ دریا سلسبیل و قعرِ دریا آتش است“ مرزا کہتے ہیں کہ بلا کا خوف خود بلا سے زیادہ سخت ہوتا ہے۔ چنانچہ دریا میں انسان جھپٹی تک پھین رہتا ہے جب تک کہ ڈوب جانے کا اندیشہ ہوتا ہے جب ڈوب گیا پھر کچھ بھی بے حسنی باقی نہیں رہتی۔ پس یوں کہنا چاہیے کہ ”قعرِ دریا سلسبیل و رویِ دریا آتش است“

پاک خوراموز و زنا راز ہے فردا منہ
 در شریعت بادہ امرو ز آبِ فردا آتش

جو لوگ شرابِ طور کی امید پر دنیا میں شراب نہیں پیتے وہ گویا جو شراب آج نہیں پیتے اسکو کل کیلئے رکھ چھوڑتے ہیں۔ پس اُن سے کہتا ہے کہ در پاک خوراموز، ”یعنی سب آج ہی بیٹروے اور کل کیلئے مت رکھ، کیونکہ شریعت میں شراب آج تو پانی ہے اور کل وہی آگ ہو جاوے گی۔“

ز وہم نقشِ خیالی کشیدہ ورنہ
 وجودِ خلق چو غنقا بدہرِ نایاب است

قوی قنادہ جو نسبت۔ ادبِ مجہولِ ناب
 ندیدہ کہ سوی قبلہ پشتِ محراب است

یعنی جب تعلق اور نسبت قوی ہو جائے تو پھر ادبِ ظاہری کی توقع نہ کرنی چاہئے۔ دیکھو! قبلہ کی طرف پشت کرنا ہر ایک کے لئے خلافِ ادب ہے، مگر محرابِ مسجد جسکو قبلہ سے نہایت مقبوض تعلق ہے۔ اُسکی پشت ہمیشہ قبلہ ہی کی طرف رہتی ہے۔

ہر چہ فلکِ نحو است است ہیچکس از فلکِ نحو است
 طرفِ فقیہ نے نہ نسبت بادہ ماگزک نحو است

شوقی
شوقی

بمخوذ وقت فرج پیدن گناہ من دانستہ دشمن تیر نہ کردن گناہ کست

یاد از عدد و نیارم و اینم زد و دینیست کاندردلم گذشتن بادوست ہمنشینست

کتاب ہے میں جو رقیب کا خیال دل میں نہیں لاتا یہ دودینی کی بات ہے کیونکہ میرے دل میں رقت
و دوست رہتا ہے اگر رقیب کا خیال دل میں آئے گا تو گویا رقیب دست کے ساتھ ہمنشین ہو جائیگا۔

من سوی او بہ بنیم داندہ زیبیائیست اوسوی من نہ بیند اذ ہم شرگیبست

چہ گفتہ ہا کہ در اندازہ گمان تو نیست قیامت ا۔ دل دیر ہر بان تو نیست

رواں فدای تو بانام کہ بردہ ناصح زہے لطافت ذوقیکہ در بیان تو نیست

چونکہ ناصح ترک عشق کی نصیحت کرتا ہے اس لئے مشوق کا نام عاشق کے سامنے اچھی طرح نہیں

لیتا۔ شاعر ناصح کی طرف خطاب کر کے کتاب ہے کہ میری جان تجھ پر قربان ہو! تو نے کس کا نام لیا؟

وہ کسی لطافت اور لذت ہوگی جو کہ تیرے بیان میں نہیں ہے؛ یعنی جس طرح اُس کا نام لیتا چاہئے

تھا اگر اُس طرح تو بھی وہ نام لیتا تو کسی لطافت اور لذت تیرے بیان میں ہوتی۔ مگر چونکہ ناصح

نے بری طرح سے اُس کا نام لیا تھا۔ اس لئے کتاب ہے کہ وہ کسی لطافت ہوگی جو تیرے بیان میں نہیں ہے۔

دل از خاموشی لعلت امید وار چہ است چہ گفتہ بزبانے کہ در وہان تو نیست

مشوق نے منہ سے کچھ نہیں کہا مگر اُس کی نگاہ یا تبسم یا کسی اور اداسے اُس کے التفات یا وصل کی امید

بندھی ہے پس کتاب ہے کہ تیرے لعل لب کی خاموشی سے میرا دل اس قدر کیوں امید وار ہے تو نے

اُس زبان سے جو تیرے منہ میں نہیں ہے کیا کہہ دیا ہے جس سے اُس کو امید بندھی ہے۔

گمان نیست بود بر بہت نہ بیدردی بدست مرگ و بے بدتر از گمان تو نیست

شوقی
عاشقانی
عاشقانی

عاشقانی

عاشقانی

سجی اگر میرتبہ خاک داری دانی اگر بمعنی لولاک داری

خود ہر چہ از حق است از آن محمد است

شاہ بقبل عاشق و عاشق بجال و شد بجنوں بیاسے لیلی و لیلی بفرق خود

مومن یہ آل احمد و اشش بروج جد ہر کس قسم بد انچہ عزیز است می خود

سو گندہ کردگار بجان محمد است

اسے خامہ و صفت قاسمیت شوق کم گھا اسے دل سخن ز راست قدمیاں سار

قمری! ز ذکر سرو نقش را نگاہ دار واعظ! حدیث سایہ ملبوسے فروگذار

کاینجا سخن ز سرور روان محمد است

حکمش مہر و ماہ رو بہت چوں قضا دیدی کہ باز گشتن غور شید ریفا

بودہ است بر اشارہ ابروی نطفے بنگرد و نیمہ گشتن ماہ و تمام را

کال نیمہ جنبشے زبان محمد است

آنجا کہ از مناقب عبرت سخن رود ذرا آل و از صحابہ و بہت سخن رود

وال کاینمہ ز فہم رسالت سخن رود در خود ز نقش مہر نبوت سخن رود

اک نیز نامور ز نشان محمد است

اہمیت بدج نہ من و حالی گاشتیم گفتیم و از پنج گشتنی با پنج گشتیم

چون کام و لب فراخ و بفتش آیتیم غالب شنائے خواجہ پیر و ان گشتیم

کال ذات پاک تہ دان محمد است

واعظِ اجدیتِ سایہِ مطلوبے افروگذار
کایجا سخنِ ز سرِ فرداںِ محمدؐ است
بنگرد و نیمہ گشتنِ ماہِ متسام را
کاں نیمہ جنبشی ز زبانِ محمدؐ است
در خود ز نقشِ مہرِ توت سخنِ رود
اں نیز تا مور ز نشانِ محمدؐ است
غالبِ بنایِ خواجہ بہ زرداں گداشتیم
کاں ذاتِ پاکِ مرتبہ دانِ محمدؐ است

یہ غزل مرزا نے اپنی عام طرز کے خلاف نہایت صاف اور بلیغ لکھی ہے۔ راقم نے مرزا کی زندگی میں اس غزل کی تمغیس کی تھی اور مرزا صاحب کو بھی دکھائی تھی۔ چونکہ وہ تمغیس اتبک شائع نہیں ہوئی اسلئے مقتضائے مقام یہ ہے کہ اسکو بھی اس غزل کے ساتھ نقل کر دیا جائے۔

اعجاز از خواصِ لسانِ محمدؐ است
عینِ الحیوۃِ گم بہ دہانِ محمدؐ است
گر نور و گر ہدے کہ اذانِ محمدؐ است
حقِ جلوہ گر ز زبانِ محمدؐ است
ارے کلامِ حقِ زبانِ محمدؐ است

دانی ز پیشِ چشمِ تو بر خیزد از حجاب
کز نورِ شمعِ پردہ فائوسِ راست تاب
باشد فلورِ روشنیِ عارضِ از نقاب
آئینہ دارِ پر تو بہرست ماہتاب
شانِ حقِ آشکار ز شانِ محمدؐ است

لطفِ خداست گر کس نہاد است
قہرِ خداست چوں ز سرِ کسِ حجبِ است
واند کس یکہ شد ز بے ماییتِ مست
تیرِ قضا ہر آئندہ در ترکشِ حقِ است
اما کشادہاں ز کمانِ محمدؐ است

گوئی اگر ب عالمِ ادراکِ واری
بینی اگر بہ دیدہ و دراکِ واری

عالم آئینہ راست چہ پیدا چہ تھاں تاب اندیشہ نداری بہ نگاہے دریا
یعنی اگر توشیح نہیں سکتا تو نگاہ ہی سے عالم کو دیکھ کہ اسکا ظاہر و باطن سب نظر اسرار الہی ہے۔
فرصت از کف مدہ موت غنیمت پندار نیست اگر صبح بہاری شبیہا ہے دریا
گر پس از جور بہ انصاف گراید عجیب از حیار وے یا اگر نماید چہ عجیب
کہتا ہے کہ ظلم و ستم کے بعد اگر وہ انصاف کی طرف مائل ہو جائے تو کچھ عجیب نہیں یعنی اپنے پھلے ظلم یاد
کر کے جیسا سے ہلکو متھ نہ دکھلائے تو کچھ تعجب نہیں مطلب یہ کہ انصاف بھی کر گیا تو اس طرح کر گیا کہ ہم
اسکے دیکھنے سے محروم ہیں۔

بودش از شکوہ خطرو نہ سری شتابین بزم ارم اگر از مہویا ید چہ عجیب
خیالی پلاؤ پکا تا ہے تاکہ اسی طرح اپنے دل کو تسکین دے۔
با چنین شرم کہ از ہستی خویش با شد غالب از رخ برہ دوست نایب
یعنی اس شرم سے کہ اپنے تئیں غلطی سے موجود سمجھ رہا ہے اگر غالب خدا کے آگے سجدہ نہ کرے
تو کچھ تعجب نہیں۔

حق جلوہ گر ز طرہ بیان محمد است آری کلام حق زبان محمد است
آئینہ دار پر تو بہرست ماہتاب شان حق آشکار ز شان محمد است
تیر قضا ہر آئینہ در تر کش حق است اما کشا د اں ز کمان محمد است
دانی اگر بمعنی لولاک و اسی خود ہر چہ از حق است از ان محمد است
ہر کس متم بہانچہ عزیز است می خورد سو گند کردگار بجان محمد است

سے باندازہ حرام آمدہ۔ ساتھی خیرینہ شیشہ خود ششکین بر سر پیمانہ ما

بر خلاف عقل و شرع کے کتاب ہے کہ اسے ساتھی شراب اعتدال کے ساتھ پینی حرام ہے تو اٹھ اور اپنا شیشہ یعنی بوتل یا صراحی ہمارے گلاس پر دے مار اس شعر میں اقراط شوق کی تصویر کھینچی ہے خواہ کسی چیز کا شوق ہو جب کسی چیز کی طلب اور خواہش حد سے گزر جاتی ہے تو اس بات کی حس نہیں ہوتی کہ اپنے ظرف کے موافق اسکی خواہش کیجائے جب پانی کی پیاس نہایت شدت سے ہوتی ہے تو پیاسا دریا کو دیکھ کر یہ چاہتا ہے کہ سارے دریا کو پی جائوں پس گو کہ مضمون شوق شراب کی تمثیل میں بیان کیا گیا ہے لیکن اسکا مصداق ہر چیز کا متنازع قرار پایا جاسکتا ہے۔

مور آید ز کف دست اگر دہقان را نیست ممکن کہ کشد ریشہ سر از دائرہ ما

ظاہر ہے کہ انسان کی ہتیلی میں بال پیدا ہونے کی قابلیت نہیں رکھی گئی۔ کتاب ہے کہ اگر فاشکار کی ہتیلی میں بال بھی نکل آئیں تو بھی یہ ممکن نہیں کہ ہمارا دائرہ پھوٹ کر اس میں سے ریشہ نکل آئے یعنی ہماری کوششوں کا مشکور ہونا محال ہے۔

خواجه و رضایش در خرابی ہا باشد ز چشم بد نگہ دارد خدا ما دوست گاماں را

خراب۔ مست، ویران، اور تباہ، مینوں مینوں میں آتا ہے۔ دوست کام وہ شخص جسکی حالت دوستوں کی خواہش کے موافق ہو یعنی عمدہ حالت ہو۔ کتاب ہے کہ ہم خود بھی خراب ہیں اور دوست کی خوشی بھی یہی ہے کہ خراب حال میں پس ہم دوست کاموں کو خلی حالت دوست کی مرضی کے موافق ہے خدا تعالیٰ نظر بد سے محفوظ رکھے۔

تو دانی تا بہ لطف از خاک برداری کہ اماں را بسا اقادہ۔ سرست و بسا اقادہ در طاعت

نہیں ہے؛ کہ جس طرح بیچ و نشر اور لین دین کے وقت شرطیں کر لیتے ہیں اسی طرح دل دیتے وقت بھی کوئی شرط کر لیتا ہے۔

آوازہ شرع از سرِ منصور بلندست از شبِ رویِ ماست شکوہ عسَسِ ما
شبِ رویِ چوری کے لئے راتوں کو پھرنا۔ کہتا ہے کہ اگر مجرموں کو تعزیر نہ دیا جائے تو شریعت کی شان و شوکت اور حکومت کی شکوہ ظاہر نہیں ہوتی۔ پس ہم جو مرکب جرائم ہوتے ہیں گویا شریعت اور حکومت کی شان بڑھاتے ہیں۔

دقتِ کہ خونِ جگر از درِ دیوِ جوشد چند آنکہ چکد از قزو وادرس ما
کہتا ہے کہ میری مطلوبی اب اس درجے کو پہنچ گئی ہے کہ وہ وقت آن پہنچا ہے کہ خونِ جگر درو سے جاٹیکے۔

دور و ہر فرد رفتہ لذت نتوان بود بر قند۔ نہ بر شہد ز شہد بگس ما
یعنی ہم دنیا کی لذتوں سے متمتع ہوتے ہیں مگر ان میں چھپتے نہیں جیسے وہ مکھی جو قند پڑھتی ہے کہ جب چاہا اڑ گئی نہ وہ مکھی جو شہد پڑھتی ہے کہ پھر بھرنے نہیں سکتی۔

بادِ شکویِ ابیدہ کنارِ کشتِ ما کوثر و سلسبیلِ ما طوبیٰ بایہشتِ ما
حسرتِ وصلِ از چہ رو۔ چون خیالِ سرخوشم ابرا اگر بایستد۔ پر لبِ جوستِ کشتِ ما
یعنی جبکہ ہم خیالِ دوست ہی میں مست و سرشار ہیں تو وصل کی حسرت کیوں کریں۔ اگر آبر نہیں برستا تو نہ برسے یا ہماری کھیتی خود ندی کے کنارے پر ہے۔

بژدہ صد ابویں بے بر سرِ صمدِ ہزار ششم گزہنی در آفتابِ بادِ چکد ز خشتِ ما

یعنی میرا دن اس قدر تاریک تھا کہ شام کی تاریکی اور اس کی تاریکی دو قوتوں گئیں، اور یہ نہ معلوم
ہوا کہ شام کب ہوئی اور دن کب چھپا۔

تاریخ ہر کہ تن پرور بود خوش بود گردانہ نبود دام را
یہ وہی مضمون ہے جو مرزا نے اردو میں اس طرح بیان کیا ہے۔

عامت میں تاریکی نہ تھی بلکہ میں لالہ
دو بیخ میں ڈال سو کوئی لیکر بشت کو
داستان درخشم و غالب ہے
شوق نشناسد ہمے ہنگام را
در بحر طربش کند تاب و تبم را
متاب کعبہ مار سیاہست شہم را

یعنی جبرائی کے زمانے میں جبرساں عیش و طرب مینا ہوتا ہے اس سے میری بقیاری اور تپش
زیادہ ہوتی ہے۔ پس چاندنی جبکہ عیش و طرب کی محک ہے وہ میری رات کے حق میں سیاہ
کے چین کا حکم رکھتی ہے۔

تشنہ لب ساحل دریا ز غیرت جان دہم گر سبج افتد گمان بین پشانی مرا

کہتا ہے کہ میں کیسا ہی پیاسا ہوں لیکن اگر دریا کی موج پر چھبکویہ شبہ بھی گزرے کہ دریا نے مجھے
بوکیا کر پشانی پر بل ڈالا ہے تو میں غیرت کے مارے ساحل دریا پر جان دیدہ لگا کر حلق تن کر ڈکا
پایان محبت یاد می آرم زمانے را کہ دل عہد وفا تابستہ دادم دستانے را

اس شعر میں اپنی نادانی اور حماقت ظاہر کرتا ہے، کہ اب انتہائے محبت میں جبکہ معشوق کی
طرف سے ظلم و ستم و بیوفائی کی کچھ حد نہیں رہی مجھے یہ خیال آتا ہے کہ افسوس ہے جب میں نے
دل اسکو دیا تھا اسوقت وفاداری کا عہد نہ لے لیا۔ حالانکہ دل کا دنیا کوئی اختیار بات

شربخواروں کے مشرب میں خود نمائی منع ہے۔ دیکھو جمشید جو بادہ نوشی میں ضربِ اشل ہے اُسکے ہاں
اگر خود نمائی یعنی آئینہ جیسا کہ سکندر کے ہاں تھا نہ تھا۔

بہشتی

زمانہ سستی و بادگیراں گزشتہ
بیا کہ عہد وفا قیست استوار ہیا

یعنی اگر تو نے مجھے توڑ کر غیروں کے ساتھ پیمان باندھا ہے تو اسکا خیال نہ کر اور بے تکلف ہمارے پاس
چلا آ، کیونکہ عہد وفا تو ٹوٹنے ہی کے لئے باندھا جاتا ہے، وہ کبھی استوار نہیں ہوتا، جیسا کہ ہمارے
ساتھ بندھ کر ٹوٹ گیا۔

عاشقانہ

دواع و وصل جدا گانہ لذتے وارد
ہزار بار برد صد ہزار بار بیا

یعنی دواع میں اور رطقت ہے اور وصل میں اور لذت ہے۔ پس ہزار بار جدا اور لاکھ بار آ۔ صد ہزار
لفظ نے شعر کو زیادہ بلن کر دیا ہے، کیونکہ شاعر جو دیکہ لذت میں دواع اور وصل دونوں کو یکساں قرار دیتا ہے
مگر پھر بھی اپنے مطلب کی بات کو نہیں بھولا، اور جانے کے لئے ہزار بار اور آنے کے لئے صد ہزار بار
کا لفظ استعمال کیا ہے۔

مہربان

روح صومعہ ہستی ست زینہار مرو
متاع میکہ سستی ست ہوشیار بیا

یعنی صومعہ میں ہستی و نپدار و غور کار و روح ہے وہاں ہرگز نہ جا، اور میکہ کی جو کچھ پوچھی ہے
وہ سستی ہے، یہاں ذرا ہوشیار ہو کر۔ یعنی طرفِ عالی لیکر آنا چاہئے۔ سستی حاصل کرنے کے لئے
ہوشیار ہو کر آنا۔ ایسے جو لطف ہے وہ محتاج بیان نہیں۔

چوں بقا صدمہ سپرم پیغام را
رشتہ نگذار د کہ گویم نام را
گشتہ در تاریکی رہزم نہاں
کو چراغ تابہ جویم شام را

دشکر
نارنگی

جنت کی کیفیت سے اور جو اس لذت و راحت ہے اُس سے حاسد لوگ یہ خبر ہیں۔ اسلئے
ریشک سے اُنکی یہ حالت ہے کہ گویا آپر و دوزخ کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔

سوزِ ترارواں ہمہ در خوشیتن گرفت از داغِ تہمتے بہ جگر بستہ ایم ما
یعنی تیرے سوز اور تیری آگ کو جان نے بالکل اپنے اندر لے لیا ہے؛ اور ذرہ برا کسی کو لئے
اسیں سے حقہ نہیں چھوڑا۔ پس ہم جو اپنے جگر کو داغ دار قرار دیتے ہیں درحقیقت اُسپر تہمت
رکھتے ہیں۔

با چوتوئے معاملہ بر خوشیتن مت است از شکوہ تو شکر گزار خودیم ما
روئے سیاہ خویش نہ خود ہم منفعت ایم شمعِ خموش کا پہ تارِ خودیم ما
کہ وئے چوں زے یا ہم خیالِ خوشیتن بالم کہ پندارم سر آمد روزگار بے نواہیا
یعنی ایک شراب کا بھرا ہوا تونبا جھکو بھاتا ہے تو میں پھولا نہیں سامانا اور یہ سمجھتا ہوں کہ بس اب
بے سرو سامانی کا زمانہ ختم ہوا۔

سخن کو تہ مرا ہم دل بقولے مائل است۔ آما زنگِ زارہ افتادم بجا فرما جرایہا
یعنی زارہ کے ساتھ ہم پیشہ ہونے سے عار آتا ہو اسلئے میری کفار کی سی حالت ہے در نہ تقویٰ
کی طرف مجھے بالطبع میلان تھا۔

در مشربِ حریفان مغست خود نمائی بنگر کہ چوں سکندر آئینہ نیست جم را
حریفان کا لفظ فارسی میں ایسا ہے جیسا اردو میں یاہو لوگوں کا لفظ۔ اور لفظی معنی اسکے ہم پیشہ ہیں
جب شہزادہ بخوار کسی کو حریف یا حریفان کہتا ہے تو اُس سے مراد شہزادہ بخوار ہوتی ہے۔ کہتا ہے کہ ہم

سایہ چشمہ بھرا دم عیشے دارد اگر اندیشہ منزل بنود رہزن ما
یہ دنیا کی مثال ہے؛ یعنی اگر آخرت کا کھٹکانہ لگا ہوا ہو تو دنیا خاصی آرام کی جگہ ہے۔ مگر چونکہ یہ کھٹکا
لگا ہوا پس لئے یہاں آرام کے ساتھ دم نہیں لیا جاسکتا۔

مے پر دہمور مگر جاں بسلامت سیرد تاچہ برق بست کہ شد تا مزدخر من ما
یعنی معلوم نہیں کہ ہماری خرم کون سی بجلی گرنیوالی ہے کہ چوٹے جان بچانیکے لئے پہلے ہی سے اڑے جاتے
ہیں۔ تیش کے پیرائے میں یہ ظاہر کرتا ہے کہ دوست اور رفیق کوئی ہمارے رنج میں شریک نہیں ہوتا۔
سخن باز لطافت نہ پذیر دختسیر نشود گردنمایاں زرم تو سخن ما

یعنی ہمارے خیالات اس قدر لطیف ہیں کہ تحریر میں نہیں آسکتے؛ گویا ہمارے گھوٹے کی دوڑ میں گر غبار
بالکل نہیں اٹھتا۔

ما بنودیم بریں مرتبہ راضی غالب شعر خود خواہش آں کرد کہ گرد و فن ما
یہ ملکہ نظری کی طرف اشارہ ہے یعنی ہمنے شاعری خود نہیں اختیار کی بلکہ ملکہ شاعری نے خود ہمو
مجبور کیا کہ ہم اُسکو اپنا فن قرار دیں۔

با بندہ خود ایں ہمہ سختی مئی کستند خود را بزور بر تو مگر بستہ ایم ما
یہ خطاب خداوند حقیقی کی طرف ہے؛ یعنی کیا ہم زبردستی سے تیرے سر ہو گئے ہیں کہ ہم پر ایسی
سختی کی جاتی ہے؟

بر دے حاسداں درد و زخ کشود شک از بہر خویش جنت در بستہ ایم ما
یعنی ہم اپنا کمال دیکھ کر آپ ہی خوش ہوتے ہیں گویا ہم اپنے لئے جنت در بستہ ہیں پس چونکہ ہماری

حال ہا از غیر می پرستی منت می برم
اگسی بارے کہ آگہ نیستی از حال ما

یعنی توجہ ہمارا حال غیر سے پوچھتا ہے ہم اسی بات کے شکر گزار ہیں: بغیثت ہے کہ تو اس بات سے
تو آگاہ رہے کہ تجھ کو ہا یہ حال کی خبر نہیں۔

دل نا دیں ز نسکین کم دن میتوان دان
چہ امیدست آفر خضر وادیسین مسیحا

نٹھے برستی عالم کشیدیم از فرزند بتن
ز خود رفیقیم و مسم با خوشن تن بریم نیایا

وقت تاج غم تست چہ پیدایہ نہاں
ہجو رنگ از رخ مرفت دل از سینہ ما

جوئے از بادہ و جوئے ز غسل دار غلہ
اب لعل تو ہم اس است ہم آنست مرا

غار ہا از اثر کرے مقام سوخت
منتے بر قدم راہ رواں ست مرا

یعنی راہ کے تمام خار بخش میری گرمی رفتار سے جل گئے ہیں: پس نگہیروں کے قدم پر میرا احسان ہے
راہ کے لئے میں نے رستہ بالکل صاف کر دیا ہے۔ یہ تمام نعمتوں استعارے میں بیان ہوا ہے۔ مطلب یہ ہے
کہ نازک خیالی کے طریقے میں جو الجھاؤ تھے وہ سب میں نے اس طریقے پر چلکر دور کر دئے ہیں اور
آئندہ آنے والوں کے لئے راہ صاف کر دی ہے۔

دہر و تفتہ دور رفتہ بر آہم غالب
توشتہ بر لب جو مانده نشانست مرا

یعنی میری مثال اس مسافر کی سی ہے جو گرمی اور کوسے بھلا نہجنا۔ پانی کو دیکھ کر بے اختیار اُمیدیں کو دپڑے اور
دُوب جاتے، اور ندی کے کنارے پر اسکا زور راہ پڑا رہ جائے جس سے یہ معلوم ہو کہ یہاں کوئی مسافر ڈوبا ہے۔ اس
شعر میں مرزا نے اپنی خاص حالت کو تشبیہ کے پیرائے میں بیان کیا ہے۔ گویا یہ کہتے ہیں کہ دنیا میں لوگوں نے تجھ کو
مصلحت انگل اور ترانس کے پچا نا ہے، ورنہ میں۔ جیسا کہ میں ہوں۔ سب کی نظروں سے مخفی رہا ہوں۔

پیشانی

رسم
تصنیف
حاجت خانہ
حاجت خانہ
حاجت خانہ

تصنیف

رسم

خود

کے کسی کو پانی نہیں دیتا؛ پس اگر سکندر آبِ حیا کے نہ ملنے کے سبب ہلاک ہو جائے تو ہو۔
دوسرے مصرع میں خدا کی بے نیازی کا بیان ہے؛ یعنی خضر جان جیسی غریب چیز مفت نذر کرتا ہے
مگر تو اسکو قبول نہیں کرتا؛ اور اس لئے اسکو کسی طرح موت نہیں آتی۔

بزم تراشم و گل خستگے بو تراب ساز ترا زیر ویم واقعہ کر بلا
یعنی تیرے ہاں وہی سب سے زیادہ مقرب اور برگزیدہ ہیں جو سب سے زیادہ مشائخِ حواش
مصائب و الآلام ہیں۔

سادہ ز علم و عمل مہر تو درزیدہ امستی ما پائدار بادۂ مانا نشستا
مانشتا ہمارے رہنا اور کچھ نہ کھانا نہ پینا۔ دوسرے مصرع کے یہ معنی ہیں کہ گویں نے شراب کا ایک قطرہ
نہیں پایا مگر نشے میں ہر وقت چور رہتا ہوں؛ یعنی گو علم و عمل کچھ نہیں رکھتا مگر تیری محبت میں شام
قطع

۱ اے خاکِ درت قبلہ جانِ دل غالب کو فیض تو پیرایہ ہستی ست جہاں ما
۲ تا نام تو شیرینی جانِ دادہ گفتن در خویش فرو بردہ دل از مہر زبانی
یعنی آنحضرتؐ کا نام ہمارے لینے سے زبان میں ایسی شیرینی اور حلاوت پیدا ہوئی کہ دل نے پیچھا
اسکو اپنے اندر اتار لیا۔

ماہا سہ گرم پروازیم فیض از ماچوے سایہ بچوں دود بالائے رود از بال ما
یعنی ہماری پرواز میں اس قدر گرمی ہے کہ جس طرح دھواں آگ کے اوپر ہی اوپر جاتا ہے اسی طرح ہمارے
پروں کا سایہ بچے نہیں پڑتا بلکہ دھوئیں کی طرح پروں کے اوپر اوپر جاتا ہے۔

کے بعد جو کئی ناظم کے بیان میں رہ گئی تھی اُسکو مرزا نے یوں پورا کیا ہے

”زنجامی بہ عرفی و مطالب رسید ز عرفی و طالب بہ غالب رسید“

اگرچہ مرزا نے بیدل اور ان کے شبہین کی زبان اور ان کے انداز بیان میں شعر کہنا بالکل ترک کر دیا تھا اور اس مجموعہ میں وہ اہل زبان کے طریقے سے سہر متوجہ نہیں کرتے تھے۔ مگر خیالات میں بیدیت مدت تک باقی رہی۔ لیکن آخر کار تغزل میں بے انتہا گلاوٹ اور صفائی پیدا ہو گئی تھی، ہم اس مقام پر انکی غریبات میں سے زیادہ تر صفات معاف اور کسی قدر وہ اشعار بھی نقل کریں گے جنکے بغیر مرزا کی طرزِ تخیل اور انکے شعر کی خصوصیت ظاہر نہیں ہو سکتی۔

انتخاب غریبات فارسی

شاہد حسن ترا در روش دلبری طرہ پر خم صفات موسیٰ میاں ماسو

یعنی اگر تیرے حسن کو مثل شاہد ان مجازی کے ایک شاہد قرار دیا جائے تو اُسکا طرہ پر خم کیا ہوگا؟ صفات آئیں۔ اور اُسکا موسیٰ میاں کیا قرار پائیگا؟ ماسو یعنی اللہ شوائے تصوفین صفات آئیں کو اکثر اہلِ عرف و گیسو اور طرہ و کاکل کے ساتھ تعبیر کرتے ہیں۔ اور چونکہ ماسو کے اللہ کو صوفیہ معدوم محض جانتے ہیں اور مشوق کی فکر کو مشتاق معدوم قرار دیتے ہیں۔ اس لئے شاہد حسن حقیقی کی فکر اسوئے کو قرار دیا ہے۔

آب نہ بخشی بزور خون سکندر ہڈر جاں نہ پزیری ہیچ نقدِ خضر ناروا

ہڈر یعنی حلال۔ مشہور ہے کہ سکندر آبِ حیا کی تلاش میں گیا تھا مگر نہ کام رہا۔ کہتا ہے کہ تو زور دے

جلوے میں طاؤس ہے تو پرواز میں عتقا

مرزا کے اس بیان سے پایا جاتا ہے کہ وہ غزل میں خاص نظیری کی روش پر چلتے تھے، بلکہ انکی غزلیات کے دیکھنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ انکی غزل میں نہ صرف نظیری۔ بلکہ عرفی، مہروری، طالبی، جلالی، اسیر اور انکے دیگر متبعین کی غزل کا رنگ علی العموم پایا جاتا ہے۔ البتہ اس لحاظ سے کہ تصوف کا عنصر مرزا کے کلام میں نظیری سے کچھ کم نہیں ہے۔ انکی غزل بلاشبہ نظیری کی غزل سے زیادہ مناسب رکھتی ہے لیکن طرز بیان کے لحاظ سے نظیری کی کچھ خصوصیت میں معلوم ہوتی۔

ناظم ہروی کی چند بیتیں مشہور ہیں۔ جن میں عنصری سے لیکر جامی تک ہزار نامے میں جو شاعر سربراہ ہوئے ہوئے اسکا نام لیا ہے۔ انکے آخر میں مرزا نے ایک بیت اپنی طرف سے اضافہ کی ہے۔ چونکہ اصل تنوی اور اسپر مرزا کا اضافہ فائدے اور لطف سے خالی نہیں ہے اس لئے ہم اسکو یہاں نقل کرتے ہیں تاکہ کتاب ہے۔

شہد عنصری شاہ صاحب سخن	”شنیدم کہ در دور گاہ کہن
بہر دو سنی آمد کلاہ می	چو اورنگ از عنصری شد تہی
بحر قافی اندب سخن	چو فردوسی اور دسر در سخن
نظامی بہ ملک سخن شاہ گشت	چو خاقانی از دار قافی گذشت
سرچہ دانش سعدی رسید	نظامی چو جام اجل در کشید
سخن گشت بر فرق خسرو شار	چو اورنگ سعدی فرو شد زکار
ز جامی سخن را تمامی رسید	ز خسرو چو نوبت بہ جامی رسید

اسوقت سب لوگ بہت متاثر ہوئے اور مولانا آزدہ شہر اکراموش ہو رہے۔
 صہبائی اور علوی بھی چونکہ مرزا بیدل کا تتبع کرتے تھے اور مرزا غالب نے اُس طریقے کو بالکل
 چھوڑ دیا تھا اس لئے وہ مرزا کو اور مرزا انگوٹھ مانتے تھے۔ لیکن چونکہ یہ تمام گروہ سخن فہموں اور سخن سخنوں کا
 تھا اور مشاعرہ میں اکثر ایک دوسرے سے ٹٹ بھٹ رہتے تھے۔ یہی تھی۔ مرزا کو اپنے خیالات کی اصلاح
 اور اپنے اشعار کی تہذیب و تنقیح میں زیادہ کوشش کرنی پڑتی تھی اور یہی اُن کی اصلی
 ترقی کی بنیاد تھی۔

غزل معلوم ہوتا ہے کہ مرزا نے فارسی غزل بھی دل مرزا بیدل وغیرہ کی طرز میں کنش شروع کی تھی۔ پہلا نظم کی
 بہت سی غزلیں اُنکے دیوان میں اب تک موجود ہیں مگر رفتہ رفتہ یہ طرز بدلتی گئی اور آخر کار عرفی، ظہوری، نظیری، اور
 غالب آملی وغیرہ کی غزل کا رنگ مرزا کی غزل میں پیدا ہو گیا۔ وہ اپنے فارسی دیوان کے غزلوں میں لکھتے
 ہیں حکایت ترجمہ یہ ہے، در اگرچہ طبیعت ابتدا سے نادر اور برگزیدہ خیالات کی جو یا تھی لیکن آزادہ روی کے
 سبب زیادہ تر اُن لوگوں کی پیروی کرتا رہا جو راہ صواب سے نابلد تھے۔ آخر جب اُن لوگوں نے جو
 اس راہ میں پیش رو تھے۔ دیکھا کہ میں باوجودیکہ اُنکے ہمراہ چلنے کی قابلیت رکھتا ہوں اور پھر بے راہ
 بھٹکتا پھرتا ہوں؛ اُنکو میرے حال پر رحم آیا اور انہوں نے مجھے مرتیانہ نگاہ ڈالی۔ شیخ علی خرمی
 نے مسکرا کر میری بے راہ روی مجھ کو بتائی۔ طالب آملی اور عرفی شیرازی کی غضب آلود نگاہ نے
 آوازہ اور مطلق العنان پھرنے کا مادہ جو مجھ میں تھا اُسکو فنا کر دیا۔ ظہوری نے اپنے کلام کی گیرائی
 میرے بازو پر تعویذ اور میری کمر پر زار راہ بانڈھا اور نظیری نے اپنی خاص روش پر چلنا مجھ کو سکھایا۔
 اب اس گروہ والا شکوہ کے فیض تربیت سے میرا ملک رقص چال میں لک ہے تو راگ میں مستعار

دل بدیں و صغیر نیا سا یہ سخن کو تہ کیف۔
 آنکہ ننگ دوست بودن سخن تمہاے من
 یعنی بوعلی سینا کا مدوح کی یکتائی پر میرے ساتھ اتفاق رائے کرنا اور عقل فعال کا اسکو دکر مہر کا
 من، لکھنا یہ سب باتیں اسکی مدح کے لئے کافی نہیں ہیں؛ مختصر یہ کہ وہ ایسا شخص ہے کہ شعر میں
 مجھ جیسے شخص کا ہنس رہتا ہوتا بھی اسکے واسطے موجب ننگ و عار ہے۔ ہمیں قطع نظر اسکے کہ
 مدوح کی اور اس سے بھی زیادہ اپنی تعریف ایک نہایت لطیف پیرائے میں بیان کی ہے اس
 بات کا بھی اشارہ ہے کہ مدوح میری شاعری کو پسند نہیں کرتا۔

مرزا کی وفات سے چھ سات برس پہلے کا ذکر ہے کہ ایک روز نواب حسرتی کے مکان پر
 جبکہ راقم بھی وہاں موجود تھا۔ آزرودہ اور غالب اور بعض اور مہمان جمع تھے؛ کھانے میں بیٹھی؛
 فارسی دیوان غالب کے کچھ اوراق پڑے ہوئے مرزا کی نظر پڑ گئے۔ ان میں ایک غزل تھی جس کے
 مقطع میں اپنے منکروں کی طرف خطاب کیا تھا۔ اور جبکا مطلع یہ ہے۔

نشاط معزیاں از شرابخاہ دست فسون بآبیاں فصلے از فساد دست

مرزانے وہ اوراق اٹھائے اور مولانا آزرودہ سے مزاج کے طور پر کہا ”دیکھئے کسی ایرانی شاعر نے کیا
 زبردست غزل لکھی ہے“ یہ لکھ کر غزل پڑھنی شروع کی۔ اول کے دو تین شعروں کی مولانا نے
 تعریف کی؛ مگر پھر بعض قرائن سے سمجھ گئے کہ مرزا ہی کا کلام ہے۔ مسکرا کر جیسی کہ انکی عادت تھی کہنے
 لگے ”کلام مربوط ہے مگر تو آئو نہ کا کلام معلوم ہوتا ہے“ سب حاضرین ہنس پڑے۔ جب مقطع کی نوبت
 آئی۔ مرزانے مولانا کی طرف خطاب کر کے دروہا کی آواز سے یہ مقطع پڑھا۔

تو ایک محسن گستران پیشینی بیاش منکر غالب کو در زمانہ دست

یہ اسلئے لکھا کہ وہ اپنا رتبہ یقیناً شیخ علی بن مریم سے برتر و بلند تر سمجھتے تھے ورنہ وہ ہرگز مرزا کو شیخ کے برابر قیام نہ کرتے۔

نواب شش فغان مرجوم ہمیشہ مرزا کو نابوری و عرفی کا بی پایہ کیا کرتے تھے اور صاحبِ کلیم وغیرہ سے ان کو براتیب برتر اور بالاتر سمجھتے تھے۔ نواب ضیاء الدین خاں کا مرزا کی نسبت یہ قول تھا کہ بندہ دستان میں فارسی شعر کی ابتدا ایک ترک الجین (یعنی امیر خسرو) سے ہوئی اور ایک ترکی یک یعنی مرزا غالب پر اُسکا ناتہ پہلایا۔ یہ غلام علی خاں دشت مرزا کی نسبت کہتے تھے کہ اگر تیریں عربیہ کی حرف متوجہ ہو جاتا تو عربی شعریں دوسرا متبانی یا ابو تمام ہوتا، اور اگر انگریزی زبان کی تکمیل کرتا تو افغانستان کے مشہور شاعروں کا مقابلہ کرتا۔

مولانا آزاد دہیشک مرزا کی طرزِ فاس کو جو انھوں نے ابتدا میں اختیار کی تھی ناپسند کرتے تھے، اور چونکہ خیال کہ ابتدا میں مرزا کی نسبت مولانا کے ناظر نشین ہو گیا تھا وہ اخیر تک اُنکے دل میں کسی نہ کسی قدر باقی رہا۔ چنانچہ مرزا نے جو ایک فاسی قصیدہ مولانا مدوح کی شان میں لکھا ہے اُس میں اس ضمنوں کی طرف نہایت لطیف اشارہ کیا ہے کہ مولانا اُنکی شاعری کو تسلیم نہیں کرتے تھے۔ قصیدے کی تمہید میں اپنے مصائبِ الام و تسکایت روزگار وغیرہ کا بیان ہے، اُسکے بعد بیج کی طرف اس طرح گریز کرتے ہیں۔

خواجہ گرانڈ گسار من خودے۔ واسے سن
متفق گردیدہ راسے بو علی بابا راسے سن
بزرگارد عقل فحاشش و کرم فواسے سن

باچینس اندو کہ پرتقیم و دل خالی نشد
انکہ در یکسانی دے درغن مسر زانگی
انکہ چوں خواہد بنامش نامہ نامی ساختن

لیکن چونکہ یہ سب لوگ سخن فہم اور سخن سنج تھے اس لئے جس طرح قدردانوں کی تحسین و افرین سے مرزا کا دل بڑھتا تھا وہی طرح نکتہ چینوں کے خیال سے انکو پھونک پھونک کر قدیم رکھتا پڑتا تھا؛ اور انکے دل پر اپنا نقش بٹھانے کے لئے انہماک کمال میں زیادہ کوشش کرنی پڑتی تھی؛ اور اس طرح قدر دان اور نکتہ چین دونوں کی ترقی کے باعث تھے۔

مولانا فضل حق با اینہم علم و فضل مرزا کو جس رتبے کا شاعرانتے تھے اسکا اندازہ حکایتِ نیل سے ہو سکتا ہے۔ مولانا کے شاگردوں میں سے ایک شخص نے ناصر علی سرہندی کے کسی شعر کے معنی مرزا صاحب سے جا کر پوچھے۔ انھوں نے کچھ معنی بیان کئے۔ اُسے وہاں سے اکر مولانا سے کہا ”آپ مرزا صاحب کی سخن فہمی اور سخن سنجی کی اس قدر تعریف کیا کرتے ہیں؛ آج انھوں نے ایک شعر کے معنی بالکل غلط بیان کئے؛ اور پھر وہ شعر پڑھا؛ اور جو کچھ مرزا نے اُسکے معنی کہے تھے یہاں کئے۔ مولانا نے فرمایا پھر ان معنوں میں کیا برائی ہے؟ اُسے کہا برائی تو کچھ ہو یا تو مگر ناصر علی کا یہ مقصود نہیں ہے۔ مولانا نے کہا اگر ناصر علی نے وہ معنی مرا نہیں لئے جو مرزا نے سمجھے تو اُسے بہت غلطی کی۔ مرزا نے ایک غزل کے مقطع میں اپنے تئیں کم از کم شیخ علی خریں کا مثل قرار دیا ہے اور وہ مقطع یہ ہے۔

تو بدیں شیوہ گفتار کہ داری غالب گر ترقی نکسم شیخ علی رامانی
مومن خاں مرحوم نے جس وقت یہ مقطع سنا اپنے دوستوں سے کہنے لگے کہ اس میں بالکل مبالغہ نہیں ہے۔ مرزا کو ہم کسی طرح علی خریں سے کم نہیں سمجھتے۔

ایک صاحب نے جو مومن خاں مرحوم کی تعلیموں سے خوب واقف تھے یہ حکایت سن کر کہا کہ مومن خاں

محمود کرتی ہیں! ابلا سبق، استعداد اور فطری قابلیت کا اوقتنا یہ ہے کہ اگر تمام عالم میں ایک
 قدر دان یا مخاطب صحیح نہ تو ہمیں وہ اپنے جوہر ظاہر کے بغیر نہیں رہتی، جس طرح سورنڈاہ ویرا نے
 ہمیں ہزاروں آدابوں میں اسکو مستی اور نشا کے عالم میں اپنے سے گزیر نہیں اسی طرح وہ شاعر جو
 ہاں کے پیٹ سے شاعر ہی پیدا ہوا ہے بغیر اسکے کہ ملک میں کوئی اسکی قدر کرے یا اسکے کمال کی
 راہ دے اپنے ہنر کی تکمیل میں! تھوڑوں مارے بغیر نہیں دے سکتا۔ دوسرے اس فطری ملکہ کا ترکیبہ
 دینے والا اور اس اُن کا پتھر سے نکالنے والا اس بات کا یقین ہے کہ سوسائٹی میں کچھ لوگ فی الحقیقہ
 سخن فہم و سخن سنج موجود ہیں۔

اگرچہ ہندوستان میں فارسی زبان کا چرچہ مدت سے ٹھہرا رہا تھا اور فارسی شاعری کی عظمت بھی
 انتہا کے قریب پہنچ چکی تھی وگرنہ سن اتفاق سے اس اخیر دور میں چند صاحبان فضل و کمال
 خاصہ دار الحافظہ و بلی میں ایسے پیدا ہو گئے تھے جو علم و فضل کے علاوہ شعر و سخن کا مذاق بھی اعلیٰ
 دینے کا رکھتے تھے۔ ان چند صاحبوں سے میری مراد مولانا فضل حق خیر آبادی، ثم الہ بلوی، مولانا
 مفتی محمد صدر الدین خاں تخلص بہ آذرہ، مولوی عبداللہ خاں علوی، مولوی امام بخش صہبائی،
 حکیم مومن خاں مومن، نواب مصطفیٰ خاں حسرتی، نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر، سید علام علیا
 رحمت وغیرہم ہیں۔ درحقیقت ان لوگوں کا مرزا کے عصر میں موجود ہونا انکی شاعری کے حق میں
 بعینہ ایسا تھا جیسا عرفی و نظیری کے حق میں خانخاناں، ابوالفتح، فیضی، اور ابوالفضل کا انکے
 زمانے میں ہونا۔

اگرچہ ان بزرگواروں میں بعض اصحاب ایسے بھی تھے جو ظاہر مرزا کی شاعری کو تسلیم نہیں کرتے تھے،

مرزا کی فارسی شاعری اور فارسی انشا پر دوازی کے متعلق یہ بات قابل غور ہے کہ وہ کیا اسباب تھے جنہوں نے پچاس برس تک مرزا کو ایک ایسے فن کی نگہیں اور انہیں ترقی کرنے کے مستعد و سرگرم رکھا جسکا زمانے میں کوئی قدر دان نہ تھا۔ ان کے مدوح زیادہ تر انگلش گورنمنٹ کے ارکان و اعیان تھے۔ جو فارسی زبان اور خاص کر فارسی شاعری سے محض اجنبی تھے، یا بادشاہ اور سلاطین و امرا و رؤسا تھے۔ جبکہ مرزا کے فارسی قصیدے پڑھنے اور سمجھنے کی نہ فرصت تھی نہ ضرورت۔ وہ شخص۔ جسکا قصیدہ انوری و خاقانی کے قصیدوں سے مل کر کھائے، جسکی غزل عنی و طالع کی غزل سے سبقت لیجائے، جو رباعی میں عمر خیام کی آوازیں آواز ملائے اور جس کی نثر کے آگے ابوالفضل اور ظہوری کی نثریں پھیلکی اور بے مزہ معلوم ہوں۔ اسکو بہادر شاہ کی سرکار سے صرف پچاس روپیہ ماہوار ملتا تھا، اور وہ بھی چھ سات برس سے زیادہ نہیں ملا۔ گورنمنٹ کے ارکان و اعیان کی مح کے جلد و میں مرزا کو اس خلعت کے سوا کبھی کچھ نہیں مرحمت ہوا جو نور افروخت ہو کر سرکاری چپراسیوں کے انعام میں صرف ہو جاتا تھا۔

مرزا کے ماننے والے اور ان کے فارسی کلام پر ایمان بالغیب کھنے والے بلاشبہ ملک میں بشیار تھے، مگر ایسے خوش اعتقادوں کی کثرت اور انکی تحسین و آفرین سے شاعر کا دل ہرگز نہیں بڑھ سکتا۔ پس جبکہ مدوحوں کی قدر دانی کا وہ حال ہو، اور مدحین کی مدح سرائی کا یہ رنگ، تو پھر وہ کیا چیز سمجھتی جسکو مرزا کی مہلی اور حقیقی ترقی کا باعث قرار دیا جائے۔ بات یہ ہے کہ شاعر کے دل میں مہلی ترقی کا دلولہ نہ سلاطین و امرا کی داد و دہش سے پیدا ہو سکتا ہے اور نہ خوش اعتقادوں و شاگردوں کی مانگوں کی کثرت سے، بلکہ اس کا دل بڑھانے والی صرف دو چیزیں ہیں۔ جو خواہی نخواہی اسکو ترقی کرنے پر

لیکن جس طرز پر تمام ممتاز و نامور شعرا میں خاص خاص مضامین کے ساتھ زیادہ مناسبت
 دیکھی گئی ہے۔ اسی طرح مرزا بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہ تھے۔ تصوف، حبیب اللہیت، فخر، شوخی،
 اخلاقت، دردمندی و مہربانی، بیان رنج و مصیبت و زکات و زارنالی، انظار محبت و مہر و دی،
 حسن طلب و یہ چند جذبہ ان ایسے تھے جنکا بیان مرزا کے تمام اصناف سخن میں اکثر نہایت
 لطیف و وسیع و مرقع ہوا ہے۔ بیشک یہ بات ان کے عشقیہ مضامین اور اخلاق و موعظت کے
 بیانات میں عام طور پر نہیں پائی جاتی؛ کیونکہ عشق و محبت اور تمام تعلقات و معاملات عاشق و معشوق
 کا بیان۔ ہمیشہ اظہار ہے۔ محسن و نیکوچل سادگی اور بے تکلفی پاتا ہے اور شاعرانہ صنعت سے۔
 جسکو مرزا نے چاہی شاعری کے نقطہ سے تعبیر کیا ہے۔ ابا کرتا ہے۔ بر خلاف اسکے مرزا اصناف
 کلام میں اپنی صانع شاعری کا سرشتہ ہر سے چھوڑنا نہیں چاہتے تھے (الامامہ اللہ) اسی لئے
 ان کے عاشقانہ اشعار میں باوجود کمال جزالت اور منانیت کے وہ گرمی اور تاثیر جو شعر کی جان
 اور نغز کا ایمان ہے عام طور پر نہیں پائی جاتی۔ اخلاق و موعظت کا بیان بھی اسی لئے
 موثر اور دل آویز نہیں ہے کہ وہ جب تک نہایت سادہ اور عوامانہ تعلقات سے پاک نہ ہو دلوں
 میں گھر نہیں کر سکتا۔ مگر اس سے مرزا کی استاد میں کچھ فرق نہیں آتا جب سعدی کی رزم کی نسبت
 کہا جاتا تھا "کراں شیوہ ختم ست بردگراں" اور اسکا قصیدہ بھی بہت پست سمجھا جاتا تھا۔ اور
 باوجود سعدی کی استاد کی کسب نے تسلیم کیا۔ تو مرزا کے خاص قسم کے بیانات کی نسبت ایسا کہنے
 سے مرزا کی استاد میں کیونکر فرق آسکتا ہے۔ یہ میراں جو پہنے مرزا کے کلام کی نسبت بتاتی ہے
 اسکو ان کے کلیات نظم و نثر میں جانچنا چاہئے؛ نہ انتہائی اشعار میں جو اس کتاب میں درج ہو گئے ہیں

نظم و شرفارسی

فارسی لٹریچر میں ایشیائی مذاق کے موافق جو دستگاہ مرزا نے بہم پہنچائی تھی اور فارسی نظم اور فارسی نثر دونوں میں جو بلند پایہ انھوں نے حاصل کیا تھا۔ اُسکو اس زمانے میں کما حقہ لوگوں کے ذہن نشین کرنا ہماری قدرت سے باہر ہے۔ جبکہ اُس زمانے میں جب بہت سے سخن سنج اور نکتہ پرور موجود تھے۔ مرزا ہمیشہ زمانے کی ناقدرانی کی شکایت کرتے تھے؛ تو اب کیا امید ہو سکتی ہے کہ لوگوں کو انکی قدر جانی جاسکے۔ جسے اگر کچھ ہو سکتا ہے تو صرف اس قدر ہو سکتا ہے کہ انکے ہتم کے کلام میں سے کچھ کچھ بطور نمونے کے پبلک کے سامنے پیش کر دیں؛ اور چونکہ فارسی زبان سے ملک میں عموماً اجنبیت ہو گئی ہے اسلئے جہاں جہاں ضرورت دیکھیں مرزا کے کلام کی شرح بھی کرتے جائیں۔ اس سے شاید یہ فائدہ ہو کہ مرزا کی قوتِ تخیل میں جو غیر معمولی اچک اور پرواز قدرت نے ودیعت کی تھی۔ سمجھ دار آدمی اُسکا کسی قدر اندازہ کر سکیں؛ لیکن زبان اور بیان کی خوبی جو ایک وجدانی چیز ہے اور جسکے تقاد اور جوہری ملک میں کم یاب بلکہ نایاب ہیں۔ اسکی نسبت صرف مرزا کا یہ فصیح و بلیغ شعر لکھ دینا کافی معلوم ہوتا ہے۔

بیاورید گرایں جا بود زباندے
غریب شہر سخن ہا کے گفتنی وارد

البتہ ایک مختصر مرزا کے متعلق یہاں بتا دینا ضرور ہے جو انکا کلام دیکھتے وقت یاد رکھنا چاہئے۔

اگرچہ مرزا کو فارسی زبان میں (خواہ نظم ہو خواہ نثر) ہر قسم کے مضامین بیان کرنے پر ایسی ہی قدرت حاصل تھی جیسی کہ ایران کے ایک بڑے سے بڑے مشائخ و ماہر و مسلم الثبوت استاد کو ہونی چاہئے؛

استیلا بر وہم کے مشابہہ وحدت ذات سے محروم رہے جاتے ہیں؛ ہر جذبہ انکو سمجھائیں گے،
 راہ پر نہ آئیں گے۔ ناچار اشتغال وادکار وضع کئے تا قوت تحصیلہ انہیں اُلجھی رہے اور رفتہ رفتہ بخودی
 طاری ہو جاوے۔ وحدت وجود اس طرح کی بات تو نہیں کہ نہواور ہم اسکو پیر یا تہ بکلفت ثابت
 کیا چاہتے ہوں۔ دانی ہمہ اوست ورنہ دانی ہمہ اوست۔

وہم صورت گری اور پیکر تراشی کر رہا ہے اور معدومات کو موجود سمجھ رہا ہے پس جب وہ ہم مشغول و ذکر
 کی طرف مشغول ہو گیا بے شبہ اپنے کام سے معنی صورت گری اور پیکر تراشی سے مغزول ہو گیا۔
 بخیر اور بخودی چھا گئی اور وہ کیفیت جو متحدین کو بحیرہ فہم حاصل ہوتی ہے اس شاعر کے
 نفس کو بخودی میں آگئی۔ ایک ذریعہ میں جان کر کودا؛ ایک کو کسی نے غافل کر کے ڈھکیل جان۔
 انجام دونو کا ایک ہے وہ لوگ جو وحدت وجود کو سمجھ لیں یہ میں نہیں کہتا کہ نہیں ہیں؛ مگر اے
 کم ہیں، اور مخفی ہیں، اور کہیں کہیں ہیں۔ اور ایسے نفوس کہ جو کسب حالت بخودی کے واسطے
 محتاج اشتغال وادکار ہیں؛ بہت ہیں بلکہ بے شمار ہیں۔“

کہ ولایت بنی کی وہ وجہ الی الحق ہے افضل ہے نبوت سے کہ وہ وجہ الی الخلق ہے۔ نہ یہ کہ ولایت عام
افضل ہے نبوت خاص سے۔ جس طرح نبی مستفیض ہے حضرت الوہیت سے اسی طرح ولی
مستنیر ہے انوار نبوت سے۔ مستنیر کی تفصیل منیر پر اور مستفیض کو ترجیح مفیض پر ہرگز معقول اور
عقلا کے نزدیک مقبول نہیں۔ اب وہ ولایت کہ خاصہ بنی تھا نبوت کے ساتھ منقطع ہو گئی مگر وہ
فروع کہ اخذ کیا گیا ہے مشکوٰۃ نبوت سے ہنوز باقی ہے نقل و تحویل ہوتی چلی آتی ہے اور چراغ سے
چراغ جلتا چلا جاتا ہے۔ اور یہ سراج ایزدی تا صبح ظہور قیامت روشن رہیگا۔ اور اب اسی کا نام
ولایت اور یہی مشعل طریق ہدایت ہے۔ ولایت و ہدایت وہی حقیقت توحید ذاتی ہے کہ جو ارشاد
کلمہ لا الہ الا اللہ مشہور و عیون اعیان اُمت اور منظور نظر اکابر ملت ہوئی ہے۔ مگر وہ بات اب
کہاں کہ ایک بار لا الہ الا اللہ کہے اور دل نور معرفت سے منور ہو جاوے۔ اور وہ ضامن نرسبت
کہاں کہ قائل لا الہ الا اللہ کو اگرچہ اسکے معنی اچھی طرح نہ سمجھا ہو قد مگاہ توحید پر قائم کر دے، یعنی
رسول مقبول واجب التعظیم قائل انا احمد بلایم علیہ التیمۃ والتسلیم۔ اب سعادت بقدر ارادت ہے
اور راحت بعد جرات۔ سچ بھی تو ہے؛ آدمی کیونکر سمجھ سکے اور بطلان بدیہیات کے جو ذریعہ
اسکو کمزور تسلی ہو؛ یعنی اس مجموع موجودات کو کہ افلاک و انجم و بحار و جبال اسی میں ہیں نیست بود
محض جان لے اور تمام عالم کو ایک وجود مان لے۔

اے کردہ بہ آرائش گفتار بسیج در زلف سخن کشودہ راہِ خم و تیج

عالم کہ تو چیز دیگرش سے دانی ذاتیت بسیطہ منبسطہ دیگر بسیج

جب اولیاء اللہ نے۔ کہ وہ اظہار روحانی ہیں۔ دیکھا کہ نفوس بشری پر عزم غالب ہے اور سبب

عنوان پر لکھا ہے "لا توثقوا بالوجود الا اللہ" اور خط میں مندرج ہے "ولا موجود الا اللہ" اور اس خط کا لائن والا اور اس راز کا بتانے والا وہ نامہ اور نام اور ہے کہ جبر سالت ختم ہوئی، ختم نبوت کی حقیقت اور اس معنی غامض کی صورت یہ ہے کہ مراتب توحید چار ہیں؛ انسانی، اخلاقی، معنوی، ذاتی۔ انبیاء مشیخ معلوت اللہ علی نبینا وعلیم انلان مارج سہ گانہ پر امور تھے۔ خاتم الانبیا کو حکم ہوا کہ تجاہل تعینات اعتباری، تمناویں؛ اور حقیقت نیرانی ذات کو صورت الان کا کان میں لکھا دیں۔ اب گنجینہ معرفت خواص امت محمدی کا سینہ ہے؛ اور کلمہ لا الہ الا اللہ مفتاح باب گنجینہ ہے۔ نہ یہ عائدہ مؤمنین کہ وہ اس کلام سے صرف نفی شرک فی العبادۃ مراد لیتے ہیں اور نفی شرک فی الوجود جو اصل معتقد ہے انکی نظر میں نہیں۔ مگر جب لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہیں گے اسی توحید ذاتی کے عقائد کی تہ تک پہنچا رہے ہیں گئے یعنی ہماری اس کلمے سے وہ مراد ہے جو خاتم الرسل کا مقصود تھا۔ یہی حقیقت ہے شفاعت محمدی کی۔ اور یہی معنی ہیں رتہ للعالمین ہونے کے، اور اسی مقام سے ناشی ہے یہے روح افزاے "من قال لا الہ الا اللہ دخل الجنة"۔

تکلم اگرچہ دیکھنے میں دو زبان ہے لیکن وحدت حقیقی کا راز داں ہے۔ گفتگوی توحید میں وہ لذت ہے کہ جی چاہتا ہے کوئی تبارک کے اور تبارک سے، نبی کی حقیقت ذو جہتین ہے۔ ایک جہت خالق کہ جس سے اخذ فیض کرتا ہے اور ایک جہت خلق کہ جس سے فیض پہنچاتا ہے۔

بنی را دو وجہ است دلجوے خلق یکے سوی خالق یکے سوی خلق

بداں وجہ از حق بود مستفیض بدیں وجہ بر خلق با شد مفیض

یہ جو صوفیہ کا قول ہے کہ در الولاية افضل من النبوة،، معنی اسکے صاف اور از دے انصاف ہیں

مرزائے چند تقریظیں اور دیباچے بھی اردو زبان میں لکھے ہیں اور ان سب میں مستحج و مستحق عبارت لکھنے کا التزام کیا ہے۔ جو بے تکلفی اور صفائی مرزا کے اردو خطوں میں پائی جاتی ہے وہ ان تقریظوں اور دیباچوں میں نہیں ہے؛ خصوصاً سجع کی رعایت نے اُن میں آورد اور تصنع کا رنگ بیاہ پیدا کر دیا ہے۔ لیکن مرزا کو آسمیں معذور سمجھنا چاہئے؛ جو لوگ تقریظوں اور دیباچوں کی فرمائش کرتے تھے وہ بغیر ان تحفہاتِ بارزہ کے ہرگز خوش ہونے والے نہ تھے۔ جو طریقہ اس زمانے میں رپو لکھنے کا نکلا ہے اسکو اب بھی بہت کم لوگ پسند کرتے ہیں اور مرزا کے وقت میں تو اسکا کہیں نام و نشان بھی تھا۔! اینہم انہیں سے بعض نثریں مرزا کی روش خاص میں نہایت ممتاز ہیں خصوصاً وہ دیباچے جو انھوں نے مفتی میر لال صاحب کی کتاب سراج المعرفۃ پر لکھا ہے اُس میں جس خوبی اور ثنات سے تصوف کے اعلیٰ خیالات ظاہر کئے ہیں اُسکے لحاظ سے کہا جاسکتا ہے کہ اردو زبان میں تصوف کے اعلیٰ خیالات نہ اس سے پہلے اور نہ اُسکے بعد ایسی عمدہ نثریں کسی نے نہیں لکھے۔

کتاب سراج المعرفۃ جس پر مرزائے دیباچہ لکھا ہے۔ اس میں مفتی میر لال نے مرحوم بہادر شاہ کے ایمان سے تمام اشغال وادکار جو آنحضرت کے زمانے سے اسوقت تک سینہ بسینہ بسفینہ چلے آئے تھے۔ ایک جگہ جمع کئے تھے۔ مرزائے اپنے دیباچے میں دکھایا ہے کہ ان اشغال وادکار کو معرفتِ الہی میں کیا دخل ہے؛ اور کیونکر انکے ذریعے سے توحید و جود ہی تک سالک کی رسانی ہو سکتی ہے؛ دیباچہ مذکور کا اول و آخر کا حصہ چھوڑ کر صرف وہ مقام جس میں مرزائے مذکورہ بالا مقصد کو بیان کیا ہے یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

مرزا لکھتے ہیں کہ دو حق دیں ہیں کہ حقیقتِ از رو سے مثال ایک نام نہ در ہم عجیب یہ سر سبز ہے کہ جسکے

اُن خطوں میں لکھتے تھے۔ جن سے ہنسی باظرافت اور مخاطب کا خوش کرنا مقصود ہوتا تھا ورنہ واقعات کا بیان یا مصائب کا ذکر یا تعزیت یا ہمدردی کا اظہار ہمیشہ سیدھی سادھی شریعی میں کرتے تھے مثلاً سید یوسف مرزا کو اُن کے باپ کی تعزیت میں لکھتے ہیں

یوسف مرزا کیونکر تجھ کو لکھوں کہ تیرا باپ مرگیا اور اگر لکھوں تو آگے کیا لکھوں کہ اب کیا کر دو مگر صبر یہ ایک شیوہ فرسودہ اپنا سے روزگار ہے۔ تعزیت یوں ہی کیا کرتے ہیں اور یہی کہا کرتے ہیں صبر کرو۔ ہاں! ایک کا کلیجہ کٹ گیا ہے اور لوگ اُسے کہتے ہیں کہ تو نہ ٹرپ بھلا کیونکر نہ ٹرپے گا۔ صلاح اس امر میں نہیں بتائی جاتی۔ دعا کو دخل نہیں۔ دوا کا لگاؤ نہیں۔ پہلے بیٹا مرا۔ پھر باپ مرا۔ تجھ سے اگر کوئی پوچھے کہ بے سرو پا کس کو کہتے ہیں تو میں کہوں گا یوسف مرزا کو۔ تمھاری وادی لکھتی ہیں کہ زمانہ کا حکم ہو چکا تھا۔ اگر یہ بات سچ ہے تو جو امزد ایک بار دو نو قیدوں سے چھوٹ گیا؛ نہ قید حیات رہی، نہ قید فرنگ۔

انھیں کو بیٹے کی تعزیت اس طرح لکھتے ہیں ”اے میری جان! اے میری آنکھو!

”ہجرانِ طفلے کو در خاک رفت چہ نالی کہ پاک آمد و پاک رفت

وہ خدا کا مقبول بندہ تھا۔ وہ اچھی رُوح اور اچھی قسمت لیکر آیا تھا۔ یہاں رہ کر کیا کرتا؟ ہرگز غم نہ کرو۔ اور اگر ایسی ہی اولاد کی خوشی ہے تو ابھی تم خود تجھے ہو خدا تم کو جیتا رکھے؛ اولاد بہت۔ نانا، نانی کے مرنے کا ذکر کیوں کرتے ہو وہ اپنی اجل سے مرے ہیں۔ بزرگوں کا مرنا بنی آدم کی میراث ہے۔ کیا تم یہ چاہتے تھے کہ وہ اس عہد میں ہوتے اور اپنی ابرو کھوتے۔ بان مظفر الدولہ کا غم منجملہ واقعات کر بلائے معلّے ہے۔ یہ داغ جیتے جی نہ بیٹے گا۔

دہم ہے مگر میں ابھی اسی پائے پر ہوں۔ شاید آگے بڑھ کر یہ پردہ بھی اٹھ جائے؛ اور وجہ نشیت اور صحت و راحت سے بھی گزر جاؤں۔ عالم بی رنگی میں گزرا پاؤں۔ جس شائے میں نہیں ہوں وہاں کام عالم بلکہ دو تو عالم کا پتا نہیں۔ ہر کسی کا جواب مطابق سوال کے دئے جاتا ہوں۔ یہ دریا نہیں ہے سراب ہے۔ ہستی نہیں ہے پندار ہے۔ ہم تم دو تو اچھے خاصے شاعر ہیں۔ مانا کہ سعدی و حافظ کے برابر مشہور ہوئے انکو شہرت سے کیا حاصل ہوا کہ ہکو تھکو ہو گا،

مرزا نے بعض اردو خطوں میں اور خاصہ اردو تقریظوں میں مستحج عبارت لکھنے کا التزام کیا ہے۔ اگرچہ اس زمانے میں ایسا التزام تحفیات بارود میں شمار کیا جاتا ہے خصوصاً اردو جو بمقابلہ عربی یا سنسکرت وغیرہ کے ایک نہایت محدود زبان ہے وہ اس قسم کے تصنع اور ساختگی کی تحمل نہیں معلوم ہوتی مگر مرزا نے جس قسم کی مستحج عبارت اردو خطوں یا تقریظوں وغیرہ میں لکھی ہے اُس پر گرفت شکل سے ہو سکتی ہے۔ عربی اور سنسکرت زبان کے سوا اردو زبانوں کی مستحج نثروں میں عموماً عیب ہوتا ہے کہ دوسرے فقرے میں جو پہلے فقرے کی رعایت سے خواہ مخواہ قافیہ تلاش کرنا پڑتا ہے تو اسے تصنع اور آرد و کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے اور اس لئے پہلے فقرے کے مقابلے میں دوسرا فقرہ سبب لزوم بالایلزام کے کم وزن ہو جاتا ہے مگر مرزا کی مستحج نثر میں یہ بات بہت کم دیکھی جاتی ہے دوسرے فقرے میں تقریباً ویسی ہی جتنے کلفی پائی جاتی ہے جیسی پہلے فقرے میں اور یہ بات اسی شخص سے بن پڑتی ہے جو یاد و جو خوش سلیقگی اور لطف طبیعت کے شاعری میں غایت درجے کا کمال رکھتا ہو اور وزن قافیہ کی جانچ اور تول میں ایک عمر بسر کر چکا ہو۔ یہاں اسکی مثالیں لکھنے کی کچھ ضرورت نہیں ہے۔ مرزا کے اردو رقعات میں اسکی مثالیں بکثرت موجود ہیں مگر یہ معلوم رہے کہ معنی عبارت مرزا خاصہ

بیک بینی و دو گوش بھرت پور چلے گئے۔ حینار الدولہ کی پانسو روپیہ کراکے کی املاک و اگذاشت ہو کر
 پھر قرق ہو گئی؛ تباہ و خراب لاہور گیا؛ وہاں پڑا ہوا ہے؛ دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ قصہ کوتاہ قلعہ اور
 جھڑ اور بہادر گڑھ اور بلیجہ گڑھ اور فرخ نگر کم و بیش تیس لاکھ کی ریاستیں مٹ گئیں۔ شہر کی اماں
 خاک میں مل گئیں نہ منہ آدمی یہاں کیوں پایا جائے۔ جو حکما کا حال کل لکھا ہے وہ بیان واقع
 ہے۔ صلحا اور زبانا کے باب میں جو حرف مخفی نہ لکھا ہے اسکو بھی سچ جانو،

بعض خطوں میں یاس و حسرت و افسردگی اور دنیا کی بے ثباتی و بے اعتباری کا بیان نہایت
 متوتر طریقے میں کیا ہے جس سے انکے خیالات معلوم ہوتے ہیں مثلاً

ایک خط میں لکھتے ہیں دنیا توانی زور پر ہے۔ بڑھاپے نے نکلا کر دیا ہے۔ ضنعت، ہستی، کمالی، گرانما
 رکاب میں پاؤ ہے۔ ناگ پر ہاتھ ہے۔ بڑا سفر دور دراز درپیش ہے۔ زاد راہ موجود نہیں۔ خالی
 ہاتھ جاتا ہوں۔ اگر نا پر سیدہ بخش دیا تو خیر؛ اور اگر باز پرس ہوئی تو سفر مقرر ہے اور ہادیہ زاد ہے۔
 دوزخ جا دید ہے اور ہم ہیں۔ ہمارے کسی کا کیا اچھا شعر ہے

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیگے مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیگے

ایک دوسری خط میں منشی ہر گوبال کو لکھتے ہیں درتم مشق سخن کر رہے ہو ادب میں مشق بنائیں مستغرق
 ہوں۔ بوعلی سینا کے علم اور نظیری کے شعر کو ضائع اور بے فائدہ اور مہموم جانتا ہوں زبانت کر کے
 کو کچھ تھوڑی سی راحت درکار ہے اور باقی حکمت اور سلطنت اور شاعری اور ساحری سب خرافات ہے۔
 ہندوؤں میں اگر کوئی اوتار ہوا تو کیا اور مسلمانوں میں نبی بنا تو کیا۔ دنیا میں نام آور ہوئے تو کیا اور
 گناہ منجے تو کیا۔ کچھ معاش ہو اور کچھ محبت جسمانی؛ باقی سب وہم ہے۔ اسے یاد جانی۔ ہر چند دیکھی

پھر دوسرا جنم لکھو ملا۔ اگرچہ صورت اس جنم کی بعینہ مثل پہلے جنم کے ہے؛ یعنی ایک خطائیں نے منشی
 بنی بخش صاحب کو بھیجا۔ اسکا جواب مجھ کو آیا۔ اور ایک خط تمہارا کہ تم بھی موسوم بہ منشی ہو گواہی تخلص
 بہ نقض ہو آج آیا۔ اور میں جس شہر میں ہوں اسکا نام بھی دلی اور اس محلے کا نام بھی پتی ماروں کا محلہ ہے
 لیکن ایک دوست اس جنم کے دوستوں میں سے نہیں پایا جاتا۔ واللہ ڈھونڈنے کو مسلمان اس شہر
 میں نہیں ملتا۔ کیا امیر، کیا غریب، کیا اہل حرفہ؛ اگر کچھ میں تو باہر کے ہیں۔ ہنود البتہ کچھ کچھ آباد ہو گئے ہیں
 ایک خط میں نواب علاؤ الدین خاں کو لکھتے ہیں ”دکھل تمہارے خط میں دوبار یہ کلمہ مرقوم دیکھا کہ دلی
 بڑا شہر ہے؛ ہر قسم کے آدمی وہاں بہت ہونگے۔ اے میری جان یہ وہ دلی نہیں ہے جس میں تم پیدا ہو
 ہو، وہ دلی نہیں ہے جس میں تم نے علم تحصیل کیا ہے، وہ دلی نہیں ہے جس میں تم شیخان بیگ کی محلی
 میں مجھ سے پڑھنے آتے تھے، وہ دلی نہیں ہے جس میں سات برس کی عمر سے آتا جاتا ہوں، وہ دلی نہیں
 ہے جس میں اکیاون برس سے مقیم ہوں؛ ایک کپ ہے جس میں مسلمان اہل حرفہ یا حکام کے شاگرد پیشہ
 باقی سراسر ہنود۔ بادشاہ کے ذکر جو بقیۃ السیف میں وہ پانچ پانچ روپے مہینا پاتے ہیں + + +
 امرای اہل اللہ میں اموات گنہ تو حسن علی خاں بہت بڑے باپ کا بیٹا ستورو پیہ روز کا نیشن دار۔ ستورو پیہ
 مہینے کا روزینہ دار نیکر نامرادانہ مر گیا۔ میر ناصر الدین باپ کی طرف سے پیرزادہ نانا اور زانی کی طرف
 سے امیرزادہ مظلوم مارا گیا۔ آغا سلطان بخشی محمد علی خاں کا بیٹا جو خود بھی بخشی ہو چکا ہے عیار پڑا
 نہ دوانہ غذا؛ انجام کا مر گیا۔ تمہارے چچا کی سرکار سے تجھیز و تکفین ہوئی۔ اچھا کہ پوچھو تو ناظر حسین زنا
 جسکا بڑا بھائی مقتولوں میں آیا اس کے پاس ایک پیسا نہیں، ٹکے کی آمد نہیں، مکان اگرچہ رہنے کو
 مل گیا ہے مگر دیکھئے چھٹا رہے یا ضبط ہو جائے۔ پڑھے صاحب ساری اطلاق سچ کر اور روشن جان کے

شرف الدولہ اور فخر الدولہ کی جگہ ہو، میں لم یلد ولم یولد ہوں۔

مزا قربان علی بیگ سالک کو خط میں لکھتے ہیں ”یہاں خدا سے بھی توقع نہیں، مخلوق کا کیا ذکر۔ کچھ بن نہیں آتی؛ اپنا آپ تماشائی بن گیا ہوں۔ بیچ و ذلت سے خوش ہوا ہوں؛ یعنی میں نے اپنے کو اپنا غیر تصور کر لیا ہے۔ جو دکھ مجھے پہنچتا ہے کتا ہوں کہ لو غالب کے ایک اور جوتی لگی۔ بہت اتر آتا تھا کہ میں بڑا شاعر اور فارسی داں ہوں۔ آج دور دور تک میرا جواب نہیں۔ لے اب تو قرضداروں کو جواب دے بیچ تو یوں ہے کہ غالب کیا مڑا بڑا الحمد مراد بڑا کا فرما۔ ہم نے ارزاہ تعظیم (جیسا بادشاہوں کو بعد انکے جنت آرام گاہ و عرش نشین خطاب دیتے ہیں) چونکہ یہ اپنے کو شاہ قلم و سخن جانتا تھا۔ مستقر اور باوید زاویہ خطاب تجویز کر رکھا ہے۔ آئے نجم الدولہ بہادر!!! ایک قرضدار کا گریبان میں تھا، ایک قرضدار بھوک سنا رہا ہے۔ میں ان سے پوچھ رہا ہوں ”اجی حضرت نواب صاحب! نواب صاحب کیسے اور غلام صاحب! آپ سلجوتی اور انفراسیابی ہیں؛ یہ کیا بھرتی ہو رہی ہے؟ کچھ تو اگسو، کچھ تو بولو، بولے کیا بجیا، بے عزت؟ کوٹھی سے شراب، گندھی سے گلاب، بزار سے کپڑا، میوہ فروش سے آم، صراف سے دام؛ قرض لئے جاتا ہے یہ بھی تو سوچنا ہوتا کہاں سے دو لگا،“

فتح دہلی کے بعد جو شہر میں سناٹا ہو گیا ہے اسکی کیفیت ایک خط میں منشی ہر گوبال تفتہ کو اسطرح لکھتے ہیں ”صاحب تم جانتے ہو کہ یہ معاملہ کیا ہے اور کیا واقع ہوا؟ وہ ایک جنم تھا کہ جس میں ہم تم باہم دوست تھے اور طرح طرح کے ہم میں تم میں معاملات مہر و محبت و پیش آئے۔ شعر کہے، دیوان جمع کئے، اسی زمانے میں ایک اور بزرگ تھے کہ وہ ہمارے تمہارے دوست تھے اور منشی بنی بخش انکا نام اور حقیر تخلص تھا۔ ناگاہ نہ وہ زمانہ رہا، نہ وہ اشخاص، نہ وہ معاملات، نہ وہ اختلاط، نہ وہ انبساط؛ بعد چند

سانپ پھر جاتا ہے۔ ہاں مجھ کو رشتہ کیا اور میں نے خونِ جاگر گھایا تو اس بات پر کہ ڈاڑھی لکھی ہوئی ہے۔ وہ فرے یاد آ گئے۔ کیا کہوں جی پر کیا گزری؟ بقول شیخ علی حزیں

”تا دسترسم بود ز دم چاک گریاں شرمندگی از حسرت و پشیمند دارم“

”جب ڈاڑھی موچھیں بال سفید آ گئے؛ تیسرے دن چوٹی کے اندھے گالوں پر نظر آنے لگے؛ اس پر ہلکے ہو کر اس کے دوا دانت ٹوٹ گئے؛ ناچار سستی بھی چھوڑ دی اور ڈاڑھی بھی۔ مگر یاد رکھئے کہ اس بھونڈے شہر میں ایک وردی ہے عام؛ ملا حافظ، باطلی، نیچہ بند، دھوبی، سقا، بھٹیوارہ، منڈیر ڈاڑھی سر پر پال۔ فقیر نے جس دن ڈاڑھی لکھی اسی دن سُر منڈایا۔“

الغرض مرزا کے خطوط و رقعات میں ایسے خطوط بہت کم نکلیں گے جنہیں اس قسم کی طرافت اور ہنسی کی باتیں مندرجہ ذیل یہاں تک کہ بچ و افسردگی کا بیان بھی اس قسم کی چھیڑ سے خالی نہیں تھا۔ منشی نبی بخش مرحوم کو لکھتے ہیں ”د بھائی صاحب! میں بھی تمہارا ہمدرد ہو گیا؛ یعنی ننگل کے دن ۱۸۔ بیج الاول کو شام کے وقت میری وہ پٹھی۔ کہ میں نے بچپن سے آج تک اسکو ماں سمجھا تھا اور وہ بھی مجھ کو بیٹا سمجھتی تھی۔ مگر اب آپ کو معلوم رہے کہ پر سوں میرے گویا نوادی مرے؛ تین پٹھیاں، اور تین چچا، اور ایک باپ، اور ایک دادی، اور ایک دادا؛ یعنی اس مرحوم کے ہونے سے جس جاتا تھا کہ یہ نوادی زندہ ہیں اور اس کے مرنے سے مینے جانا کہ یہ نوادی آج ایک بار مر گئے۔“

ایک ایسی ہی افسردہ تحریر میں نواب امین الدین خاں کو لکھتے ہیں ”آج تم دونو بھائی اس خانہ میں

۴۴ بیان اس شعر کے لکھنے سے یہ مراد تھی ہے کہ مینک مجھے موقع ملا برابر ڈاڑھی کا حق ادا کرتا رہا یعنی منڈا رہا۔ پس اس میں کسی طرح شرمندہ نہیں ہوں۔“

سیر کرد اور نگاہِ عشقِ مجازی پھیر دے۔ سعدی اگر عاشقی کئی و جوانی بے عشق محمد بس است و آل محمد
اللہ بسوئے ہوس۔

ایک اور خط مرزا صاحب موصوف کو اسی چٹا جان کی تعزیت میں اس طرح لکھا ہے۔ مرزا صاحب !
ہمکو یہ باتیں پسند نہیں جتنے برس کی عمر ہے، بچاس برس عالم رنگ و بو کی سیر کی، ابتدا می شباب
میں ایک مرشدِ کامل نے یہ نصیحت کی تھی کہ ہکو نہ دور و دور منظور نہیں، ہم مانعِ فسق و فجور نہیں، بچیو،
اکھاؤ، مرے زاد و بگریہ دور ہے کہ مصری کی کتھی بنو، شہد کی کتھی نہ بنو۔ سو میرا اس نصیحت پر عمل رہا ہے۔
کسی کے مرنے کا وہ غم کرے جو آپ نہ مرے کیسی اشک افشانی؟ کہاں کی مرثیہ خوانی؟ آزادی کا
تکڑ بجالاؤ، غم نہ کھاؤ۔ اور اگر ایسے ہی اپنی گرفتاری سے خوش ہو تو چٹا جان نہ سہی چٹا جان سہی۔
میں حبِ پشت کا تصور کرتا ہوں اور سچ چاہوں کہ اگر مغفرت ہو گئی اور ایک قہر ملا اور ایک حوصلہ !
اقامتِ جادوانی ہے، اور اسی ایک نکتہ کے ساتھ زندہ گانی ہے، اس تصور سے جی گھبرا رہا ہے، اور
کلیجہ مستح کو آتا ہے۔ ہٹے ہٹے وہ خبرِ اخیرین ہو جائیگی، طبیعت کیوں نہ گھبراگی۔ وہی زمر و دیں کاخ اور
وہی طبل کی ایک شاخ۔ چشمِ بد و دور وہی ایک حور۔ بھائی ہوش میں آؤ کہیں اور دل لگاؤ۔
زبانِ نوکن اسے دوست ہو بسا کہ تقویم پارمینہ نایب بہ کار

مرزا حاتم علی بیگ مہرنے اپنی تصویر مرزا کو بھیجی ہے اسکی رسید اس طرح لکھتے ہیں ”علیہ مبارک
نظر افروز ہوا۔۔۔ تمہارا علیہ دیکھ کر تمہارے کشیدہ قاصت ہونے پر مجھکو رشک نہ آیا کیسواسلے کہ میر تقی
درازی میں انگشتِ ناہ ہے۔ تمہارے گندی رنگ پر رشک نہ آیا کیسواسلے کہ بے بین عبتا تھا تو میرا
رنگ چمنی تھا اور وہ نہ راوگ کی سائیں کیا کرتے تھے۔ اب جو کبھی مجھکو وہ اپنا رنگ یاد آتا ہے تو چٹائی پر

پڑھا دیں۔ پانویٹری سے فگار، ہاتھ ہتھکڑیوں سے زخم دار، شقت مقررہ اور شکل ہو گئی۔ طاقت
 ایک ظلم نازل ہو گئی۔ بے حیا ہوں؛ سال گذشتہ پٹری کو زناویہ زنداں میں چھوڑا مع دونو ہتھکڑیوں کے بھاگا۔
 میرے مراد آباد ہوتا ہوا رام پور پہنچا؛ کچھ دن کم دو مہینے وہاں رہا تھا کہ پھر کراپا آیا۔ اب عہد کیا کہ پھر نہ بھاگنا
 بھاگوں کیا۔ بھاگنے کی طاقت بھی تو نہ رہی۔ حکم رہائی دیکھیے کب صادر ہو؟ ایک ضعیف سا احتمال ہے کہ اس
 ماہ ذی الحجہ میں چھوٹ جاؤں۔ بہر تقدیر بعد رہائی کے تو آدمی سوائے اپنے گھر کے اور کہیں نہیں جاتا۔ مین بعد
 نجات سیدھا عالم ارواح کو چلا جاؤنگا۔ فرخ آں روز کہ از خانہ زندان روم، سوئی شہر خرد ازیش آدمی ہیراں بروم۔
 ایک خط مرزا حاتم علی بیگ مہر کو انکی محبوبہ جنا جان کی تعزیت میں لکھا ہے اسیں لکھتے ہیں وہ آپ کا
 غم فرما رہا ہے۔ یوسف علی خاں غزنیکو پڑھوا دیا۔ انہوں نے جو میرے سامنے اُس مرحومہ کا اور اچکا معاملہ
 بیان کیا یعنی اُسکی اطاعت اور تمھاری اُس سے محبت سخت ملال ہوا۔ سُنو صاحب شعرائیں
 فردوسی اور فقر لیں حسن بھری اور عشاق میں مجنوں یہ تین آدمی تین فن میں سرفراز و پیشوا ہیں۔ شاہ
 کا کمال یہ ہے کہ فردوسی ہو جائے فقیر کی انتہا یہ ہے کہ حسن بھری سے لڑکھائے عاشق کی نمود یہ ہے کہ
 مجنوں کی محطی نصیب ہو۔ لیلی اُسکے سامنے مری تھی تمھاری محبوبہ تمھارے سامنے مری بلکہ تم اُس سے
 بڑھ کر ہوئے کہ لیلی اپنے گھر میں اور تمھاری محشوقہ تمھارے گھر میں مری۔ بھی نخل بچے بھی غصب ہوتے ہیں
 جیسے مرتے ہیں اُسکو مار کھتے ہیں۔ میں بھی نخل بچے ہوں۔ عمر بھر میں ایک ۔۔۔ کو میں نے بھی مار کھا ہوں
 خدا اُن دونو کو بخشے اور ہم تم دونو کو بھی کہ زخم مرگِ دوست کھائے ہوئے ہیں مغفرت کرے۔ چالیس
 سیالیس برس کا یہ واقعہ ہے۔ بالآئکہ یہ کوچہ چھٹ گیا؛ اس فن سے میں ریگانہ محض ہو گیا ہوں؛ لیکن کبھی
 کبھی وہ ادائیں یاد آتی ہیں۔ اُسکا مرنا زندگی بھر نہ بھولوں گا۔ جانتا ہوں کہ تمھارے دل پر کیا گذرتی ہوگی

ترتیم ہم بریں گزرم“ اس اتنی بات اور ہے کہ اباحت اور زندقہ کو مردود اور شراب کو حرام اور اپنے کو عامی سمجھا ہوں۔ اگر مجھ کو دوزخ میں ڈالیں گے تو میرا جلا نام مقصود نہ ہوگا بلکہ میں دوزخ کا ایندھن بنوں گا اور دوزخ کی آج کو تیز کر دینا تاکہ مشرکین نبوت مصطفوی و امامت مرقنوی اسیں جلیں۔۔۔۔۔
 استو! مولوی صاحب نے کئی فاقوں میں ایک شعر حافظ کا حفظ کیا ”چوں پیر شدی حافظ از یکدیگر شو آئخ“
 اور پھر پڑھتے ہو اسکے سامنے کہ اسکی نظم کا دفتر حافظ کے دیوان سے دو چند ہے چند ہے؛ مجموعہ شریعہ اگانہ؛
 اور یہ بھی لحاظ نہیں کرتے کہ ایک شعر حافظ کا ہے اور ہزار شعر اسکے مخالفت ہیں۔

ایک خط میں تعلقات نمانہ داری کی اس طرح شکایت کرتے ہیں ”دستور! عالم دو ہیں؛ ایک عالم اولیٰ اور ایک عالم اب وکل۔ حاکم ان دونوں عالموں کا وہ ایک ہے۔ جو خود فرماتا ہے ”دلمن الملک ایوم“ اور پھر آپ ہی جواب دیتا ہے ”رشد الواعد القمار“ ہر چند قاعدہ عام یہ ہے کہ عالم اب وکل کے مجرم عالم اولیٰ میں سزا پاتے ہیں؛ لیکن یوں بھی ہوا ہے کہ عالم اولیٰ کے گناہگار کو دنیا میں بھیج کر سزا دیتے ہیں۔ چنانچہ میں آٹھویں رجب ۱۲۸۵ھ میں روکاری کے واسطے یہاں بھیجا گیا۔ (یعنی پیدا ہوا) تیرہ برس حوالات میں رہا۔ ساتویں رجب ۱۲۸۵ھ کو میرے واسطے حکم دوام حبس (یعنی نکاح) صادر ہوا۔ ایک بیڑی میرے پانوں میں ڈال دی اور دلی شہر کو زنداں قہر کیا؛ اور مجھے اُس زنداں میں ڈال دیا۔ فکر نظم و شکر و شفقت ستھیرایا۔ برسوں کے بعد میں جلیانے سے بھاگا تین برس بلا و شرفیہ میں پھر رہا۔ پانیاں کار مجھے کلکتے سے پکڑ لائے؛ اور پھر اسی محبس میں بٹھا دیا۔ جب دیکھا کہ یہ قیدی گریزا ہے تو ہتکڑیاں اور

بیڑی سے مراد اہلیہ اور ذہن کو دھوکوں سے مراد حسین علی خاں اور باقر علی خاں جنکو مرزا نے اُنکے والدین العابدین خاں کی وفات کے بعد خود زندوں کی طرح پرورش کیا تھا۔

بی بی جدا، بچے جدا، شاگرد پیشہ جدا، آمد ہی ایک سو باسٹھ؛ تنگ آگیا، گذار مشکل ہو گیا، روزمرہ کا کام بند رہنے لگا، سوچا کہ کیا کروں؟ کہاں سے گنجائش نکالوں؟ قبر درویش بجان درویش صبح کی تبرید متروک، چاشت کا گوشت اُدھار، رات کی شراب و گلاب موقوف، بیس بائیس روپے مہینا بچا، روزمرہ کا خرچ چلا۔ یاروں نے پوچھا تبرید و شراب کب تک نہ پیو گے؟ کہا گیا کہ جب تک وہ نہ پلائیں گے پوچھا کہ نہ پیو گے تو کس طرح جیو گے؟ جواب دیا کہ جس طرح وہ جلائیں گے۔ بارے مہینا پورا نہیں گذرا تھا کہ رامپور سے علاوہ وجہ مقرری کے اور روپیہ آگیا۔ قرض مقسط ادا ہو گیا۔ متفرق رہا؛ خیر ہو۔ صبح کی تبرید، رات کی شراب جاری ہو گئی۔ گوشت پورا آنے لگا۔ چونکہ نجائی نے وجہ موقوفی اور بجالی پوچھی تھی انکو یہ عبارت پڑھا دینا اور حمزہ خاں کو بعد سلام کہنا،

اے بخیر لذت شربِ بدمام ما، دیکھا، ہملوئیں پلاتے ہیں۔ دریہ کے بنیوں کے لونڈوں کو پڑھا کہ مولوی مشہور ہونا اور رسائل ابو حنیفہ کو دیکھنا اور مسائل حنفی و نفاس میں غوطہ مارنا اور ہے؛ اور عرفا کے کلام سے حقیقت حق وحدت وجود کو اپنے دل نشین کرنا اور ہے۔ مشرک وہ ہیں جو وجود کو واجب ممکن نہیں سمجھتے جانتے ہیں۔ مشرک وہ ہیں جو سید کو نبوت میں خاتم المرسلین کا شریک گردانتے ہیں۔ مشرک وہ ہیں جو مسلمانوں کو ابوالائمہ کا ہمسر مانتے ہیں۔ دوزخ اُن لوگوں کے واسطے ہے۔ میں موقعہ خالص اور مومن کامل کو زبان سے لا اَکھ الا اللہ کہتا ہوں؛ اور دل میں لا موجود الا اللہ، لا مقرر فی الوجود الا اللہ سمجھا ہوا ہوں۔ انبیا سب واجب التعظیم اور اپنے اپنے وقت میں سب مفترض الطاعت تھے۔ محمد علیہ السلام پر نبوت ختم ہوئی۔ ختم المرسلین اور رحمۃ للعالمین ہیں۔ مقطع نبوت کا مطلع امت اور امامت نہ اجماعی بلکہ من اللہ ہے اور امام من اللہ علی علیہ السلام ہے ختم حسن ثم حسین اسی طرح تادمی موعود علیہ السلام در تبرید

بیسے تو محبت چاہتے برسی ہے۔

نواب ملاؤ الدین خاں اور ان کے والد نواب امین الدین خاں میں کچھ شکر بخنی ہے۔ باپ دلی آئے ہیں اور بیسے کو بار و بیچوڑ آئے ہیں۔ مرزا نواب ملاؤ الدین خاں کو خط میں لکھتے ہیں، ”دوستا کیا کر نواب امین الدین خاں صاحب نے اپنی کوٹھی میں تزلزل اچال کیا۔ پہر دن رہے ازراہ مہربانی ناگاہ میرے ہاں تشریف آئے۔۔۔ میں نے تھیں بیچا کر دیوں نہیں آئے؛ بجائی صاحب بولے کہ جب میں یہاں آیا تو کوئی وہاں ہی تو ہے۔ اس سے ملاؤ وہ اپنے بیٹے کو بت چاہتے ہیں۔ میں نے کہا اتنا ہی بتنا تم اسکو چاہتے ہو۔ ہنستے لگے۔ نوٹنگ میں نے بٹا ہر اکو تم سے اچھا پایا۔ آگے تم لوگوں کے دینی اور بخش تانیوں کے وہاں؛ اللہ مالک ہے۔“

ایک دفعہ شرت، خواجہات سے تنگ آکر بعضی ضروری خرچ بند کر دئے ہیں یہاں تک کہ شراب پینا بھی چھوڑ دیا ہے۔ نواب ملاؤ الدین خاں نے اپنے والد کے اشارے سے اسکا سبب دریافت کیا ہے اور سوہمی ضرورتوں کی طرف سے بوجہ نصیحت کے مرزا صاحب کو یہ شعر لکھا ہے ”چوں پیر شدی حافظ ازہ میکہ دیریں شواخ اسکا جواب اس طرح لکھتے ہیں ”بجائی کو سلام کہنا اور کہنا کہ صاحب وہ زمانہ نہیں ہے کہ اوپر مستر اداس سے تفرق لیا، اوپر درباری مل کو بنا مارا، ادھر خوب چند عین سگھ کی کوٹھی جا لوتی؛ ہر ایک پاس تنگ مہری موجود، شدہ لگاؤ اور چاؤ نہ مول نہ سورد۔ اس سے بڑھ کر یہ بات کر دئی کا خرچ؛ بالکل بچھٹی کے مسز با اینغمہ کبھی خان نے کچھ دیدیا، کبھی اور سے کچھ دلوادیا، کبھی ماں نے کچھ ارگے سے بھیج دیا۔ بٹیش اور باسٹہ روپے اٹھ آئے کلکٹری کے، سورد روپے رام پور کے؛ قرض دینے والا ایک میرٹھا کا وہ سورد ماہ باہ لیا چاہے، مول میں قسط اسکو دینی پڑے؛ انکم کس جدا، چوکیدار جدا، سورد جدا، مول جدا۔“

ایک دوست کو رمضان میں خط لکھا ہے؛ اُس میں لکھتے ہیں ”دھوپ بہت تیز ہے۔ روزہ رکھتا ہوں؛ مگر روزے کو بہلاتا رہتا ہوں۔ کبھی پانی پی لیا، کبھی حقہ پی لیا، کبھی کوئی ٹکڑا روٹی کا بھی کھا لیا۔ یہاں کے لوگ عجب نرم رکھتے ہیں؛ میں تو روزہ بہلاتا ہوں اور یہ صاحب فرماتے ہیں کہ تو روزہ نہیں رکھتا۔ یہ نہیں سمجھتے کہ روزہ نہ رکھنا اور چیڑ ہے؛ اور روزہ بہلانا اور بات ہے“

جس زمانے میں برہان قاطع پر اعتراض لکھے ہیں اور لوگوں نے مرزا کی سخت مخالفت اور مبالغہ برہان کی حمایت کی ہے ایک خط میں صاحب برہان کا ذکر کرنے کے بعد اُسکی اور اُسکے طرفداروں کی نسبت لکھتے ہیں ”ان فرہنگ لکھنے والوں کا مدار قیاس پر ہے جو اپنے نزدیک صحیح سمجھا وہ لکھ دیا۔ نظامی و سعدی کی لکھی ہوئی کوئی فرہنگ ہو تو ہم اُسکو مانیں؛ ہندیوں کو کیونکر مسلم الثبوت جانیں۔ ایک گائے کا بچہ بزرگ سحر آدمی کی طرح کلام کرنے لگا؛ بنی اسرائیل اُسکو خدا سمجھے“

ایک خط کے آخر میں جو نواب علاؤ الدین خاں کو لکھا ہے۔ لکھتے ہیں ”اُستاد میر جان کو اس آہ سے کہ میر تقی میرؒ کی اُنکی جچی تھیں اور میرؒ جیسے عمر میں چھوٹے ہیں۔ دعا۔ اور اس رُوسے کہ دوست ہیں اور دوستی میں کمی بیشی سن و سال کی رعایت نہیں کرتے۔ سلام۔ اور اس سبب سے کہ اُستاد کہلاتے ہیں۔ بندگی۔ اور اس نظر سے کہ یہ سید ہیں۔ درود۔ اور موافق معنون اس مصلح کے دوسوے اللہ والہ اللہ مافی الوجود، سبحود“

ایک خط میں برسات کی شدت کا ذکر کرتے کرتے لکھتے ہیں ”دیوانخانے کا حال مجلسِ رے سے بدتر ہے میں مرنے سے نہیں ڈرتا؛ نقد ان راحت سے گھبرا گیا ہوں۔ چھت چھلنی ہو گئی ہے؛ ابر دو گھنٹے

سوشل، اور مجھ میں عنانیں کے لوگوں نے دریا بھا دیے ہیں؛ بائیں گرنی اور نودول میں بھی متعدد کتابیں نہایت ممتاز لکھی گئی ہیں؛ باوجود اسکے مرزا کی تحریر خط کتابت کے محدود دائرے میں ملحوظ دیکھیں اور ملاحظہ بیان کے اب بھی اپنا نظیر نہیں رکھتی۔

معلوم ہوتا ہے کہ مرزا خط لکھتے وقت ہمیشہ اس بات کو نصب العین رکھتے تھے کہ خط میں کوئی ایسی بات لکھی جائے کہ مکتوب انہیں اُسکو پڑھ کر محظوظ اور خوش ہو۔ پھر جس رتبے کا مکتوب لیا ہوتا تھا اُسکی سمجھ اور مذاق کے موافق خط میں شوخیاں کرتے تھے۔ مثلاً اپنے ایک دوست کو خط لکھا ہے؛ اُس میں اُن کی رزکی کو جو بچپن میں مرزا کے سامنے آتی تھی اور اب جوان ہو گئی ہے۔ بعد دعا کے لکھتے ہیں ”دیکھو! ابھی اب ہم اگر کول آئے بھی تو تم کو کیوں نہ دیکھیں گے؛ کیا تمہارے ملک میں بھتیجیاں چچا سے پردہ کرتی ہیں؟“ مثلاً نواب امیر الدین احمد خاں کو جواب رئیس لوہارویں۔ اُنکے بچپن کے زمانے میں اُنکے رتبے کا جواب جس میں مرزا کو دادا صاحب لکھا تھا۔ اس طرح لکھتے ہیں ”دوے مردم چشم جہاں بین غالب۔“ پہلے القاب کے معنی سمجھ لو؛ یعنی چشم جہاں میں غالب کی تیلی چشم جہاں میں تمہارا باپ مرزا علاؤ الدین خاں بہادر۔ اور تیلی تم۔ میاں تمہارے دادا تو نواب امین الدین خاں بہادر ہیں؛ میں تو صرف تمہارا دل دادہ ہوں۔

ایک دوست کو دسمبر ۱۸۵۹ء کی اخیر تاریخوں میں خط لکھا ہے اُنھوں نے اُسکا جواب جنوری ۱۸۶۰ء کی پہلی یا دوسری کو لکھ بھیجا اُسکے جواب میں اُنکو اس طرح لکھتے ہیں ”دیکھو صاحب یہ باتیں محسوس نہیں؛ ۱۸۵۹ء کے خط کا جواب ۱۸۵۹ء میں بھیجتے ہو؛ اور فرایہ کہ جب تم سے کہا جائیگا تو یہ کہو گے کہ میں نے دوسرے ہی دن جواب لکھا ہے۔“

ان الفاظ سے یہ دھوکا ہوا ہے کہ مرزا صاحب نے میری نسبت لکھا ہے، اور لطف یہ ہے کہ میں نے جس قدر ان کو سمجھایا کہ یہ خود میری ہی کی نسبت لکھا ہے، میری نسبت نہیں لکھا، اُسی قدر انکو اس بات کا زیادہ خیال ہوا کہ میں انرا کس نفسی کے ایسا کہتا ہوں۔

مغربی طریقے پر جو قصے لکھے جاتے ہیں انہیں اکثر اس قسم کے سوال و جواب ہوتے ہیں جیسے کہ مرزا کی تحریروں میں ہم اوپر دکھا چکے ہیں۔ مگر وہاں ہر سوال و جواب کے سرے پر سائل اور مجیب کا نام یا انکے ناموں کی کوئی علامت لکھ دی جاتی ہے؛ ورنہ یہ نہیں معلوم ہو سکتا کہ سوال کہاں ختم ہوا؟ اور جواب کہاں سے شروع ہوا؟ مرزا ایسے موقع پر سائل و مجیب کا نام نہیں لیتے؛ اور نہ انکے نام کی علامت لکھتے ہیں۔ مگر سوال یا جواب کے ضمن میں ایک ایسا لفظ لے آتے ہیں جس سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ سوال کیا ہے؟ اور جواب کیا؟ شاید قصے یا ناول میں یہ بات نہ چل سکے؛ مگر خطوط میں تو مرزا نے یہ راہ بالکل صاف کر دی ہے۔

مرزا کی طرز تحریر کی جو خصوصیتیں اوپر مذکور ہوئیں یہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ اور لوگ اسکی پیروی نہ کریں۔ مگر وہ چیز جسے ان کے مکاتبات کو ناول اور ڈراما سے زیادہ دلچسپ بنا دیا ہے وہ شوخی تحریر ہے جو اکتساب یا مشق و عمارت یا پیروی و تقلید سے حاصل نہیں ہو سکتی، ہم دیکھتے ہیں کہ بعض لوگوں نے خط کتابت میں مرزا کی روش پر چلنے کا ارادہ کیا ہے؛ اور اپنے مکاتبات کی بنیاد مذکورہ شوخی و طراقت پر رکھنی چاہی ہے۔

مگر انکی اور مرزا کی تحریر میں وہی فرق پایا جاتا ہے جو اصل اور نقل یا روپ اور ہروپ میں ہوتا ہے۔ مرزا کی طبیعت میں شوخی ایسی بھری ہوئی تھی جیسے ستار کے تار میں سر بھرے ہوئے ہوتے ہیں؛ اور قوت تخیل جو شاعری اور طراقت کی خلاق ہے اسکو مرزا کے دماغ کے ساتھ وہی نسبت تھی جو قوت پرداز کو طائر کے ساتھ۔ اگرچہ مرزا کے بعد نثر اردو میں بے انتہا وسعت اور ترقی ہوئی ہے، علمی، اخلاقی، تاریخی

فرز نہیں آپ سے تھا کیا ہونگے۔ بھائی آخر کوئی وجہ تو بتلاؤ کہ تم مجھے خط لکھنے سے کیوں باز رکھتے ہو؟ سبحان اللہ! اسے لو حضرت آپ تو خط نہیں لکھتے اور مجھے فرماتے ہیں کہ تو باز رکھتا ہے۔ اچھا تم باز نہیں رکھتے مگر یہ کہو کہ تم کیوں نہیں چاہتے کہ میں میرہمدی کو خط لکھوں۔ کیا عرض کروں؟ سچ تو یہ ہے کہ جب آپ کا خط جاتا اور وہ پڑھا جاتا تو میں ستنا اور خط اٹھاتا۔ اب جو میں وہاں نہیں ہوں تو نہیں چاہتا کہ آپ کا خط جاوے۔ میں اب تجنبدیہ کو روانہ ہوتا ہوں؛ میری روانگی کے تین دن بعد آپ خط شوق سے لکھنے لگا۔ میاں بیٹھو، ہوش کی خبر لو؛ تمہارے جانے نہ جانے سے مجھے کیا علاقہ؟ میں بوڑھا آدمی بھولا آدمی تمہاری باتوں میں آگیا اور آج تک اُسے خط نہیں لکھا۔ لاجل ولاقہ“ اسکے بعد میرہمدی سے مخاطب ہو کر اصل مطلب لکھتے ہیں۔

”بعضی جگہ مکتوب الیہ کو خطاب کرتے کرتے اُسکو غائب فرض کر لیتے ہیں؛ یہاں تک کہ جو لوگ مرزا کے انداز بیان سے واقف نہیں وہ اُسکو مکتوب الیہ کا غیر سمجھ لیتے ہیں۔ مثلاً میرہمدی کو لکھتے ہیں ”میرہمدی! جیتے ہو۔ آفریں صد ہزار آفریں۔ اردو عبارت لکھنے کا کیا اچھا ڈھنگ پیدا کیا ہے کہ مجھ کو رشک آنے لگا ہے۔ سنو دلی کی تمام مال و متاع و زر و گوہر کی بوٹ پنجاب احاطہ میں گئی ہو یہ طرز عبارت خاص میری دولت تھی؛ سو ایک ظالم پانی پت انفاریوں کے محلے کا رہنے والا ہو گیا۔ مگر میں نے اُسکو کھل کیا؛ اللہ برکت دے“

ظاہر ہے کہ اس عبارت میں ایک ظالم سے مراد خود میرہمدی مجروح ہیں؛ کیونکہ غدر کے بعد وہ پانی پت کے محلہ مذکور میں کئی سال مقیم رہے تھے۔ مگر جو لوگ مرزا کی اکیلی جاہلوں سے ناواقف ہیں وہ غلطی سے اُسکے دوسرے معنی سمجھ جاتے ہیں۔ اکثر لوگوں کو اس خیال سے کہ راقم بھی پانی پت انفاری محلے کا رہنے والا ہے۔

مرزا کی اردو خط و کتابت کا طریقہ فی الواقع سب سے بڑا لاپرواہی ہے۔ نہ مرزا سے پہلے کسی نے خط کتابت میں یہ رنگ اختیار کیا، اور نہ اُس کے بعد کسی سے اُسکی پوری پوری تقلید ہو سکی۔ اُنھوں نے اقباب و آداب کا پڑنا اور فرسودہ طریقہ اور اور بہت سی باتیں جنگو و ترسیلیں نے لوازم نامہ نگاری میں سے قرار دے رکھا تھا مگر حقیقت فضول اور دور از کار تھیں سب اُڑا دیں۔ وہ خط کو کبھی میاں، کبھی بر خوردار، کبھی بھائی صاحب، کبھی ہماراج، کبھی کسی اور مناسب لفظ سے آغاز کرتے ہیں؛ اُس کے بعد مطلب لکھتے ہیں۔ اور اکثر بغیر اس قسم کے الفاظ کے سرے ہی سے مدعا لکھنا شروع کر دیتے ہیں۔ اداے مطالب کا طریقہ بالکل ایسا ہے جیسے دو آدمی بالمشافہ بات چیت یا سوال و جواب کرتے ہیں۔ مثلاً اُنکو یہ لکھنا تھا کہ ”محمد علی بیگ میرے کوٹھے کے نیچے سے گذرا۔“ مینے پوچھا کہ لوہار کی سواریاں روانہ ہو گئیں؟ اُس نے کہا ابھی نہیں ہوئیں۔ میں نے پوچھا کیا آج نہ جائینگے؟ اُس نے کہا آج ضرور جائینگے۔ تیاری ہو رہی ہے، ”اس مطلب کو اُنھوں نے اسطرح ادا کیا ہے ”محمد علی بیگ ادھر سے نکلا۔ بھئی محمد علی بیگ۔ لوہار کی سواریاں روانہ ہو گئیں؟ حضرت ابھی نہیں۔ کیا آج نہ جائینگے؟ آج ضرور جائینگے۔ تیاری ہو رہی ہے۔“

میر محمدی مجروح کو خط لکھا ہے؛ اُس میں لکھنا یہ ہے کہ میر نصاحب آئے اور اُن سے یہ باتیں ہوئیں۔ مگر وہ اس طرح نہیں لکھتے بلکہ اُسکو اسطرح شروع کرتے ہیں ”اے میر نصاحب السلام علیکم۔ حضرت آداب۔ کہو صاحب آج اجازت ہے میر محمدی کے خط کا جواب لکھنے کی؟ حضور میں کیا منع کرتا ہوں؟ مگر میں اپنے ہر خط میں آپ کی طرف سے دعا لکھ دیتا ہوں؛ پھر آپ کیوں تکلیف کریں۔ نہیں نصاحب! اُس کے خط کو آئے ہوئے بہت دن ہوئے ہیں وہ خطا ہوا ہوگا؛ جواب لکھنا ضرور ہے۔ حضرت وہ آپ کے

اُردو شریکِ اشاعت سے ہوئی ہے ویسی نظم اُردو اور نظم فارسی اور نثر فارسی سے نہیں ہوئی۔ اگرچہ لوگ عموماً مرزا کو فارسی کا بہت بُرا شاعر جانتے تھے؛ اور اُنکے اُردو دیوان کو بھی ایک اعلیٰ تر کلام عام اقسام سے بالاتر سمجھتے تھے؛ مگر لوگوں کا ایسا خیال کہ انھیں تقلیدِ آتھانہ تحقیقاً۔ وہ خود اپنے ایک مرتبہ دان اور پایہ شناس دوست کو خط میں لکھتے ہیں ”میرے فارسی قصیدے کہ جنہر بھلا ناز ہے کوئی انکا لطف نہیں اُٹھا تا مگر بطریقِ اذعان کہ یہ شخص فارسی خوب کہتا ہے وادون کماں اور ادراک پایہ یعنی کماں؛ ہارنج ترمیہ (یعنی مہر خیز) کے پائنتاز جزوِ آپکے پاس بھیجے ہیں میری خاطر نہ کیجیے؛ انصاف سے کہئے کہ یہ شکر کیس اور ہے؛ اور پھر اُس نثر کا کوئی مشتاق نہو“ اگرچہ مرزا کی اُردو شریکِ قدر بھی جیسی کہ چاہئے ویسی نہیں ہوئی۔ چنانچہ بعض اوشل تحریروں میں دیکھا گیا کہ اُردو سے معلیٰ اور بوستانِ خیال کی عبارت کو ایک مرتبے میں رکھا گیا ہے؛ لیکن پھر بھی مرزا کی اُردو شریکِ قدر دان بہ نسبتِ اقدردانوں کے ملک میں بہت زیادہ نکلیں گے۔

مرزا کی اُردو نثر میں زیادہ تر خطوط و رقعات ہیں؛ چند تقریظیں اور دیباچے ہیں؛ اور تین مختصر رسالے ہیں۔ جو برہانِ قاطع کے طرفداروں کے جواب میں لکھے ہیں؛ لطائفِ غیبی، تیغِ تیز اور نائزہ غالب۔ اسکے سوا چند اجزا ایک ناتمام قسط کے بھی ہیں۔ جو مرزائے مرنے سے چند روز پہلے لکھنا شروع کیا تھا۔ ان میں سب سے زیادہ دلچسپ اور لطیف انگیزائے خطوط ہیں جن میں سے زیادہ تر اُردو سے معلیٰ میں اور اُس سے کم عودِ ہندی میں جمع کر کے چھپوائے گئے ہیں۔ اور بہت سے خطوط ان دونوں کتابوں کی اشاعت کے بعد دستیاب ہوئے ہیں۔ جواب تک شائع نہیں ہوئے۔ مگر غفر رب بعض احباب کا ارادہ اُنکے چھپوانے کا ہے۔

بادشاہ نے سیم کے بچوں کا سالن بھیجا ہے ؛ اُنکے شکرے میں یہ رباعی لکھی ہے ۔ بڑا فیروزہ جو بھینوی
شکل کا ہوتا ہے وہ سیم کے بیچ سے بہت شاعر ہوتا ہے ۔

نثر اردو

معلوم ہوتا ہے کہ مرزا شمسہ اسماعیلؒ ہمیشہ فارسی میں خط کتابت کرتے تھے ؛ مگر سنہ مذکور میں جبکہ قباچہ نویسی
کی خدمت پر مامور کئے گئے ، اور بہت دن مہر نیر دیک کے لکھنے میں مصروف ہو گئے ؛ اسوقت بظورت انکو اردو
میں خط کتابت کرنی پڑی ہوگی ۔ وہ فارسی نثر میں اور اکثر فارسی خطوط جن میں قوت تہمید کا عمل اور
شاعری کا عنصر نظم سے بھی کسی قدر غالب معلوم ہوتا ہے نہایت کاوش سے لکھتے تھے ۔ پس جب اُنکی
ہمت مہر نیر دیک کی ترتیب انشائیں مصروف تھی ضرور ہے کہ اسوقت انکو فارسی زبان میں خط کتابت
کرنی ۔ اور وہ بھی اپنی طرز خاص میں ۔ شاق معلوم ہونی ہوگی ۔ اسلئے قیاس چاہتا ہے کہ انھوں نے
غالباً شمسہ کے بعد سے اردو زبان میں خط لکھنے شروع کئے ہیں ۔ چنانچہ وہ ایک خط میں لکھتے ہیں کہ
”دربان فارسی میں خطوں کا لکھنا پہلے سے متروک ہے ۔ پیرانہ مری اور ضعف ۔ کے صدموں سے
محنت پڑو ہی اور جگر کا دی کی قوت مجھ میں نہیں رہی حرارت غریبی کو زوال ہے اور یہ حال ہے
مصنحل ہو گئے توے غالب اب عناصر میں اعتدال کہاں“

غالباً اردو زبان میں تحریر اختیار کرنے کو مرزا نے اول اول اپنی شان کے خلاف سمجھا ہوگا ۔
مگر بعض اوقات انسان اپنے جس کام کو حقیر اور کم وزن خیال کرتا ہے وہی اُسکی شہرت اور قبولیت
کا باعث ہو جاتا ہے ۔ جہاں تک دیکھا جاتا ہے مرزا کی عام شہرت ہندوستان میں جس قدر اُنکی

اور لیت و لعل کرتے ہیں۔ ہم اپنے دل میں کہتے ہیں کہ آؤ خدا ہی سے کہیں پھر یہ خیال آتا ہے کہ اللہ اللہ کرو وہ تو آپ ہی صبح و شام کرنے والے ہیں۔ صبح و شام کرنا لیت و لعل کرنے کو کہتے ہیں چوک صبح کو شام کرنا اور شام کو صبح کرنا خدا کا کام ہے تو خدا کی نسبت کہا جاسکتا ہے کہ وہ صبح و شام کرنے والے ہیں۔ مگر شاعر کا اصل مقصود یہی ہے کہ کامروائی میں جیسی لیت و لعل وہاں ہوتی ہے ایسی کہیں نہیں ہوتی کہ اکثر ساری عمر امید ہی میں گزر جاتی ہے اور مطلب حاصل نہیں ہوتا۔

رباعی ۵

سامانِ غم و خواب کہاں سے لاؤں آرام کے اسباب کہاں سے لاؤں
روزہ مرا ایمان ہے غالب لیکن خس خانہ و بر قاب کہاں سے لاؤں
یہ رباعی بھی اُسی قطعہ کے ساتھ جس میں روزے کا مضمون باندھا ہے دربار میں پیش کی گئی تھی۔

رباعی ۶

کہتے ہیں کہ اب وہ فردم آرائش عشاق کی پرش سے اُسے عاری نہیں
جبر ہاتھ کہ ظلم سے اٹھایا ہوگا کیونکر مانوں کہ اُس میں تلوار نہیں
یہ رباعی عاشقانہ ہے اور بالکل نیا مضمون ہے ظلم سے ہاتھ اٹھانا اُس سے دست بردار ہونا اور اسکو ترک کرنا باقی الفاظ کے معنی ظاہر ہیں۔

رباعی ۷

ان ریم کے بیجوں کو کوئی کیا جانے نبیجے ہیں جو ارغماں شہرِ دلانے
گرن کر دیویں گے ہم دعائیں تنو بار فیروزے کی تسبیح کے ہیں یہ دلانے

اَساں کہنے کی کرتے ہیں فرمائش گویم مشکل و گزگویم مشکل
 اس اخیر کے مصرع میں دو معنی پیدا ہو گئے ہیں ایک یہ کہ اگر انکی فرمائش پوری کروں اور اَساں شعر
 کہوں تو یہ مشکل ہے کہ اپنی طبیعت کے اتقنا کے خلاف ہے اور اَساں نہ کہوں تو یہ مشکل ہے کہ وہ بُرا
 مانتے ہیں اور دوسرے لطیف معنی یہ ہیں کہ اس باب میں صاف صاف بات کہتا ہوں تو سنو اور ان کا مل
 کی نافرمانی اور کُند ذہنی ظاہر کرنی پڑتی ہے اور اگر صاف صاف نہ کہوں تو آپ ملزم ٹھہرتا ہوں پس طرح طرح سے

رباعی ۲

بھیجی ہے مجھے جو شاہِ جم جاہ نے دال ہے لطف و عنایتِ شہنشاہ پہ دال
 یہ شاہ پسند دال بے بحث و جدال ہے دولت و دین و دانش و داد کی دال
 یاد شاہ کے ہاں مونگ کی دال پکا کرتی تھی جو یاد شاہ پسند کھلاتی تھی یہ رباعی اُسکے شکر میں لکھی گئی ہے

رباعی ۳

حق شنہ کی بقا سے خلق کو شاد کرے تا شاہ شیوع دانش و داد کرے
 یہ دی جو گئی ہے رشتہ عسمرین گانٹھ ہے صفحہ کہ افزائش اعداد کرے

رباعی ۴

ہم گرچہ بنے سلام کرنے والے کرتے ہیں دزدگ کام کرنے والے
 کہتے ہیں کہیں خدا سے اللہ اللہ !!! وہ آپ ہیں صبح و شام کرنے والے

اس رباعی میں مرزا نے غایت درجہ کی شوخی کی ہے جو بالکل اچھوتی اور نئی طرح کی ہے کہتا ہے
 کہ ہم ہر چند دربار کے باختیار لوگوں کو جھک جھک کر سلام کرتے ہیں مگر وہ ہماری کامروائی میں دزدگ

قطعہ ۴

انفارِ صوم کی کچھ اگر دست گاہ ہو اس شخص کو ضرور ہے روزہ رکھا کر

جس پاس روزہ کھولے کھانے کو کچھ نہ روزہ اگر نہ کھاوے تو ناچار کیا کرے

مرزا ایک خط میں لکھتے ہیں کہ یہ قطعہ بھی رمضان کے مہینے میں پادشاہ کی حضور میں پڑھا گیا تھا جسکو پادشاہ اور تمام مصاحبین جو دربار میں موجود تھے بے اختیار ہنس پڑے۔

قطعہ ۵

سہل تھا سہل دے سخت مشکل آپری مجھ پہ کیا گذر گی اتنے روز حاقین ہوئے

تین دن سہل سے پہلے تین دن سہل کے بعد تین سہل تین تبریریں سب کے دن ہوئے

ایک شعر میں سہل کے ان تمام دنوں کی تفصیل جنہیں حکیم چلنے پھرنے کو منع کرتے ہیں کس عہدگی سے بیان کی ہے یہ قطعہ دربار کی غیر حاضری کے عذر میں لکھا ہے۔

قطعہ ۶

یہ گلیم ہوں لازم ہے میرا نام نہ لے جہاں میں جو کوئی فتح و ظفر کا طالب ہے

ہو انا غلبہ میسر کبھی کسی پر مجھے کہ جو شریک ہو میرا شریک غالب ہے

رباعی

رباعی ۱

شکل ہے زبیں کلام میرا اے دل تن شکے آسے سخنورانِ کامل

۴۔ شریک غالب اس ایک لکھتے ہیں مجاہدہ دے شریکوں سے غالب ہو۔ شریک غالب کے عہد میں جو ظفٹ ہے وہ ظاہر ہے۔

کانوں پر ہاتھ رکھتے ہیں کرتے ہوئے سلام ہے اس سے یہ مراد کہ ہم آشنا نہیں
پادشاہ کے دربار کا یہ داب تھا کہ آپس میں جو وہاں ایک دوسرے کو سلام کرتے تھے تو ہاتھ پر ہاتھ
رکھنے کی جگہ دایاں ہاتھ دائیں کان پر رکھ لیتے تھے۔ چونکہ اردو محاورے میں کانوں پر ہاتھ دھرنے
کے یہ معنی ہیں کہ ہم آشنا نہیں اس لئے مرزا نے اُسکو اس پر رائے میں بیان کیا ہے۔

قطعہ ۳

نہ پوچھ اسکی حقیقت - حضور والا نے مجھے جو بھیجی ہے بیسن کی روغنی روٹی
نہ کھاتے گیوں - نکلتے نہ خلد سے باہر جو کھاتے حضرت آدم یہ بیسنی روٹی
جب پادشاہ کوئی عمدہ چیز پکواتے تھے تو اکثر مصاحبین اور اہل دربار کے لئے بطور اولوش کے
بھیجا کرتے تھے اُسکے شکرے میں کبھی کبھی مرزا کوئی قطعہ یا رباعی پادشاہ کے حضور میں گذراتے
تھے یہ قطعہ بھی اُسی قبیل کا ہے۔

جس وقت چوہدار بادشاہی یہ اولوش لیکر آیا ایک باہر کار بنے والا طالب علم جو مرزا سے کچھ پڑھا کرتا تھا۔
موجود تھا۔ چوہدار کے چلے جانے کے بعد اُسے مرزا سے تعجب ہو کر پوچھا کہ بیسنی روٹی ایسی کیا نادر چیز ہے کہ
پادشاہ کی سرکار سے بطور اولوش کے تقسیم ہوتی ہے؟ مرزا نے کہا ”اُسے احمق اچھا وہ چیز ہے کہ اسنے
اکینے فہم جناب انہی میں فریاد کی تھی کہ دنیا میں مجھے بڑے ظلم ہوتے ہیں، مجھے دلتے ہیں، پیستے ہیں، سبھتے
ہیں، پکاتے ہیں، اور مجھے سیکڑوں کھانے کی خیریں بنا کر کھاتے ہیں۔ جیسا مجھے ظلم ہوتا ہے ایسا
کسی پر نہیں ہوتا۔ وہاں سے حکم ہوا کہ اے چنے تیری خیرا سی میں ہے کہ ہمارے سامنے سے چلا جائے، ورنہ
ہمارا بھی سی جی چاہتا ہے کہ تجھکو کھا جائیں“

سیری تنخواہ جو مستر ہے
 رسم ہے فردے کی چھ ماہی ایک
 اُس کے ملنے کا ہے عجیب منجار
 اور چھ ماہی ہو سال میں بار
 خلق کا ہے اسی چلن یہ دار
 اور رہتی ہے سود کی تکرار
 ہو گیا ہے شریک ہو کار
 شاعر نقر گوے خوش گفتار
 ہے زباں سیری تیغ جو ہر دار
 ہے قلم سیری ابر کو ہر بار
 قلم ہے گرد و نہ مجھ کو پیار
 آپ کا تو کر اور کھاؤں دھار
 تانہو مجھ کو زندگی دشوار
 شاعری سے نہیں مجھے سروکار
 ہر برس کے ہوں دن پاس ہزار
 سیری تنخواہ میں بٹھائی کا
 آج مجھ سانس زمانے میں
 رزم کی داستان گرسنی
 بزم کا التزام گرسنی
 ظلم ہے گرد و سخن کی داد
 آپ کا بندہ اور پھروں تنگا
 سیری تنخواہ کیجے ماہ بامہ
 ختم کرتا ہوں اب دعا پر کلام
 تم سلامت رہو ہزار برس

قطعہ ۲

گو ایک پادشاہ کے سب خانہ زاد ہیں
 دربار دار لوگ ہم آشنا نہیں

۱۱
 ۱۲
 ۱۳
 ۱۴
 ۱۵
 ۱۶
 ۱۷
 ۱۸
 ۱۹
 ۲۰
 ۲۱
 ۲۲
 ۲۳
 ۲۴
 ۲۵
 ۲۶
 ۲۷
 ۲۸
 ۲۹
 ۳۰
 ۳۱
 ۳۲
 ۳۳
 ۳۴
 ۳۵
 ۳۶
 ۳۷
 ۳۸
 ۳۹
 ۴۰
 ۴۱
 ۴۲
 ۴۳
 ۴۴
 ۴۵
 ۴۶
 ۴۷
 ۴۸
 ۴۹
 ۵۰
 ۵۱
 ۵۲
 ۵۳
 ۵۴
 ۵۵
 ۵۶
 ۵۷
 ۵۸
 ۵۹
 ۶۰
 ۶۱
 ۶۲
 ۶۳
 ۶۴
 ۶۵
 ۶۶
 ۶۷
 ۶۸
 ۶۹
 ۷۰
 ۷۱
 ۷۲
 ۷۳
 ۷۴
 ۷۵
 ۷۶
 ۷۷
 ۷۸
 ۷۹
 ۸۰
 ۸۱
 ۸۲
 ۸۳
 ۸۴
 ۸۵
 ۸۶
 ۸۷
 ۸۸
 ۸۹
 ۹۰
 ۹۱
 ۹۲
 ۹۳
 ۹۴
 ۹۵
 ۹۶
 ۹۷
 ۹۸
 ۹۹
 ۱۰۰
 ۱۰۱
 ۱۰۲
 ۱۰۳
 ۱۰۴
 ۱۰۵
 ۱۰۶
 ۱۰۷
 ۱۰۸
 ۱۰۹
 ۱۱۰
 ۱۱۱
 ۱۱۲
 ۱۱۳
 ۱۱۴
 ۱۱۵
 ۱۱۶
 ۱۱۷
 ۱۱۸
 ۱۱۹
 ۱۲۰
 ۱۲۱
 ۱۲۲
 ۱۲۳
 ۱۲۴
 ۱۲۵
 ۱۲۶
 ۱۲۷
 ۱۲۸
 ۱۲۹
 ۱۳۰
 ۱۳۱
 ۱۳۲
 ۱۳۳
 ۱۳۴
 ۱۳۵
 ۱۳۶
 ۱۳۷
 ۱۳۸
 ۱۳۹
 ۱۴۰
 ۱۴۱
 ۱۴۲
 ۱۴۳
 ۱۴۴
 ۱۴۵
 ۱۴۶
 ۱۴۷
 ۱۴۸
 ۱۴۹
 ۱۵۰
 ۱۵۱
 ۱۵۲
 ۱۵۳
 ۱۵۴
 ۱۵۵
 ۱۵۶
 ۱۵۷
 ۱۵۸
 ۱۵۹
 ۱۶۰
 ۱۶۱
 ۱۶۲
 ۱۶۳
 ۱۶۴
 ۱۶۵
 ۱۶۶
 ۱۶۷
 ۱۶۸
 ۱۶۹
 ۱۷۰
 ۱۷۱
 ۱۷۲
 ۱۷۳
 ۱۷۴
 ۱۷۵
 ۱۷۶
 ۱۷۷
 ۱۷۸
 ۱۷۹
 ۱۸۰
 ۱۸۱
 ۱۸۲
 ۱۸۳
 ۱۸۴
 ۱۸۵
 ۱۸۶
 ۱۸۷
 ۱۸۸
 ۱۸۹
 ۱۹۰
 ۱۹۱
 ۱۹۲
 ۱۹۳
 ۱۹۴
 ۱۹۵
 ۱۹۶
 ۱۹۷
 ۱۹۸
 ۱۹۹
 ۲۰۰

تھامیں اک دینو اسے گوشہ نشین	تھامیں اک درد مند سینہ نگار
تم نے مجھ کو جو آبرو بخشی	ہوئی میری وہ گرے بازار
کہ ہوا مجھ سا ذرہ ناچسینہ	روشناسِ ثوابت و ستار
گرچہ از روئے تنگ بے ہنری	ہوں خود اپنی نظر میں اتنا خوار
کہ گراپنے کو میں کہوں حسا کی	جانتا ہوں کہ آئے خاک کو غار
شاد ہوں لیکن اپنے جی میں کہ ہوں	بادشہ کا عن لام کار گزار
حسانہ زاد اور مرید اور مداح	تھا ہمیشہ سے یہ عرفینہ نگار
بارے نو کر بھی ہو گیا صد شکر	نسبتیں ہو گئیں مشتخص چار
نہ کہوں آپ سے تو کس سے کہوں	مدعا سے صبر و رمی الاطمار
پیرو مرشد! اگرچہ مجھ کو نہیں	ذوق آرائش سر و دستار
کچھ تو جاڑے میں چاہیے آخر	جسم رکھتا ہوں۔ ہے اگرچہ تزار
کچھ خریدتا نہیں ہے ابکے سال	کچھ بجایا نہیں ہے ابکی بار
رات کو آگ اور دن کو دھوپ	بھاڑ میں جائیں ایسے لیل و نہار
آگ تاپے کہاں تلک انسان	دھوپ کھاوے کہاں تلک جاندار
دھوپ کی تابش آگ کی گرمی	وقتا رہتا عذاب النار

۱۱ بادشاہ کی ملازمت سے پہلے بھی مرزا کی آمد و رفت قلعوں میں جاری تھی اور مدتیہ قصبہ کے برابر بادشاہ کے ۱۲ گزراستے تھے اور غلٹ پاتے تھے ۱۲

کیا دوسرے یہ کہ قابلِ پاسبان سے چاہتا کیا تھا سو یہ دونو باتیں بصرحت بیان نہیں کی گئیں صرف کتنا یہ میں ادا کی گئی ہیں مگر صراحت سے زیادہ وضوح کے ساتھ فوراً سمجھ میں آ جاتی ہیں۔ پہلی بات پر لفظ شامت اور دوسری پر قدم لینا صاف دلالت کرتا ہے۔ اسکے سوار و زقرہ کی نشست اور الفاظ کی بندش اور ایک وسیع خیال کو دو مصرعوں میں ایسی خوبی سے ادا کرنا کہ تفریق بھی اُس طرح ادا کرنا مشکل ہے یہ سب باتیں نہایت تعریف کے قابل ہیں۔

اس غزل کے اخیر میں چند شعر نواب فرخ آباد کی مدح میں لکھے ہیں جنہوں نے مرزا کو نہایت اشتیاق کے ساتھ فرخ آباد میں بلایا تھا مگر غالباً مرزا کا دمان جانا نہیں ہوا اُن مدحیہ اشعار میں صرف دو شعر اس مقام پر لکھے جاتے ہیں۔

دیا ہے اور کو بھی تا اُسے نظر نہ لگے بنا ہے عیشِ تحللِ حسینِ جاں کے لئے
زمانہ عہد میں ہے اُسکے محو آرائش بنیں گے اور تبارے آسمان کے لئے

قطعا

قطعہ ۱

یہ وہ قطعہ ہے جو مرزا نے پادشاہ کی حضور میں اس درخواست سے گزرانا تھا کہ انکی تنخواہ جو تین سالہ پہلے گزرنے پر اکھٹی چھ مہینے کی ملاک تھی وہ ماہ بہ ماہ ملاکے چنانچہ اس درخواست کے موافق

۱۰۰۰ روپے ملنے لگی تھی۔
۱۰۰۰ روپے سے مراد یہاں

بھی ایسی ہی سیدھی پلٹاؤ آسماں اور رنگ اے جہاندار آفتاب آثار

ثواب حضور کی نذر کرونگا۔ اُدھر سفر حج کا وہ اشتیاق اور اُدھر حج کے ثواب کی یہ بقدری۔

غم کھانے میں بودا دل نا کام بہت ہے یہ رنج کہ کم ہے نئے گلہ نام بہت ہے
کتے ہوئے ساتی سے جیا آتی ہے بھوکو ہے یوں کہ مجھے دُر دہہ جام بہت ہے

یعنی قناعت کا تو یہ حال ہے کہ شراب کی تلچھٹ بھی میرے لئے کافی ہے مگر اس خیال سے کہ ساتی مجھے ذلیل و ر کم ہمت اور قانع بھیج نہ سمجھے اُس پر یہ بات ظاہر نہیں ہونے دیتا۔

نئے تیر کہاں ہیں ہے نہ صیادیں ہیں گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

یعنی جو شخص گمنامی اور کس میرسی کی حالت میں ہوتا ہے اُس کا کوئی دشمن اور بدخواہ نہیں ہوتا ساری خرابیاں شہرت اور اقتدار اور نام و نمود کے ساتھ وابستہ ہیں۔

بلا سے گر قرۂ یار تشنہ رخوں ہے رکھوں کچھ اپنی بھی ترکانِ خشتاں کیلئے
وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں شناس خلقِ خضر نہ تم کہ چورینے عہر جاوداں کے لئے
مثال یہ مری کوشش کی ہے کہ مرغِ اسیر کرے قفس میں فراہم حسنِ آشیان کے لئے

اس سے زیادہ کوشش کی سختی کسی پیرائے میں بیان نہیں ہو سکتی۔

گدا سمجھکے وہ چپچھا مری جو شامت آئے اٹھا اور اٹھکے قدم مینے پاساں کیلئے

اُردو غزل میں ایسے بلیغ اشعار شاید دوسری چار اور نکلیں گے۔ مولانا آرزو جو مرزا کی طرز کو نام رکھتے تھے وہ بھی اس شعر کے انداز بیان پر پروا نہ تھے۔ ہم نے مقدمہ میں بھی اس شعر پر کچھ لکھا ہے کیا ہے یہاں اُسکی ایک اور خوبی کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔ جو واقعہ مرزا نے اس شعر میں بیان کیا ہے اُس میں دو باتوں کی تصریح کرنی ضرور تھی ایک یہ کہ پاساں نے قائل کے ساتھ کیا سلوک

۱۶۲

نہیں ہو سکتی بلکہ اُسکے لئے دہانِ زخم پیدا کرنا چاہئے یعنی جب تک دل تیجِ عشق سے مجروح نہ ہو یہ تہہ حاصل نہیں ہو سکتا۔

سر یہ ہوئی تو وعدہ صبر آزمایا ہے عمر فرصت کہاں کہ تیری تنہا کرے کوئی
یعنی ساری عمر تو صبر کی آزمائش ہی میں گزر گئی پھر تیرے ملنے کی تنہا کس وقت کی جاتی۔

حیات پر وہاں زبان کھٹی ہے ۔ وہ کہیں اور سنا کرے کوئی نہ سنا کرے کہے کوئی ۔

نہ مستو گر بُرا کہے کوئی
نہ کہو گر بُرا کرے کوئی

روک دو گر غلط چلے کوئی
نہ کہو کر بُرا کرے کوئی
ڈھانک لو اگر خطا کرے کوئی

کیا کیا خضر نے سکندر سے
جب توقع ہی اڑ گئی تھی

جب توقع ہی اٹھ گئی غالب
 کیوں کیسا گلا کرے کوئی

ہزاروں خواہشیں ایسی ہر خواہش کے دم نکلے
 یوں سیکا کھلا کرے کوئی
 بست نگے مری ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے
 پر دم نکلنا اُسکے نور سے ہو نکلے لئے جا رہا کہ

خوابش پر دم نکلنا اسکے پورے ہونیکے لئے جلدی کرنا چنانچہ کہتے ہیں کیوں دم نکلا جاتا ہے یا کیوں سرے جاتے ہو یعنی کیوں جلدی کرتے ہو پہلے مصرع میں بمقتضائے مقام یہ الفاظ کہ ”دل میں باقی ہیں“ مقتدر ماننے چاہئیں باقی شعر کے معنی صاف ہیں۔

نکلتا غلہ سے آدم کا سنتے آئے ہیں لیکن بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

دوسرے مصرع میں بہت کے لفظ پر زور دینا چاہئے تاکہ آدم کی نسبت زیادہ بے ابروئی کے ساتھ نکلنا ثابت ہو۔

بہم پہلجاست ظالم تیری قامت کی درازی کا
اگر اس طرہ پہنچ دو خم کا پیچ دو خم سے مکمل

10

نصف اخلاق

۱۰

١٢

دوست سے دوستی میں مینا کی ہوئے ، دھوئے گئے ہم ایسے کہ مینا کی ہوئے

دعویٰ کیا تھا۔ بے شرم و بیباک ہونا۔ پاک۔ آزاد یا شہداء۔ طالب یہ ہے کہ جب ملک انکھ سے آنسو نہیں
 گھسے تھے تو اس بات کا پاس دلوں کا عشق ہمارا کسی پرغام نہ ہونے پائے کہ جب روزانہ ہمارا بیباک
 اور ہر وقت آنسو جاری رہے تھے تو انھما سے رزمش کا خیال جاتا رہا اور ایسے بے شرم و بے حجاب
 ہوئے کہ زردیوں اور شہدوں کی میت کھل گئی۔ پس طلب کو ان انہوں میں ادا کرنا کہ وہ رونے سے
 بھر گئے تھے۔ رباہل پاکی ہوئے۔ بلا منت اور حسن بیان کی انتہا ہے

اے گئے تھے اسے تعافل کا ہم ملہ کی ایک ہی نگاہ کہ بس خاک ہو گئے
 شاہرہ تھیں کہ جو معاملہ زیر عشاق کے ساتھ ہے اس کے تعافل کے ساتھ اور عشاق کے معاملے کو نگاہ
 کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے جیسا کہ سماجی بھی کتاب ہے
 رباعی

اسے زہد و عاشق از تو درناز و او دور تو بہ نزدیک تر احوال تباہ
 کس نیست کہ جاں از تو سلامت بہر د اں را بہ تعافل کشی این را بہ نگاہ
 پس شعرا طالب یہ ہے کہ ہم نے اس کے تعافل سے تنگ کر شکایت کی تھی اور اس کی توجہ کے خواہگار
 ہوئے تھے تب اسے توجہ کی تو ایک ہی نگاہ میں ہلکنا کر دیا۔

بہت کٹ بان تم نہ پیدا کرے کوئی شکل کہ تجھے راہ سخن واکرے کوئی

صوفیہ کی اصطلاح میں محاورت اور مسامت (یعنی عید اور عید کے درمیان گفتگو ہونا) دو مرتبے ہیں جو
 مکالمین اور عرفا کو حاصل ہوتے ہیں کتاب ہے کہ شاہرہ تھیں کے ساتھ اس معمولی لب و دہن سے بات

ہاے وہاں بھی شورِ عشرت نے نرم لہنے دیا
لے گیا تھا گو میں ذوقِ تن آسانی مجھے
وعدہ آنے کا وفا کجے یہ کیا انداز ہے
تمنے کیوں سوچی ہے میری گھر کی درانی مجھے
وفا سے وعدہ کے انتظار میں گھر سے کہیں نہ جانے کہ اس طرح بیان کرنا کہ تم نے میرے گھر کی درانی مجھے
سوچ دی ہے بالکل نیا پر ایہ بیان ہے۔

دل لگا کر آپ بھی غالب مجھی سے ہو گئے
عشق سے آتے تھے رابع میرزا صاحب مجھے
کبھی نیکی بھی اُسکے جی میں گرا جاتی ہے مجھے
جھائیں کے اپنی یاد شرمنا جائے ہے مجھے
یعنی اس خیال سے کہ تمام عمر اس پر ظلم کئے ہیں اب تھڑی سی نیکی کرنے سے اُسکی کیا تلافی ہو سکتی ہے نیکی
نہیں کر سکتا۔

سنھلنے دے مجھے ایذا امید کی کیا قیامت
کہ دامانِ خیالِ بار چھوٹا جائے ہے مجھے
ہوئے ہیں پانوی پہلے نبردِ عشق میں تھی
نہ بھاگا جا کے ہو مجھے نہ ٹھیرا جاتی ہے مجھے
اے عینِ جہانِ کیفیات کی تمثیلِ محسوسات کے ساتھ دی گئی ہے مطلب یہ ہے کہ وہ تو ہے جن سے عشق
کے ترک کرنے یا اُسکے شدائد پر تحمل کرنے کی قدرت تھی ابتداءِ عشق میں انہیں کو صدمہ پہنچا ہے پس
اب عشق ترک ہو سکتا ہے نہ اُسپر صبر و تحمل کیا جاسکتا ہے۔

بازیچہ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے
اک کھیل ہے اور نگِ سلیمان نے نزدیک
اک بات ہے اعجازِ میساج مرے آگے
وہ نیشتر سہی پر دل میں جب تر جائے
نگاہِ ناز کو پھر کیوں نہ آشنا کہنے
سفینہِ حکیمہ کنارے پہ الگا غالب
خدا سے کیا ستم و چورِ با خدا کہنے

انتظار

عاشقِ شہ

عاشقِ شہ

عاشقِ شہ

لہذا تو فریبِ دوسرے صریح میں ہے یہ معنی پیدا کر دیے ہیں کہ آنکھ سے سو روئے روئے دل میں خون
 کو ایک نظر باقی نہیں ۱۰۱۰ اس لئے دوست کے سر انگشتِ خانی کے تصور کو غنیمت سمجھتا ہے کہ
 سہل و سہل سے دل میں ہوئی ایک بوند تو نظر آتی ہے۔

کیوں دُرتے ہو عشاق کی بچہ وصلی سے یہاں تو کوئی سنتا نہیں فریادِ سو کی
 بچہ وصلی یعنی کم طرفی تیاں سے مراد دنیا مشوق سے کتا ہے کہ تو اس بات سے کیوں دُرتا ہے
 کہ ہم عاشق لوگ تیرے جور و غلم سے تنگ اگر حاکم سے یا خدا سے تیری فریاد کر نیکی کیونکہ اگر ہم ایسا
 کریں بھی تو تیاں کوئی کسی کی فریاد ہی نہیں سنتا۔

چاک مت کر جب بے آیام گل کچھ اُدھر سر کا بھی اشار چاہیے
 پھول کے کھیلنے کو چاک لڑیاں سے نموداً تشبیہ دی جاتی ہے کتا ہے کہ ہر ایک کام غم کی ہدایت سے
 کرنا چاہئے پس جب تک پھول اپنا گریبان چاک نہ کرے تو بھی گریبان چاک مت کر ہمیں لطف
 یہ ہے کہ مجنوں کو ہمیشہ بہار میں جوشِ جنوں زیادہ ہوتا ہے۔

پلاڑے نوک سے ساتی جو نہ ہو نفرت ہے پیالہ گرنیس دیتا نہ شراب تو دے
 ہاں کھائیو مت فریبِ ہستی ہر خیزد کیس کہ ہے - نہیں ہے
 کیوں رہو قنچ کرے ہے زاہد مے ہے یگس کی تھے نہیں ہے

گس کی تھے یعنی شہد زاہد جو شہد کے پینے کو موجبِ ثواب جانتا ہے اور شراب سے نفرت کرتا ہے
 اسکو شراب کی ترغیب دیتا ہے اور یہ جتنا ہے کہ نفرت کی چیز شراب نہیں ہے بلکہ وہ چیز ہے جو
 گس کے تھے کوئے سے حاصل ہوتی ہے۔

فریادِ سو کی

بچہ وصلی

پلاڑے نوک سے

خط لکھیں گے اگرچہ مطلب کچھ نہ ہو

عشق نے غالب بنکھا کر دیا

پھر اس انداز سے بہا ر آئی

دیکھو اے ساکنانِ خطہِ خاک

کہ زمیں ہو گئی ہے سہ ماہی

سبزے کو حیب کہیں جگہ نہ ملی

سبزہ و گل کے دیکھنے کے لئے

ہے، ہوا میں شراب کی تاثیر

کیوں نہ دنیا کو ہو خوشی غالب

کب وہ سنتا ہے کہانی میری

قدرِ سنگِ سحرہ رکھتا ہوں

ہم تو ہیں عاشق تمہارے نام کے

ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

کہ ہونے مہر وہ تماشا

اسکو کہتے ہیں عالم آرائی

روکش سلج حسین میسنائی

بن گیا روئے آبِ یرکائی

چشمہ زگس کو دی ہے بینائی

بادہ نوشی ہے بادپیمائی

شاہ ویندار نے شفا یابی

اور پھر وہ بھی نہ مانی میری

سخت اذراں ہے گرائی میری

گرائی کے معنی بھاری پن کے بھی ہیں اور بیش قیمت ہونے کے بھی کہتا ہے کہ میری قدر اس تھپڑ
کی سی ہے جو راہ کے سرے پر پڑا ہو اور ہر شخص اُتے جاتے اُس پر پاؤں رکھ کر گزرے یعنی ہوں تو
گراں قدر مگر اس تھپڑ کی طرح بے قدر ہوں پس میری گرائی کس قدر اڑاں ہے۔

کھل گئی، سیچھانی میری

لکھتے ہیں: "محبوبِ ارب سے قسمتِ عس و کی"

دل میں نظر آتی تو ہے اک بوئد لہو کی

دہن اُس کا جو نہ معلوم ہوا

جس زخم کی ہو سکتی ہو تیسری زخمی

ایچھا ہے سر انگشت خانی کا قصہ

چہ گویم کہ غم از دل برود چون تو بیانی، دونو کا حاصل یہ ہے کہ کسی طرح اپنی تکلیف یا رنج معشوق پر ظاہر نہیں کر سکتے مگر سعدی کے بیان میں یہ احتمال باقی رہتا ہے کہ شاید معشوق عاشق کی ظاہری بد حالی دیکھ کر سمجھ جائے کہ اس کا دل مغموم ہے کیونکہ سعدی کے بیان سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ معشوق کے آنے سے غم جاتا رہتا ہے نہ یہ کہ ظاہری حالت بھی بدل جاتی ہے مگر مرزا کے بیان میں یہ احتمال باقی نہیں رہتا با اینہم سعدی کے شعر کو بہ حال مرزا کے شعر پر ترجیح دینی چاہئے کیونکہ

افضل للمتقدم

دیکھتے پاتے ہیں عشاق تبوں سے کیا فیض اک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال چھا ہے

گو یا معشوق کی تمنائیں ایسا مستغرق ہے کہ دنیا دانیہا کی کچھ خبر نہیں یہاں تک کہ پٹت نے سال کو اچھا بتایا ہے تو اس کے اچھا ہونے کے یہی معنی سمجھتا ہے کہ شاید اس سال معشوق عاشقوں سے ہو جائیں نہ یہ کہ اس سال قحط نہیں پڑے گا یا وہاں نہیں آنے کی یا لڑائیاں نہیں ہوں گی وغیرہ وغیرہ۔

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے
پڑ ہو نہیں شکوے یوں راگ سے جیسے باجا
اک ذرا چھیرے پھر دیکھے کیا ہوتا ہے
کیوں نہ ٹھیریں ہر تار و کبیدہ کلام
آپ اٹھا لاتے ہیں گرتیر خطا ہوتا ہے
رکھو غالب مجھے اس تلخ نوائی میں
آج کچھ دردِ مرے دل میں سوا ہوتا ہے
رگوں میں دڑتے پھرنے کے ہم نقل
جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر ہو کیا ہے
وہ چیز جس کے لئے ہم کو ہر بہشت عزیز
سواے بادہٴ کلفام مشک ہو کیا ہے
میری قسمت میں غم گرا نا تھا
دل بھی یارب کئی دیے ہوتے

حاشیہ

چھپا

چھپا

حاشیہ

حاشیہ

حاشیہ

حاشیہ

حاشیہ

حاشیہ

باد و دوشینہ یعنی رات کی پی ہوئی شراب جو مرنے سے پہلے پی تھی مجھ سے ازراہ شوخی کے کہتا ہے کہ
نکیرین کے سوال و جواب سے بچنے کی کوئی تدبیر اسکے سوا نہیں کہ شراب پی کر مرے ہا تاکہ نکیرین اسکی
بوکی کراہت سے بغیر سوال جواب کئے چلے جائیں۔

علاوہ سے ڈرتے ہیں نہ دعا عطا سے جھکاتے
ہم سمجھے ہوئے ہیں اسکو جس بھیس میں چھٹے
گو یا خدا کے سوا کسی کو نہیں جانتے۔

بے اعتدالیوں سے یک سب میں ہم ہوئے
یہناں تھا دام سخت قریب آشیان کے
چھوڑی آس نہ ہننے گدائی میں دل لگی
سایے کی طرح ساتھ پھرتی سر و صوبہ
دے مجھ کو شکایت کی اجازت کہ ستمگر
حسنِ مہر گرچہ ہنگام کمال اچھا ہے
دوسرے مصرع میں دعویٰ متضمن دلیل ہے

پر ترجیح دینے کی وجہ پیدا ہو جائے۔
مشتوق کو ہر خورشیدِ جمال اس لئے کہا ہے تاکہ اسکو ہر اکمل

جو میں کہتے ہیں کہ مفت آئے تو مال اچھا ہے
وہ گدا جسکو نو خوسے سوال اچھا ہے
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے
اسی کے قریب قریب سعدی رح کا بھی ایک شعر ہے وہ کہتے ہیں ”گفتہ بودم چو بیانی غم دل با تو گویم“

نہیں
مفت و اعتدالیوں سے
یک سب میں ہم ہوئے
یہناں تھا دام سخت قریب آشیان کے
چھوڑی آس نہ ہننے گدائی میں دل لگی
سایے کی طرح ساتھ پھرتی سر و صوبہ
دے مجھ کو شکایت کی اجازت کہ ستمگر
حسنِ مہر گرچہ ہنگام کمال اچھا ہے
دوسرے مصرع میں دعویٰ متضمن دلیل ہے
پر ترجیح دینے کی وجہ پیدا ہو جائے۔
مشتوق کو ہر خورشیدِ جمال اس لئے کہا ہے تاکہ اسکو ہر اکمل
جو میں کہتے ہیں کہ مفت آئے تو مال اچھا ہے
وہ گدا جسکو نو خوسے سوال اچھا ہے
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے
اسی کے قریب قریب سعدی رح کا بھی ایک شعر ہے وہ کہتے ہیں ”گفتہ بودم چو بیانی غم دل با تو گویم“

ہم بھی تسلیم کی خود الیں گے

زندگی اپنی جب اس رنگ سے گزری

بے نیازی تری عادت ہی سہی

ہم بھی کیا یاد کرینگے کہ خدا رکھتے تھے

یہ معنوں تھوڑے سے فرق کے ساتھ فارسی غزل میں بھی مرزا صاحب نے باندھا ہے اور وہ یہ ہے

”گفتنی نیست کہ بر غالب ناکام چہ رفت

اُس بزم میں مجھے نہیں بنی حیا کئے

می تو اں گفت کہ ایں بندہ خداوند شد

بیمٹھا رہا اگرچہ اشارے ہوا کئے

دینے لگا ہے بوسہ بغیر التجا کئے

گر حیا بھی اُسکو آتی ہے تو شرما جائے

صحبت میں غیر کی نہ پڑی ہو کہیں یہ خو

غیر کو یارب وہ کیونکر منع گستاخی کرے

یہ شعر معاملہ کا ہے۔ جو طالب و مطلوب کے درمیان اثر گذرتا ہے؛ اور شاعرانہ نزاکت دوسرے

مصحف میں پائی جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ حیا آتی اور شرما جانا درحقیقت ایک ہی چیز ہے؛ پھر اس

کیا معنی؟ کہ حیا بھی آتی ہے تو شرما جاتا ہے۔ بات یہ ہے کہ اس مقام پر حیا آنے کا متعلق اور ہے

اور شرما جانے کا متعلق اور۔ گر حیا بھی اُسکو آتی ہے، ”یعنی غیر کی گستاخی اور خواہش بجا ہے۔ اور

شرما جائے ہے، ”یعنی غیر سے یا اُسکے ساتھ تکرار کرنے سے۔

ہو کے عاشق وہ پرینچ اور نازک بن گیا

گرچہ ہے کس کس بُرائی سے دے باہنہ

زنگ کھلتا جاوے ہے جتنا کہ اُرتا جائے

ذکر میرا مجھے بہتر ہے کہ اُس محفل میں ہے

بس ہجوم نا اُمیدی خاک میں لجا بیگی

فردا دُردی کا تفرقہ اک بار بیٹ گیا

یہ جواک لذت ہماری سعی بجاصل میں ہے

تم کیا گئے کہ ہم یہ قیامت گذر گئی

کہتا ہے کہ تمہارے جاتے ہی بسبب خود رفتگی و خود فراموشی کے یہ حالت ہو گئی کہ آج اور کل کی مطلق

یعنی جب غم دنیا سے سر اٹھانے کی فرصت ملتی ہے تو سر اٹھاتے ہی آسمان پر نظر باڑتی ہے اور چونکہ وہ جفا پیشہ ہے اُسکے دیکھتے ہی تو یاد آجاتا ہے۔ اب دو سرا غم شروع ہو جاتا ہے۔ غم شک کسی حالت میں غم سے نجات نہیں۔

ایک جاحظِ وفا لکھا تھا سبھی مٹ گیا
مٹا ہر کاغذِ ترے خط کا غلط بردار ہے

غلط بردار اُس کاغذ کو کہتے ہیں جس پر سے حرفِ باسانی کزلک و غیرہ سے اڑ سکے، اور کاغذ پر اُسکا نشان باقی نہ رہے، مگر سیاں ازراہِ نظر انتِ علیہ بردار کے یہ معنی لئے ہیں جس پر سے حرفِ غلط خود بخود اڑ جائے۔ کہتا ہے کہ تو نے اپنے خط میں حرفِ ایک جگہ حرفِ وفا لکھا تھا سودہ بھی مٹ گیا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپکے خط کا کاغذ غلط بردار ہے۔ کہ جو بات سچے دل سے اسپر نہیں لکھی جاتی وہ خود بخود مٹ جاتی ہے۔

ہے وہی بدستی ہرزہ کا خود عذر خواہ
جسکے جلوے سے زمین آسمان سنا رہا

ہرزہ یعنی ہر مخلوق۔ عذر خواہ معافی چاہنے والا، یا معذور رکھنے والا۔ اس شعر میں دعویٰ اسے طریقے سے کیا گیا ہے کہ خود دعویٰ متعین دلیل ذائع ہوا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ذراتِ عالم یعنی ممکنات جو فی الحقیقت معدومِ محض ہیں۔ اُن کی بدستی و غفلت کا عذر خواہ وہی ہے جسکے پر تو وجود سے یہ تمام معدومات وجود کا دم بھرتے ہیں۔

پیش میں گذرتے ہیں جو کوچہ سے وہ سیر
کندھا بھی کہا روں کو بدلنے نہیں دیتے

قطع کیجئے نہ تعلق ہم سے
کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

کچھ تو روئے اے فلکِ نا انصاف
اے و سرِ یاد کی رخصت ہی سہی

جب میکہ چٹھا تو پھر اب کیا جگہ کی قید
مسجد ہو مدرسہ ہو کوئی خانقاہ ہو
اس شعر میں ازراہ تہذیب اس کام کا ذکر نہیں کیا جسکے کرنے کے لئے مسجد و مدرسہ و خانقاہ
کو مساوی قرار دیتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میکہ۔ جہاں حرفیوں کے ساتھ شراب پینے کا لطف تھا۔
جب وہی چھٹ گیا اب مسجد میں مل جائے تو اور مدرسہ و خانقاہ میں اٹھ آجائے تو سب جگہ پی لینی
برابر ہے۔ مسجد وغیرہ کی تنقیص ازراہ شوخی کے کی گئی ہے؛ یعنی یہ مقامات جو اس شغل کے بالکل
لائق نہیں ہیں وہاں بھی میکہ چھٹنے کے بعد پی لینے سے انکار نہیں ہے۔ اور شراب پینے
کی تصریح نہ کرنا عین مقتضایہ بلاغت ہے۔

ستے ہیں جو بہشت کی تعریف سب درت
لیکن خدا کرے وہ تری جلوہ گاہ ہو
اس شعر کو حقیقت و مجاز دونوں پر محمول کر سکتے ہیں۔

جسے نصیب ہو روزِ سیاہ میرا سا
وہ شخص دن نہ کہے رات کو تو کیونکر ہو
اس دن کی سیاہی کیسی ہوگی جسکے آگے رات بھی دن معلوم ہوتی ہے۔

یہ کہہ سکتے ہو؟ ہم دل میں نہیں ہیں۔ پر یہ بتلاؤ
کہ جب دل میں تمہیں تم ہو تو آنکھوں سے نہاں کیوں ہو
اس شعر میں مخاطب مشوق حقیقی ہے۔

مے سے غرض نشاط ہے کس و سیاہ کو
رہے اس شہر سے آزرہ ہم چند تو کھٹ سے
مرے و لیں ہے غالب شوق و صل شکوہ ہجر
غم دنیا سے گر پانی بھی فرصت اٹھانے کی
ارک گو نہ بخودی مجھے دن رات چاہئے
تکلف برطوت تھا ایک انداز جنوں وہ بھی
خدا وہ دن کرے جو اس سے میت بھی کہوں بھی
فلک کا دیکھنا تقریب تیرے یاد آنے کی

قید حیات و بند غم اصل میں تو ایک ہیں سوت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائی کیوں
 حسد سے دل اگر مسرودہ ہے گرم تماشائے کہ چشم تنگ شاید کثرتِ نظارہ سے داہ

یہ محض خیالی مضمون نہیں ہے بلکہ حقیقت واقعی کہ اگر ایک نہایت عمدہ پیرائے میں بیان کیا ہے۔ فی الواقع جب انسان گھر کی چار دیواری میں محصور، دنیا کے حالات سے ناواقف، اور لوگوں کی ترقی و منزل کے اسباب سے بے خبر ہوتا ہے تو اپنی محدود جماعت میں سے کسی کو عمدہ حالت میں نہیں دیکھ سکتا؛ لیکن جس قدر اس کا دائرہ متعارف زیادہ وسیع ہوتا جاتا ہے اسی قدر اُس پر یہ بات کھلتی جاتی ہے کہ لوگوں کی خوشحالی محض اتفاقی نہیں ہے۔ جیسے حسد و رشک کیا جائے۔ بلکہ انکی محنت و تدبیر کا نتیجہ ہے؛ اور اس لئے انصاف اور فیاضی اسکے دل میں پیدا ہوتی ہے؛ اور وہ خود بھی کوشش و تدبیر کی طرف مائل ہوتا ہے اور بجائے حسد و رشک کے اوروں کی ریس اور پیروی کرنے پر متوجہ ہو جاتا ہے۔ اس منقول بات کو ایک محسوس تشیل میں بیان کرتا ہے کہ ”چشم تنگ شاید کثرتِ نظارہ سے داہو“ جس طرح شعرا نے بخیل کے دل کو تنگ باندھا ہے اسی طرح حاسد کی آنکھ کو تنگی کے ساتھ مومنون کیا ہے۔

کعبہ میں جا رہا تو نہ دو ٹوٹنے کیا کہیں بھولا ہوں حق صحبت اہل کشت کو
 ہوں منحرف نہ کیوں رہ دویم صواب سے ٹیڑھا لگا ہے قلم سر نوشت کو
 آئی اگر بلا تو جگہ سے ٹلے نہیں ایڑا ہی دیکھ ہنسنے بچا یا ہے کشت کو
 خدا شرا نے ہاتھوں کو کرکتے ہیں کشاکش میں کبھی میرے گریباں کو کبھی جاناں کے داہن کو
 نہ لکھتا دن کو تو کب رات کو یوں بے خبر ہوتا رہا کھٹکانہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہن کو

چشم تنگ
 انصاف

وفا و اداری
 حلال و حرام
 اشتغال
 اشتیاق
 حسیاسی

کشاوہ رہتا تھا اسی طرح یعقوب کی آنکھیں شب در ذریعہ شفت کی طرف نگراں رہتی تھیں۔
 نیند اُسکی ہے دماغ اُسکا ہے اتریں اُسکی ہیں جسکے بازو پر تری زلفیں پریشان گئیں
 وہ گناہیں کیوں ہوتی جاتی ہیں باریک لکیر جو مری کوتاہی قسمت سے ترگاں ہوئیں
 لنگا ہوں کے ترگاں ہونے سے یہ مراد ہے کہ شرم و حیا کے سبب اوپر نہیں اٹھتیں؛ بلکہ پلوں کی طرح
 ہر وقت نیچے کو جھکی رہتی ہیں۔

وہاں گیا بھی میں تو اُنکی گالیوں کا کیا جواب یاد تھیں جتنی دعائیں صرف دریاں ہوئیں
 یعنی اب نئی دعا تو کوئی ذہن میں باقی نہیں رہی اور وہی مستعمل دعائیں جو دربان کو دے چکا ہوں
 دوست کے حق میں صرف کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ اس شعر میں جو اصل خوبی اور لطافت ہے
 وہ یہ ہے کہ گالیوں کے جواب میں دعائیں دینے کو ایک ایسی معمولی اور ضروری بات ہر اظہار
 کرتا ہے کہ گویا اُسکو ہر شخص ضروری جانتا ہے؛ کیونکہ سب سے حیراں ہو کر پوچھتا ہے کہ تباہ اُنکی
 گالیوں کا کیا جواب دو گا جبکہ دعائیں سب نظر چکیں۔

ہم مودعہ ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم ملتیں جب بٹ گئیں اجڑے ایماں ہوئیں
 تمام ملتوں اور مذہبوں کو منجملہ دیگر رسوم کے قرار دیتا ہے۔ جن کا ترک کرنا اور مٹانا مودعہ کا اصل
 مذہب ہے؛ اور کہتا ہے کہ یہی ملتیں جب بٹ جاتی ہیں تو اجڑے ایمان بجاتی ہیں۔
 دیکھا اسد کو خلوت و جلوت میں بارہا دیوانہ گر نہیں ہے تو ہنسیا بھی نہیں
 جب جمالِ دل فروز صورتِ مہرِ فروز آپ ہی ہونظارہِ نورِ پردی میں نہ چھپاؤ گیوں
 حقیقت و مجاز دونوں پر محمول ہو سکتا ہے۔

تو کیا تکیہ کے ہر مقام پر دو چادر رکھنے
تیرا پتہ نہ پائیں تو ناپسند کیا کریں
میں نے کہا کہ بزمِ ناز چاہیے غیر سے تہی
سُنکے ستمِ ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں
ستمِ ظریف وہ ظریف جسکی فراغت کے ساتھ ظلم بھی بڑا ہوا ہو۔ مطلب شعر کا یہ ہے کہ میں نے تو قریب کی غیر
مجھ کر کہا تھا کہ آپکی محفل غیر سے خالی ہونی چاہیے؛ اُننے یہ سن کر مجھے بزم سے اٹھو دیا؛ یعنی یہاں ایک
تو ہی غیر نظر آتا ہے۔

سو گئی ہے غیر کی شیریں بانی کارگر
عشق کا اُسکو گماں ہم بیزبانو نہیں
قیامت ہے کہ سن لیلے کا دشتِ قیس میں آنا
تعجب سے وہ بولایوں بھی ہوتا ہوا زانی
وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت کا
کبھی ہم اُنکو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں
اپنے گھر میں معشوق کے آنے سے جو تعجب و حیرت ہوتی ہے دوسرے مصرع میں اُسکی کیا عمرہ تصویر کھینچی
ہے۔ یعنی کبھی معشوق کو دیکھتا ہے، اور کبھی اپنے گھر کو دیکھتا ہے، کہ اس گھر میں اور ایسا شخص دروہا

کبھی جو یاد بھی آتا ہوں میں تو کہتے ہیں
کہ آج بزم میں کچھ فتنہ و فساد نہیں
جہاں میں ہو غم و شادی ہم ہیں کیا کام
دیبا ہے ہمو خدا نے وہ دل کہ شاد نہیں
یار رب زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لئے
یوح جہاں پہ حرفِ مکر رہیں ہوں
حد چاہتے سزا میں عقوبت کے واسطے
آخر گناہ گار ہوں کا فر نہیں ہوں
سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوئیں
خاک میں گیا صوتیں ہونگی کہ نہاں گشتیں
قید میں معیوب نے لی گوشتِ یوسف کی خیر
لیکن آنکھیں روزِ دیوارِ زنداں ہوں
معیوب کی آنکھوں کو روزِ دیوارِ زنداں قرار دیا ہے کیونکہ جس طرح روزِ زنداں ہر وقت یوسف پر

تو کیا تکیہ کے ہر مقام پر دو چادر رکھنے

تو کیا تکیہ کے ہر مقام پر دو چادر رکھنے

تو کیا تکیہ کے ہر مقام پر دو چادر رکھنے

تو کیا تکیہ کے ہر مقام پر دو چادر رکھنے

رہتا ہوں اتنا ہی مجھے اپنی حقیقت یعنی وجود واجب سے بعد ہے۔

ہے مثل نمودِ صورت پر وجودِ عجب یہاں کیا دھڑا ہے قطرۂ موج و حباب میں
وحدت وجود اور کثرت مہم کی تمثیل ہے قطرۂ موج و حباب کے ہیچ و ناچیز ہونے کو ایک عام
محاورے میں اسطرح ادا کرنا کہ ”یہاں کیا دھڑا ہے“ نہتائے بلاغت ہے۔

غالبِ ندیم دوست سے آتی ہو بویِ دوست مشغولِ حق ہوں بندِ گئی بو تراب میں
چھوڑا نہ شکستے کہ ترے گھر کا نام لوں ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کہہ کر کوئی
چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے تھما پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہِ ہیر کوئی

طالبِ راہِ خدا کو جو حالت ابتدا میں پیش آتی ہے اُسکو اس تمثیل میں بیان کیا ہے۔ طالبِ اول
جس شخص میں کوئی کرشمہ یا وجد و سماع و جوش و خروش دیکھتا ہے اسی کے ہاتھ پر بیعت کرنے کا
ارادہ کرتا ہے؛ اور اُسکے ساتھ ساتھ پھرتا ہے پھر جب کوئی اس سے بڑھ کر نظر آتا ہے تو اسکا تعجب
کرتا ہے؛ وگرنہ جبراً اور وجہ اس تذبذب اور تزلزل کی یہی ہوتی ہے کہ وہ کاملین کو پہچان نہیں سکتا۔

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے اور یاکین ہمو قتلید تنکِ ظرفِ نئے شہین
کرتے کس منہ سے ہو غربت کی شکایت لپ تم کو بے مہری یارانِ وطن یاد نہیں
دو دو جہان دیکے وہ سمجھے یہ خوش رہا یہاں آپڑی شرم کہ اگر کیا کریا

اپنی فراخِ حوصلگی اور اُسکے ساتھ شرافتِ نفس کا اظہار ہے؛ یعنی میں جو دو دو جہان لیکر خاموش ہو رہا
اسکا سبب یہ نہیں تھا کہ میں اُن پر قانع ہو گیا؛ بلکہ مجھکو زیادہ مانگنے اور تکرار کرنے سے شرم آئی اس لئے
خاموشی اختیار کی۔

تھوڑا

نقبت
عاشقانہ
سلوک

تصوف
شکوہِ دل
عالیٰ

بنائو سنگار سے ممشوق کا حسن بے شک دوبالا ہو جاتا ہے؛ مگر اسکا غصہ میں گہرنا اس کے بناؤ سے بہت زیادہ خوشنما اور دربار معلوم ہوتا ہے۔ اس شعر کے متعلق یہ سب ظاہری اور اوپری باتیں ہیں جو ہم لکھ رہے ہیں؛ اسکی اصل خوبی و جودانی ہے جبکہ صاحب ذوق کے سوا کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ ایک روز مولانا آزاد مرحوم کے رد برد کسی نے یہ شعر پڑھا چونکہ مولانا نہایت صاف اور سیریل الفہم اشعار کو پسند کرتے تھے، اس لئے مرزا کا کلام سنکر اکثر اچھٹے تھے اور انکی طرز کو ہمیشہ نام رکھتے تھے۔ مگر اس روز اس شعر کو سنکر وجد کرنے لگے اور تعجب ہو کر پوچھا کہ یہ کبکا شعر ہے؟ کہا گیا کہ مرزا غالب کا۔ چونکہ وہ مرزا کے شعر کی کبھی تعریف نہیں کرتے تھے، اور اس روز لا علمی میں بے ساختہ اُنکے منہ سے تعریف نکل گئی تھی، غالب کا نام سنکر بطور مزاح کے جیسی کہ انکی عادت تھی فرمایا "ایسے مرزا کی کیا تعریف ہے یہ تو خامس ہماری طرز کا شعر ہے"، مگر فی الحقیقت یہ شعر بھی معنی و لفظاً ویسا ہی اچھا تھا اور مرزا لاپتہ جیسا کہ مرزا کا تمام کلام کسی کے کلام سے میل نہیں کھاتا۔ جہاں تک کہ یہ معلوم ہے یہ سنکر بیان آج تک اس عمدگی کے ساتھ کسی کے کلام میں نہیں دیکھا گیا۔

نہ میں ہے رخسارِ عمر کہاں دیکھتے تھے
نہ ہاتھ بال پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

سوار کی بے اختیاری اور گھوڑے کا اُسکے قابو سے باہر ہونا چابک سواروں کی زبان میں اس سے بہتر بیان نہیں ہو سکتا اور عمر کو ایسے بے قابو گھوڑے سے تشبیہ دینا حسن تشبیہ کا حق ادا کر دیتا ہے
آٹنا ہی مجھ کو اپنی حقیقت سے بُد ہے
جتنا کہ وہم غیر سے ہوں بیچ و تاب میں

غیر سے یہاں ماسوی اللہ مراد ہے۔ جو مصوفیہ کے نزدیک بالکل معدوم ہے۔ کیونکہ وہ وجود واحد کے سوا سب کو معدوم سمجھتے ہیں۔ کہتا ہے کہ جس قدر وجود ماسوی کے وہم سے رات دن بیچ و تاب میں

شک
سی
جیبری
شعب

قاصد کے آتے آتے خطا اکل دلا رکھوں میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں
دوسرے مصرع میں بطور طنز کے لکھا ہے کہ جو کچھ وہ جواب میں لکھیں گے مجھے معلوم ہے؛ یعنی وہ کچھ نہیں
لکھنے کے۔ اسلئے قاصد کے واپس آنے سے پہلے ایک اور خطہ رکھ رکھوں۔

مجھ تک کب آنکے بزم میں آتا تھا دو جام
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں
اس شعر میں پہلے مصرع کے بعد اتنا جملہ محذوف ہے ”پھر آج جو خلافِ عادت جام کی نوبت مجھ تک
پہونچی ہے“ اس محذوف نے شعر کا رتبہ بہت بلند کر دیا ہے ایسا حذف۔ جس پر قرینہ دلالت کرتا ہو
اور جو الفاظ حذف کئے گئے ہیں وہ بغیر ذکر کئے دونوں مصرعوں میں بول رہے ہوں ٹھنکناٹ شعر
میں شمار کیا جاتا ہے۔

لاکھوں لگاؤ ایک چرانا نگاہ کا لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں
یہاں لگاؤ سے مراد لگاؤٹ ہے؛ یعنی مشوق کا عاشق کے ساتھ ایسا برتاؤ کرنا جس سے اسکا
التفات اور میلان طبع پایا جائے۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ دوست کی لاکھوں لگاؤ میں ایک طرف؛
اور ایک نگاہ کا چرانا ایک طرف۔ اور اس کے لاکھوں بناؤ سنگار ایک طرف؛ اور ایک عتاب میں
بگڑنا ایک طرف۔ یہ شعر بھی سہل و متنوع ہے۔ اگر الفاظ کی طرف دیکھئے تو تعجب ہوتا ہے کہ کیونکر ایسے
دو ہم پلے مصرع ہم پہونچ گئے جن میں حسنِ ترصیع کا پورا پورا حق ادا کیا گیا ہے۔ اور اگر معنی پر نظر کیجئے
تو ہر ایک مصرع میں ایک ایسا معاملہ باندھا گیا ہے جو فی الواقع عاشق و مشوق کے درمیان ہمیشہ
گھڑتا رہتا ہے۔ مشوق کی لگاؤٹ عاشق کے لئے بہت بڑی چیز ہے؛ مگر اسکا آنکھ چرانا جو لگاؤٹ
کی ضد ہے وہ عاشق کی نظر میں لگاؤٹ سے بہت زیادہ دلفریب و دلادیز ہوتا ہے۔ اس طرح

میاوہ یعنی بٹیا کو دم شمشیر سے تشبیہ دی ہے۔ طالب شعر کا یہ ہے کہ عشق کے آزار اور کلیت میں جو لذت ہے جی تو یہی چاہتا ہے کہ اس لذت سے خوب دل کھول کر منتفع ہوں، مگر چونکہ وفا کی راہ سراسر تگ و دو کی دھاری پر ہے اس لئے پہلے ہی قدم پر ہوت نظر آتی ہے۔ پس افسوس ہے کہ لذت کی حسرت دل کی دل ہی میں رہی جاتی ہے۔

الفبت لعل سے غنا ہے دعویٰ در شالی سر دہے باد صعب آزادی گرفتار چمن
طلب یہ سب سے لکھوئی کیسا ہی آزاد و وارستہ مزاج ہو دنیا میں عشق و محبت کے پھندے سے نہیں
بھڑکتا سکتا۔

ہے پرے سرحد اور اک سے اپنا کجورد قبلہ کو اہل ظنہ قبلہ ناکتے ہیں
قبلہ پر قبلہ ناکا اطلاق ظاہر امرزاکے سوا کسی نے نہیں کیا۔

ر نہ مشوق نہ رسوا ہوا جاے در نہ مرجانے میں کچھ بھید نہیں
بھید کے معنی پوشیدہ بات کہیں؛ خواہ پوشیدہ مصلحت ہو، اور خواہ پوشیدہ قباحت ہو۔ یہاں پوشیدہ قباحت مراد ہے اگر مرجانے کی جگہ نہ مرنے کا لفظ ہوتا تو بھید کے معنی پوشیدہ مصلحت کے ہو جاتے۔

کتے ہیں جیتے ہیں امید پر لوگ ہم کو جینے کی بھی امید نہیں
یہ شعر سہل و مستح ہے اس زمین میں اس سے بہتر شعر نانا مشکل ہے۔

کل کے لئے کراچ نہ نشت شراب میں یہ سو دنن ہے ساقی کوثر کے اب میں
یعنی آج اس خوف سے شراب دینی کہ کل نہ لیلی ساقی کوثر کی قیامی پر سو دنن کرنا ہے۔

تا پھر نہ انتظار میں فیند آئے عمر بھر آنے کا وعدہ کر گئے آئے جو خواب میں

تو جلتا تھا اور اب پردیس میں ہوں تو بے قدر ہوں۔

مہرباں ہو کے بلا لو مجھے چاہو جس وقت
میں گیا وقت نہیں ہو کہ پھر ابھی سکوں

نہ ہر لہٹا ہی نہیں مجھ کو ستنگر۔ ورنہ
کیا قسم ہے ترے مٹنے کی کہ کھا بھی سکوں

جب کہتے ہیں کہ اُسکو فلاں کام کرنے کی قسم ہے تو اسکے یہ معنی ہوتے ہیں کہ اُسکو اُس کام کے کرنے سے انکار ہے پس عاشق معشوق کے ملنے کی قسم کیونکر کھا سکتا ہے کہتا ہے کہ زہر کچھ تیرے ملنے کی قسم نہیں ہے کہ اُسکو کھانا سکوں مگر چونکہ وہ ملتا نہیں اسلئے نہیں کھا سکتا۔

قرص کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
 رنگ دیگی ہماری فاقہ مستی ایک دن

کس مُنہ سے شکر کیجیے اس لطفِ خاص کا
پرستش ہے اور پامی سخن درمیان نہیں

یوسف نہیں نتیجے دشنام ہی سہی
آخر زباں تو رکھتے ہو تم گردبان نہیں

روح القدس اگرچہ مرہم بنائیں

یہاں ہمزباں کے لفظ میں ایہام ہے ظاہری معنی تو یہی ہیں کہ انسان اور فرشتے کی زبان ایک نہیں ہو سکتی اور دوبرہہ اسمیں یہ اشارہ ہے کہ جیسی فصیح میری زبان ہے ویسی روح القدس کی نہیں

ملف دشت نوردی کوئی تدبیر نہیں

اُسی مطلب کو جو پہلے مصرع میں بیان ہو چکا ہے دوسرے مصرع میں نئے رنگ سے کس خوبی کے ساتھ بیان کیا ہے دشت نوردی کی مانع کوئی تدبیر نہ ہونی اُسکو اس طرح ادا کرنا کہ پانویں چکڑ ہے مگر زنجیر نہیں کمال بلاغت ہے۔

حضرت لذت آزار رہی جاتی ہے جسادہ راہِ وفا جز دمِ شمشیر نہیں

ہے مجھے اب ہر بیماری کا برس کر گھلنا

روتے روتے غمِ فرقت میں فنا ہو جانا

یعنی غمِ فرقت میں روتے روتے تمام ہو جانا میرے نزدیک ایک ایسی معمولی بات ہے جیسے ابرہاری
سکابرس کرکھٹنا یہ بالکل نرالی تشبیہ ہے۔

مُندگیتیں کھولتے ہی کھولتے اکھیں غالب

یار لائے مرے یا لیں یہ اُسے پر کس وقت

کہتے ہیں جب یہی نہ مجھے طلاقِ سخن

جانوں کیسے دل کی میں کیونکر کہے بغیر

بغراہوں میں تو جیسا ہے دنیا ہر القہات

سنتا نہیں ہوں بات مکرر کہے بغیر

وا حسرتا کہ یار نے کھینچیا ستم سے ہاتھ

ہم کو جس طرح لڑتے آزار دیکھ کر

پک جاتے ہیں ہم آپ متاعِ سخن کے ساتھ

لیکن عیار طبعِ حسرت پر اور دیکھو

ان آبلوں سے یانوں کے گہر اُگیا تھا۔

جی خوش ہوا ہے راہ کو نرفار و کھیکہ

سرکھوڑنا وہ غالب شہزادہ حال کا

یاد آگیا مجھے تری دیوار دیکھ کر

یارپ نہ وہ سمجھے ہیں نہ سمجھنے کی مریت

دے اور دل اُنکو جو تہ دے مجھکو نہ ہاں اور

یہ شعر نیا ہر معشوق کے حق میں معلوم ہوتا ہے گلوں میں درپردہ اُن لوگوں کی طرف بھی اشارہ ہے جو مرزا کے کلام کو بے معنی یا بعید الفہم کہتے تھے۔

ہر چند سبکدست ہوئے بیت شکنی میں

ہم نہیں تو ابھی راہ میں ہے سنگ گراں اور

اس شعر میں سارا زور ہم کے لفظ پر ہے یعنی جب تک کہ ہماری ہستی باقی ہے اسوقت تک راہ معرفت

آئی میں ایک اور سنگ گراں سہرا ہے پس اگر ہم نے بت توڑنے میں سبکدستی حاصل کی ہے

تو کیا فائدہ؟ یہ بڑا بھاری بیت معنی ہماری ہستی تو ابھی موجود ہے۔

ثابت کی ہے۔

رخصتِ نالہ مجھے دے کہ مبادا ظالم
یعنی اگر نالہ کی اجازت نہوگی تو ہم اُسکو ضبط کرنیگی اور اُسکا اثر تجھ تک پہنچے گا۔

رات دن گردش میں ہیں سآت آسماں
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبراہٹیں کیا
عمر بھر دیکھا کیا مرنے کی راہ
مر گئے پر دیکھئے دکھلائیں کیا

دکھلائیں کا مرجع خدا کو ٹھہرایا ہے کتا ہے کہ عمر بھر موت کا منتظر رہا کہ وہ حالتِ زندگی سے فرو
بہتر ہوگی اب دیکھئے مرنے کے بعد کیا حالت دکھلاتے ہیں جبکہ تمام عمر منتظر لگا ہے۔

رحمت اگر قبول کرے کیا بعید ہے
شرِ زندگی سے عندِ رنہ کرنا گناہ کا
حریفِ جوشِ دریا نہیں خود داریِ ساحل
جہاں ساقی ہو تو دعوئی ہے بل ہوشیاری کا

یعنی ساحل لاکھ اپنے تئیں بچائے مگر خب دریا طغیانی پر آتا ہے تو ساحل محفوظ نہیں رہ سکتا اسی طرح
جہاں تو ساقی ہو وہاں ہوشیاری کا دعوئے چل نہیں سکتا یہ حقیقت و مجاز دونوں پر محمول ہو سکتا ہے۔

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
در و کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا
یعنی جب در و حد سے گزر جائیگا تو مرجانیٹکے یعنی فنا ہو جائیٹکے گویا قطرہ دریا میں کھپ جائیگا اور یہی
اُسکا مقصود ہے پس در و کا حد سے گزر جانا یہی اُسکا دوا ہو جانا ہے۔

تجھے قسمت میں مری صورتِ قفلِ مجید
تھا لکھا بات کے بنتے ہی جدا ہو جانا
صنعت سے گریہ مبدلِ بدمِ سرد ہوا
با و ر آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا
دل سے مٹنا بڑی انگشتِ خانی کا خیال
ہو گیا گوشت سے ناخن کا جدا ہو جانا

کیا کمال ہے یہ تو ہمارے انداز کا شعر ہے، ”غرضکہ ایک ہمعصر دوسرے ہمعصر کی تعریف بھی کرتا ہے تو اُس میں ایک نہ ایک بات ضروری شامل کر دیتا ہے جس سے یا اُسکی تنقید لازم آئے یا اپنی تعریف اُس سے بھی زیادہ نکلتی۔“

آئینہ دیکھ اپنا سامنے لے کے رہ گئے
صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غور تھا
مرنے کی اسے دل اور ہی تدبیر کر کے
شایان دست دبا دوسے قاتل نہیں رہا
رشتہ کہتا ہے کہ اُسکا غیر سے اخلاص
عقل کہتی ہے کہ وہ بے مہر کس کا آشنا
ذکر اُس پریوش کا اور پھر بیاں اپنا
بن گیا رقیب آخر تھا جو راز داں اپنا
کہتا ہے کہ میں نے جو معشوق کے حسن کی تعریف کی تو جو شخص میرا محرم راز اور ہمنشین تھا وہی سنگر
میرا رقیب بن گیا؛ کیونکہ اول تو ایسے پریوش کی تعریف تھی اور وہ بھی مجھ جیسے جادو بیان
کی زبان سے پہلے مصرع کا دوسرا رکن یعنی ”اور پھر بیاں اپنا“ یہ مرزا کی خصوصیات
میں سے ہے۔

دے وہ جس قدر ذلت ہم ہنسی میں ٹالینگے
بارے آشنا نکلا اُن کا پاساں اپنا
یعنی خوب ہی ہوا کہ معشوق کے در کا پاساں ہمارا جان پہچان نکلا؛ اب ہمارے لئے اس بات کا
موقع حاصل ہے کہ وہ جس قدر چاہے، حکومت دے ہم اُسکو ہنسی میں ٹالتے رہیں گے؛ اور یہ
ظاہر کرینگے کہ ہمارا قدیم آشنا ہے؛ چار اُسکا قدیم سے ہی بڑا دوست ہے۔

ہم کہاں کے دانا تھے کس ہنرمیں کہتا تھے
بے سبب ہوا غالب دشمن آسماں اپنا
آسماں کی دشمنی کے کیا خوب اسباب بتائے ہیں اور اپنی دانائی اور ہنرمندی کس خوبصورتی سے

عاشقانہ
عاشقانہ
عاشقانہ
عاشقانہ

خفاقت

شکوہ

خندہ گل کو خندہ بے جا اس لئے کہا ہے کہ وہ کچھ سمجھ کر یا زراہ تعجب نہیں ہنستا، پس گویا اسکا خندہ بے محل ہے۔

فلک کو دیکھ کے کرناہوں اُسکو یاد آئے
 جہاں میں اُسکی ہے اندازِ کار و فرما کا
 یعنی فلک کو دیکھ کے خدا یاد آتا ہے ؛ کیونکہ فلک سے جو جہاں سرزد ہوتی ہے اُسکے حکم سے ہوتی ہے۔
 میں اور بزمِ مے سے یوں تشنہ کام آؤں
 گر میں نے کی تھی توبہ ساقی کو کیا ہوا تھا
 یعنی اُس نے زبردستی کیوں نہ پلا دی ؟

گھر ہمارا جو نہ روتے بھی تو دیراں ہوتا
تنگے دل کا گلا کیا یہ وہ کافر دل ہے
پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھنؤ نپا حق
یعنی ہمارے جرم کے ثبوت کے لئے کسی کی شہادت ہونی ضرور ہے یا صرف فرشتوں کا لکھنا
کافی نہیں۔

جب تک کہ نہ دیکھا تھا قدرِ بار کا عالم
میں معقبتِ فتنہ محشر نہوا تھا
دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک
میرا سر دامن بھی ابھی تر نہوا تھا
کہتا ہے کہ گناہ کرنے میں ہمارا حوصلہ اس قدر فراخ ہے کہ باوجودیکہ دریائے معاصی خشک ہو گیا
مگر ابھی ہمارے دامن کا پتہ تک نہیں بھگیگا۔ تذکرۂ انجیات میں لکھا ہے کہ ذوقِ اس سفر کو نہایت
پسند کرتے تھے؛ اور کہتے تھے کہ مرزا کو اپنے اچھے شعروں کی خود خبر نہیں ہوتی۔ یہ بعینہ وہی سی ہی بات
ہے جیسے مولانا آزاد نے مرزا کا ایک عمدہ شعر سنکر اسکی تعریف کرتے وقت کہا تھا کہ وہ اس میں مرزا کا

حساب دنیا پڑتا ہے ۔

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بیٹے ہیں دوست ناصح
کون کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا
جو دونی کی بوجھی ہوتی تو کہیں دو چار ہوتا
تجھے ہم دلی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

سننا ہے کہ جس وقت یہ غل مزارے بادشاہ کو سنائی تو بادشاہ نے مقطع سنکر کہا ابھیسی ہم توجہ بھی
ایسا نہ سمجھتے ” مزارے نے کہا ” حضور تو اب بھی ایسا ہی سمجھتے ہیں مگر یہ اس لئے ارشاد ہوا ہے کہ
میں اپنی ولایت پر مغرور نہ ہو جاؤں “

نہ مارا جان کر بے جرم قاتل تیری گردن پر
کہتا ہے کہ تو نے ایک مشتاق قتل کو بے جرم سمجھا اس لئے قتل نہیں کیا کہ خون بیگناہ اپنی گردن
پر نہ لے لگا اب تیری گردن پر بیگناہ خون بیگنہ کے حق آشنائی کا رہیگا۔

سب کے دلیں ہے جگہ تیری جو تو راضی ہوا
کیا وہ غرود کی خدائی تھی؟
مجھے گویا ارک زمانہ مہرباں ہو جائے گا
بندگی میں مرا بھلا نہوا

کہتا ہے کہ میری بندگی کیا غرود کی خدائی تھی کہ اس سے مجھ کو سوا نقصان کے کچھ فائدہ نہ پہنچا
یہاں بندگی سے مراد عبادت نہیں ہے بلکہ عبودیت ہے۔ بندگی پر غرود کی خدائی کا اطلاقی کرنا
بالکل نئی بات ہے۔

جان دی ۔ دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا
غم فراق میں تکلیف سیر گل مست دو
مجھے دماغ نہیں خندہ ہاے بجا

خط میں لکھتے ہیں کہ ”دو بھائی! شاعری معنی آفرینی ہے قافیہ پیمائی نہیں ہے“

اگرچہ مرزا کی اردو شاعری پر بحث کرنے کے لئے ابھی بہت کچھ لکھنے کی گنجائش ہے لیکن چونکہ لوگوں کو ایسی باتوں سے زیادہ دلچسپی نہیں ہے اس لئے ہم اس بحث کو ختم کرتے ہیں اور صرف اس بات پر اکتفا کرتے ہیں کہ مرزا کے دیوانِ ریختہ میں جس قدر اشعار سرسری نظر میں ممتاز معلوم ہوں وہ بطور انتخاب کے یہاں نقل کر دئے جائیں۔ جو اشعار اس سے پہلے مثالوں میں لکھے جا چکے ہیں ان کو اب مکرر نہ لکھیں گے اور جہاں ضرورت ہوگی شعر کے معنی بھی بتائیں گے اور کہیں کہیں محاسنِ شعری کی طرف بھی اشارہ کیا جائیگا

ستائشگر ہے زاہد اس قدر جس باغِ رضواں کا وہ اک گلہ ستہ ہے ہم بخودوں کے طاقِ نسیاں کا
طاقِ نسیاں وہ طاق جس میں کچھ رکھ کر بھول جائیں۔ طاقِ نسیاں کا گلہ ستہ وہ گلہ ستہ جس کو طاق میں رکھ کر بھول جائیں۔ بخودوں کے بہشت کو گلہ ستہ طاقِ نسیاں سے تشبیہ دینا بالکل ایک ترائی تشبیہ ہے جو کہیں نہیں دیکھی گئی۔

محرم نہیں ہے تو ہی نواہے راز کا یہاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا
یعنی راز کے نفوس سے تو خود ہی نا آشنا ہے؛ ورنہ دنیا میں جو بظاہر حجاب نظر آتے ہیں وہ بھی پردہ ساز کی طرح بول رہے اور سچ رہے ہیں، اور اسرارِ الہی ظاہر کر رہے ہیں۔

ایک ایک قطرہ کا مجھے دینا پڑا حساب خونِ جگر و دیمتِ مرگانِ یارِ حقیقی
یعنی آنکھوں سے اس قدر خون جاری رہتا ہے کہ گویا جگر میں جتنا خون تھا وہ مرگانِ یار کی انتہی، اور اس لئے اسکے ایک ایک قطرہ کا حساب اسی طرح دینا پڑیگا جس طرح امانت کا

وعدے وفا کرنے، پانچویں میں آپ اپنے پر رشک انا، چھٹے میں دل رنجور کا نقش مدعا غم
کی طرح بیٹھا جانا، ساتویں میں کینچنے سے نقش کا مصور سے کھینچنا، آٹھویں میں مٹتے مٹتے آپ
اپنی مٹم ہو جانا، نویں میں آپ اپنی ہمت عالی کے ہاتھ بک جانا، دسویں میں باوجود موت
آنے کے موت نہ آنی، یہ سب متاخرانہ تراکتیں ہیں جو ولی سے لیکر میر، سودا اور درد
تک کے کلام میں نہ تھیں؛ اور اگر تھیں تو صرف اُس قدر جیسے آٹے میں نمک۔

اگرچہ ایران میں زمانہ حال کے شعرا ظہوری و عرفی و طالب و اسیر وغیرہ کی طرز کو ناپسند
کرتے ہیں اور ہندوستان میں بھی روز بروز طبیعتیں نچرل شاعری کی طرف مائل ہوتی جاتی ہیں۔
جب کا نتیجہ یہ ہونا چاہئے کہ رفتہ رفتہ اس مٹم کے تکلفات و تراکتیں نظروں سے گر جائیں۔
لیکن یہ سب زمانے کے مقتضیات ہیں جو ہمیشہ بدلتے رہتے ہیں ایسی باتوں سے اُن
لوگوں کی استادی اور گرانماگی میں کچھ فرق نہیں آتا جن کو نئی طرز کے موجد ہونیکا فخر حاصل تھا۔
بہر حال جو نسبت ظہوری، نظیری، عرفی، طالب، اسیر وغیرہم کے کلام کو سعدی،
خسرو، مہر، اور جامی کے کلام سے ہے تقریباً ویسی ہی نسبت مرزا کے ریختہ کو میر، بسوا
و درد کے ریختہ سے سمجھنی چاہئے۔ قدامت و روزمرہ اور صفائی بیان کو سب باتوں سے
زیادہ اہم اور مقصود بالذات جانتے تھے؛ برخلاف متاخرین کے کہ وہ ہر شعر میں ایک نئی بات
پیدا کرنے اور اسالیب بیان میں نئے نئے تعجب انگیز اور لطیف و پاکیزہ اختراعات کرنے ہی کو
اکمال شاعری سمجھتے تھے اور زبان کی صفائی اور روزمرہ کی نشست کو محض خیالات کے
ظاہر کرنے کا ایک آلہ (نہ کہ مقصود شاعری) تصور کرتے تھے۔ چنانچہ مرزا ایک دوست کو

نواب مرزا خاں داغ نے اسی مضمون میں مخفی طرح کی نزاکت پیدا کی ہے۔ وہ کہتے ہیں
 سچ روشن کے آگے شمع رکھ کر دیکھتے ہیں اور مر جاتا ہے دیکھیں یا اور حریر چڑھتا ہے
 الغرض اس قسم کی معنی آفرینیاں، نواب، مومن اور ان کے متبعین کے کلام میں بہت پائی
 جاتی ہیں۔ چونکہ اس موقع پر صرف مرزا کے کلام پر بحث کرنی مقصود ہے اسلئے چند شعر مرزا کی
 تعریات میں سے اسی قبیل کے یہاں نقل کئے جاتے ہیں

مضمت سے اسے گریہ کچھ پاتی مرزوں میں نہیں	زنگ ہو کر اڑ گیا جو خوں کو دامن میں نہیں
غلط ہے جذبہ دل کا شکوہ۔ دیکھو جو ہم کیا ہے	دیکھیں جو گرم اپنے کو کشاکش دریاں کیوں ہو
اگر نہ لگا ہے باغ میں تو بے حجابیاں	آنے لگی ہے نکمت گل سے حیا نے مجھے
نقد کی ہے اور بات۔ مگر خو بُری نہیں	بھڑے سے آنے سیکروں وعدہ و وفا کئے
دیکھنا قسمت کو آپ اپنے پہ رشک آج ہے	میں آسے دیکھوں بھلا کب مجھے کیا جاوے
اشکی بزم آرائیاں سنکر دل بخور بھیاں	مثل نقش مدعائے غیر بیٹھا جاوے ہے
نقش کو آسکے۔ مصدور پر بھی کیا کیا ناز ہیں	کھینچتا ہے جس قدر آنا ہی کھینچتا جاوے ہے
ہستی ہماری اپنی فنا پر دلیل ہے	یہاں تک سٹھے کو آپ ہم اپنی قسم ہووے
نسیہ و نقد دو عالم کی حقیقت معلوم	لے لیا مجھے مری ہمت عالی نے مجھے
مڑتے ہیں آرزو میں مرنے کی	موت آتی ہے پہ نہیں آتی

پہلے شعر میں خون کا زنگ ہو کر اڑ جانا، دوسرے میں عاشق کے ہذبہ اور معشوق کی کشیدگی
 سے کشاکش کا لازم آنا، تیسرے میں نکمت گل سے حیا آتی، چوتھے میں بھڑے سے سیکرے

اس لئے نئی طرز کے ایجاد کرنے کی ضرورت نہ تھی بلکہ جو طرز فارسی میں متاخرین نکال چکے تھے اُسی کو ریختہ میں ڈھالنا تھا۔

یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ مرزا غالب نے سب سے پہلے یہ طرز اختیار کی تھی؛ کیونکہ حبش کی میٹری کے دون ہونے اور علم کے درجے پر پہنچنے سے پہلے اس کے متفرق اصول مشرقی ملکوں میں بھی پائے جاتے تھے اسی طرح مرزا سے پہلے بھی بعض شعرا کے کلام میں اس نئی طرز کی کہیں کہیں جھلکی سی نظر آجاتی ہے مگر ہمیں شک نہیں کہ اول مرزانے اور انھیں کی تقلید سے مومن، شیفتہ، تسکین، سالک، عارف، دغ وغیرہم نے اس طرز کو بہت زیادہ رواج دیا۔ خصوصاً مومن خاں مرحوم اس خصوصیت میں مرزا سے بھی سبقت لے گئے ہیں۔ یہاں ایسی ایک دو مثال لکھنی مناسب معلوم ہوتی ہے جس سے ناظرین بخوبی سمجھ جائیں کہ متاخرین کے اس خاص کردہ نے قدما کے سیدھے سادے خیالات اور معمولی اسلوبوں میں کس قسم کی تراکتیں اور لفظی و معنوی تصرفات کر کے ان میں تندرست اور طرنگی پیدا کی ہے۔ مثلاً میر تقی کا شعر ہے۔

میری تغیر رنگ پر مت جا اتفاقات ہیں زمانے کے
اسی تغیر رنگ کے مضمون کو مومن خاں نے اس طرح بانڈھا ہے۔

میری تغیر رنگ کو مت دیکھ تجھکو اپنی نظر نہ ہو جائے
یا مثلاً خواجہ میر درد نے معشوق کے رُخ روشن کو شمع پر اس طرح ترجیع دی ہے۔
رات مجلس میں ترے حسن کو شعلے کو خضو شمع کے منہ پہ جو دیکھ تو کہیں نور نہ تھا

غزل میں بقایہ سدی، حافظ، خسرو وغیرہم کی غزل کے ہم اسی قسم کا تفاوت پاتے ہیں۔
مثلاً خواجہ حافظ کہتے ہیں۔

گناہ اگرچہ بنود اختیارِ ماحافظ تو در طریق ادب باش و گناہِ مست
نظیری نے اسی مضمون کو حقیقت سے مجاز میں لاکر اسمیں ایک نئی طرح کی نزاکت پیدا کی ہے۔
وہ کہتا ہے۔

تا متفعل ز رخسارِ بے جانہ بینش مے آرم اعترافِ گناہِ بنودہ را
یا مثلاً دوسری جگہ خواجہ حافظ کہتے ہیں۔

از عدالت بنود و رگزش پر سدِ حال پادشاہ ہے کہ بہم سایہ گداہئے دارد
ظہوری کے ہاں یہ سیدھا سادہ خیال ابراہیم عادل شاہ کے حق میں۔ جو کہ اسکا مدوح
بھی ہے اور محبوب بھی۔ ایک نئے انداز سے بندھا ہے۔ وہ کہتا ہے۔

مرقت کردہ شہساز تو سیرِ بام و دلائم نئے باشند چراغی۔ خائبے تنگاہاں را
یعنی چونکہ بے مقدور لوگوں کے گھر میں چراغ نہیں ہوتا اس لئے مرقت اور گرم نے تجھ پر
لازم کر دیا ہے کہ راتوں کو کوٹھے پر چڑھ کر ٹھلا کر تیرے چہرے کی روشنی سے آنکے گھر
میں چاندنا ہو جائے۔ مطلب یہ کہ آنکے حال سے واقعہ ہو کر انکی مدد کرے۔

مگر یہ انقلاب فارسی غزل میں کم و بیش چار سو برس بعد ظہور میں آیا تھا کیونکہ نئی طرزِ اسلوب
تک ایجاد نہیں ہوتی جب تک ضرورتیں اہل فن کو سخت مجبور نہیں کرتیں۔ لیکن رنجیت میں یہ
انقلاب ڈیڑھ سو برس کے اندر اندر پیدا ہو گیا، کیونکہ متاخرین اہل ایران کا نمونہ موجود تھا

مذکورہ بالا خصوصیتوں کے علاوہ ایک دربات قابل ذکر ہے جو مرزا اور ان کے بعض معاصرین و متبعین کی غزل میں عموماً پائی جاتی ہے۔ یہ امر ظاہر ہے کہ ریختہ کی بنیاد فارسی غزل پر رکھی گئی ہے۔ جو جذبات اور خیالات اہل ایران نے غزل کے پیرائے میں ظاہر کئے ہیں ریختہ گوؤں نے زیادہ تر بلکہ بالکل انھیں کو اپنی زبان کے سانچے میں ڈھالا ہے۔ پس جو انقلاب ایک مدت کے بعد فارسی غزل میں پیدا ہوا۔ ضرور تھا کہ وہی انقلاب اردو غزل میں ایک عرصے کے بعد پیدا ہو۔

قدماے اہل ایران جن کا دورہ مولانا جامی پر ختم ہوتا ہے ان کی غزل میں جو جذبات و خیالات بیان ہوئے ہیں وہ اپنی نچرل حالت سے متجاوز نہیں ہوئے؛ اور گوا سالیب بیان میں تلاحق افکار کے سبب رفتہ رفتہ وسعت اور لطافت پیدا ہو گئی لیکن بیان کا طریقہ نچرل سادگی کی حد سے آگے نہیں بڑھا۔ مگر چونکہ خیالات نہایت محدود تھے ایک مدت کے بعد جتنے سیدھے سادے عمدہ اور لطیف اسلوب تھے وہ سب نہر گئے اور متاخرین کے لئے ایک چھوڑی ہوئی ہڈی کے سوا اور کچھ باقی نہ رہا۔ اگر متاخرین غزل کو ہر قسم کے خیالات ظاہر کرنے کا آلہ بناتے تو ان کے لئے میدان غیر متناہی موجود تھا مگر انھوں نے اس محدود دائرے سے باہر نکلنا نہ چاہا؛ اب جو لوگ تقلید کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے انھوں نے تو اسی چھوڑی ہوئی ہڈی پر قناعت کی؛ مگر جبکی فطرت میں ارجنیلٹی اور اُپچ کا مادہ تھا وہ انھیں قدیم خیالات و جذبات میں اپنے اپنے مبلغ فکر کے موافق تزکیتیں اور لطافتیں پیدا کرنے لگے۔ چنانچہ نظیری، ظہوری، عرفی، طالب، اسیر اور ان کے اقران و امثال کی

فی الواقع تم جیسے ایک دو حسین موجود ہوں تو تم کیا قیامت برپا کرو۔

کیا خوب باتم نے غیر کو بوسہ نہیں دیا بس چپ ہو ہمارے بھی منہ میں زبان ہے ہمارے بھی منہ میں زبان ہے، "اے دو معنی رکھتے ہیں؛ ایک یہ کہ ہمارے پاس ایسے ثبوت ہیں کہ اگر بولنے پر آئے تو تم کو قائل کر دیں گے؛ اور دوسرے شوخ معنی یہ ہیں کہ ہم زبان سے ہلکھکتا سکتے ہیں کہ غیر نے بوسہ لیا ہے یا نہیں۔

زندگی میں تو وہ محفل سے اٹھا دیتے تھے دیکھو اب مر گئے پر کون اٹھاتا ہے مجھے "کون اٹھاتا ہے مجھے،" اسکے دو معنی ہیں۔ ایک تو یہ کہ زندگی میں تو مجھے محفل سے اٹھا دیتے تھے اب مرنے کے بعد دیکھو مجھے وہاں سے کون اٹھاتا ہے؛ اور دوسرے معنی یہ ہیں کہ محفل سے تو اٹھا دیتے تھے دیکھو اب میرا جنازہ کون اٹھاتا ہے۔

ہے ہوا میں شراب کی تاثیر بادہ نوشی ہے باد پیمائی

یہ شعر بہار کی تعریف میں ہے۔ اے باد پیمائی کے لفظ نے دو معنی پیدا کر دیے ہیں؛ باد پیمائی عبت کام کرنے کو کہتے ہیں؛ پس ایک معنی تو اسکے یہ ہیں کہ فصل بہار کی ہوا ایسی نشا نگیز ہے کہ گویا اسی شراب کی تاثیر پیدا ہو گئی ہے۔ اور جب کہ یہ حال ہے تو بادہ نوشی محض باد پیمائی یعنی فصول کام ہے۔ اس صورت میں بادہ نوشی مبتدا ہوگا؛ اور باد پیمائی خبر دوسرے معنی یہ ہیں کہ باد پیمائی کو مبتدا اور بادہ نوشی کو خبر قرار دیا جائے؛ اور جس طرح بادہ پیمائی کے معنی بادہ خواری کے ہیں اسی طرح باد پیمائی کے معنی ہوا کھانے کے لئے جائیں۔ اس صورت میں یہ مطلب نکلے گا کہ آج کل ہوا کھانا بھی شراب پینا ہے۔

نسبت کوئی گستاخی کرتا تو اُسکو گوارا نہوتی ؛ اور یا اب ہمکو بالکل نظر سے گرا دیا گیا ہے۔ اور دوسرے
 عہدہ معنی یہ ہیں کہ اس شعر میں آدم اور فرشتوں کے اُس قہقے کی طرف اشارہ ہے جو قرآن مجید
 میں مذکور ہے ؛ کہ جب خدا تعالیٰ نے آدم کو پیدا کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تو فرشتوں نے کہا "کیا
 تو دنیا میں اُس شخص یعنی اُس نوع کو پیدا کرنا چاہتا ہے جو اسیں فساد اور خونریزی کرے ؛
 وہاں سے ارشاد ہوا کہ "تم نہیں جانتے جو کچھ میں جانتا ہوں" ، اور پھر آدم سے انکو نزدیک دوائی ؛
 اور حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کریں ۔ کہتا ہے کہ ہم آج دنیا میں کیوں اس قدر ذلیل ہیں کل تک تو
 ہماری ایسی عزت تھی ۔

تبرے سر و قامت سے اک قد آدم قیامت کے فتنے کو کم دستکتے ہیں
 اسکے ایک معنی تو یہی ہیں کہ تبرے سر و قامت سے فتنہ قیامت کتر ہے ۔ اور دوسرے یہ معنی بھی
 ہیں کہ تیرا قد اُسی میں سے بنایا گیا ہے ؛ اسیلے وہ ایک قد آدم کم ہو گیا ہے ۔

سر اُڑانے کے جو وعدے کو مکر چاہا ہنس کے بولے کہ تبرے سر کی قسم ہے ہمکو
 اس شعر میں "تبرے سر کی قسم ہے ہمکو" اس جملے کے دو معنی ہیں ؛ ایک یہ کہ تبرے سر کی قسم
 ہے ہم ضرور سر اُڑائینگے ۔ اور دوسرے یہ کہ ہمکو تبرے سر کی قسم ہے ۔ یعنی کبھی ہم تیرا سر نہ اُڑائینگے
 جیسے کہتے ہیں کہ آپ کو تو ہمارے ہاں کھانے کی قسم ہے ۔ یعنی کبھی ہمارے ہاں کھانا نہیں کھاتے ۔
 اُچھتے ہو تم اگر دیکھتے ہو آئینہ جو تم سے شہر میں ہوں ایک دو کو تو نہ کر ، سو

اسکا مطلب ایک تو یہ ہے کہ تم جیسے نازک مزاج شہر میں ایک دو اور ہوں تو شہر کا کیا حال ہو ؟
 اور دوسرے معنی یہ ہیں کہ جب تمکو اپنے عکس کا بھی اپنی مانند ہونا گوارا نہیں تو شہر میں اگر

اس شعر کے ظاہری معنی یہ ہیں کہ تب سے میں مر گیا ہوں سے مرد افگن عشق کا ساقی۔ یعنی
 معشوق۔ بار بار مصادیقاً ہے یعنی لوگوں کو شراب عشق کی طرقت بلاتا ہے۔ مطلب یہ کہ سیر
 بعد شراب عشق کا کوئی فریاد نہیں رہا۔ اس لئے اسکو بار بار مصادیقہ کی ضرورت ہوئی ہے۔
 غریزہ و غور کرنے کے بعد۔ جیسا کہ مرزا خوجہ بیان کرتے تھے۔ ہمیں ایک نہایت لطیف معنی پیدا
 ہوتے ہیں۔ اور وہ یہ ہیں کہ پلا منہ سے یہی ساقی کی معالکے الفاظ ہیں؛ اور اس مصرع کو
 دو مکرر پڑھا جائے۔ ایک دفعہ بلانے کے لہجہ میں پڑھتا ہے۔ دیکھ کون ہوتا ہے حرفت ہے مرد افگن
 عشق۔ یعنی کوئی ہے جو نے مرد افگن عشق کا حرفت ہو؛ پھر جب اس آواز پر کوئی نہیں آتا
 تو اسی مصرع کو مایوسی کے لہجہ میں مکرر پڑھتا ہے۔ دیکھ کون ہوتا ہے حرفت ہے مرد افگن عشق۔
 یعنی کوئی نہیں ہوتا۔ ہمیں لہجہ اور طرزِ ادا کو بہت دخل ہے۔ کسی کو بلانے کا لہجہ اور ہے؛ اور
 مایوسی سے چپکے چپکے کہنے کا اور انداز ہے۔ جب اس طرح مصرع مذکور کی تکرار کر دے گا فوراً
 یہ معنی ذہن نشین ہو جائیگا۔

کیونکہ اس بُت سے رکھوں جان غریزہ کیا نہیں ہے مجھے ایمان عنبرِ
 اسکے ظاہری معنی تو یہ ہیں کہ اگر اس سے جان غریزہ رکھوں گا تو وہ ایمان لے لیگا؛ اسلئے
 جان کو غریزہ نہیں رکھتا۔ اور دوسرے لطیف معنی یہ ہیں کہ اس بُت پر جان قربان کرنا تو عین
 ایمان ہے؛ پھر اس سے جان کیونکر غریزہ رکھتی جاسکتی ہے۔

ہیں کہ کیوں ذلیل کہ کل تک تھی پسند گستاخی فرشتہ ہماری جناب میں
 اسکے ایک معنی تو یہ ہیں کہ معشوق کو یا تو ہماری خاطر ایسی غریزہ تھی کہ اگر بالفرض فرشتہ بھی ہماری

تمی
ہو۹۰
طی
تھو

شال

شال

تیسری خصوصیت کیا ریختہ میں، اور کیا فارسی میں، کیا نظم میں، اور کیا نثر میں۔ باوجود
 سنجیدگی و متانت کے۔ شوخی و طرافت ہے؛ جیسا کہ مرزا کے انتخابی اشعار سے ظاہر ہوگا۔
 مرزا کے پہلے ریختہ گو شعرا میں دو شخص شوخی و طرافت میں بہت مشہور گذرے ہیں؛ ایک
 سودا، دوسرے انشا؛ مگر دونوں کی تمام شوخی و خوش طبعی ہجو کوئی یا فحش و ہزل میں صرف
 ہوتی؛ بخلاف مرزا غالب کے کہ انھوں نے ہجو یا فحش و ہزل سے کبھی زبانِ قلم کو آلودہ نہیں کیا۔
 چوتھی خصوصیت مرزا کی طرزِ ادا میں ایک خاص چیز ہے جو اوروں کے ہاں بہت کم
 دیکھی گئی ہے؛ اور جبکہ مرزا اور دیگر ریختہ گو یوں کے کلام میں مایہ الامتیاز کہا جاسکتا ہے۔
 اکثر اشعار کا بیان ایسا پہلو دار واقع ہوا ہے کہ بادی النظر میں اُس سے کچھ اور معنی مفہوم ہوتے
 ہیں؛ مگر غور کرنے کے بعد اسیں ایک دوسرے معنی نہایت لطیف پیدا ہوتے ہیں؛ جن سے
 وہ لوگ جو ظاہری معنوں پر قناعت کر لیتے ہیں۔ لطف نہیں اٹھا سکتے۔ یہاں ایسے اشعار
 کی چند مثالیں لکھی جاتی ہیں۔

کوئی دیرانی سی دیرانی ہے دشت کو دیکھ کے گھرایا آیا

اس شعر سے جو معنی فوراً متبادر ہوتے ہیں وہ یہ ہیں کہ جس دشت میں ہم ہیں وہ اس قدر
 دیران ہے کہ اُس کو دیکھ کر گھرایا آتا ہے؛ یعنی خوف معلوم ہوتا ہے۔ مگر ذرا غور کرنے کے بعد
 اس سے یہ معنی نکلتے ہیں کہ ہم تو اپنے گھر ہی کو سمجھتے تھے کہ ایسی دیرانی کہیں نہوگی؛ مگر دشت
 بھی اس قدر دیران ہے کہ اُس کو دیکھ کر گھر کی دیرانی یاد آتی ہے۔

کون ہوتا ہے حریف بے مرد افکن عشق ہے مکر لب ساقی میں صلا میرے بعد

دَم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز پھر تر اوقت سن کر یاد آیا“
 دوست کو رخصت کرتے وقت جو دردناک کیفیت گزری تھی اور جو اُسکے چلے جانے کے بعد
 رہ رہ کر یاد آتی ہے اُس میں جو کبھی کبھی کچھ وقفہ ہو جاتا ہے اُسکو قیامت کے دم لینے سے تعبیر
 کیا ہے۔ ایسے بلیغ شعرا و دو زبان میں کم دیکھے گئے ہیں جو حالت فی الواقع ایسے موقع پر
 گذرتی ہے ان دو مصرعوں میں اُسکی تصویر کھینچی ہے جس سے بہتر کسی اسلوب بیان میں
 یہ مضمون ادا نہیں ہو سکتا۔

دام ہر موج میں ہے حلقہ صد کام سنگ دید کھیں کیا گزرے ہے قطرے پر گہر توڑنگ
 جو مطلب اس شعر میں ادا کیا گیا ہے وہ صرف اس قدر ہے کہ انسان کو درجہ کمال تک پہنچنے
 میں سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

پہناں تھا دام سخت قریب آشیان کے اڑنے نہ پائے تھے کہ گر قنار ہم ہوئے
 جو مطلب اس طریقے سے ادا کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ ہم کو ہوش بنبھانے سے پہلے ہی مصائب
 و شدائد نے گھیر لیا تھا۔

درماندگی میں غالب کچھ بن چپے تو جانوں جب رشتہ بے گرہ تھا ناخن گرہ کشا تھا
 دوسرے مصرع میں یہ مضمون ادا کیا گیا ہے کہ جب مشکلات نے نہیں گھیرا تھا اُس وقت
 اُنکے وضع کرتے کی طاقت تھی۔

ان اشعار میں جیسا کہ ظاہر ہے اصل خیالات سیدھے سادے ہیں؛ مگر استعارے اور تشبیل
 نے ان میں ندرت اور طرفگی پیدا کر دی ہے۔

بہت بچتے تھے، مبتذل مضامین، مبتذل تشبیہیں، مبتذل محاورے، مبتذل ترکیبیں، جس قدر
 اُنکے کلام میں کم لینگلی ظاہر کسی ریختہ گو شاعر کے کلام میں نہیں مل سکتیں مثلاً صلی علی کا
 لفظ جو بجائے سبحان اللہ وغیرہ کے استعمال ہوتا ہے اُسکو وہ کہیں جائز نہیں رکھتے تھے یہاں
 تک کہ شاگردوں کی غزل میں بھی ہمیشہ اس لفظ کو کاٹ کر نام خدا یا کوئی اور لفظ بنا دیتے تھے
 اسی طرح جو محاورے یا الفاظ صرف عوام الناس کی زبان پر جاری ہیں، اور خواص اُنکو
 کبھی نہیں بولتے تا بمقدور وہ اُنکو استعمال نہیں کرتے تھے۔ اگرچہ ہمارے نزدیک ایسا التزام
 کرنے سے زبان کا دائرہ نہایت تنگ ہو جاتا ہے اور لٹریچر کو وسعت دینا جو شاعری کا اصل مقصد ہونا چاہئے وہ
 قوت ہو جاتا ہے مگر مرزا کے کلام میں جو خصوصیتیں ملکہ معلوم ہوئی ہیں اُن کا بیان کرنا ضرور ہے۔

دوسری خصوصیت یہ ہے کہ مرزا نے استعارہ دکنایہ و تمثیل کو جو کہ لٹریچر کی جان اور
 شاعری کا ایمان ہے، اور جسکی طرف ریختہ گو شاعر نے بہت کم توجہ کی ہے۔ ریختہ میں بھی نسبتاً
 فارسی کلام سے کم استعمال نہیں کیا۔ اور شاعر نے استعارے کو صرف محاوراتِ اردو میں بلاشبہ
 استعمال کیا ہے؛ لیکن استعارے کے قصد سے نہیں بلکہ محاورہ بندی کے شوق میں استعارے
 بلا قصد اُنکے قلم سے ٹپک پڑے ہیں۔ یہاں چند مثالیں مرزا کے کلام سے نقل کی جاتی ہیں۔

بجلی اک کو ند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا بات کرتے کہیں لب تشنہ نہ تقریر بھی تھا
 یہاں اس مطلب کو کہ معشوق نے اُن کی اُن اپنی صورت دکھا دی تو اس سے کیا تسلی ہو سکتی
 ہے۔ اس طرح ادا کیا ہے ”بجلی اک کو ند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا“

مرزا کہتے تھے کہ حرفِ جارِ غیر مجبور کے بولنا ایک عامیانہ اور ساقیانہ قول چال ہے۔

میں جو دی کو دیا سے، اگر داب کو شوائہ چوالہ سے، مغز سر کو مینہ بالش سے، داندہ انگوڑ کو عقدہ صال سے، استخوان کو خشت اور بدن کو قالب خشت سے، اور اسی قسم کی اور بہت سی عجیب و غریب تشبیہیں انکے ابتدائی رخیہ میں پائی جاتی ہیں۔ لیکن جس قدر خیالات کی اصلاح ہوتی گئی اسی قدر تشبیہوں میں۔ باوجود مذرت اور طرفگی کے۔ سنجیدگی اور لطافت بڑھتی گئی۔ مثلاً وہ کہتے ہیں۔

ہیں دالِ آمادہ اجزا آفرینش کے تمام مہر گردوں ہے چراغِ رہگذارِ بادیاں

یہاں سورج کو۔ اس لحاظ سے کہ وہ بھی اجزائے عالم میں سے ہے اور تمام اجزائے عالم آمادہ زوال و فنا ہیں۔ چراغِ رہگذارِ باد کے تشبیہ دی ہے؛ جو بالکل نئی تشبیہ ہے۔

دوسری جگہ سورج کو۔ اس لحاظ سے کہ حسنِ معشوق کے مقابلے میں اسکو ناقص الخلقہ قرار دیا ہے۔ ماہِ مخشب کے ساتھ تشبیہ دی ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں۔

چھوڑا ہوا مخشب کی طرح دستِ فغانے خورشیدِ ہنوز اسکے برابر نہوا تھا

ایک جگہ انسان کی زندگی کو اس لحاظ سے کہ جب تک موت نہیں آتی اسکو غم سے نجات نہیں ہوتی۔ شمع سے تشبیہ دی ہے؛ کہ جب تک صبح نہیں ہوتی وہ برابر جلتی رہتی ہے۔ جیسا کہ کہتے ہیں۔

غمِ ہستی کا آسہ کس ہو جز مرگِ علاج شمعِ ہر رنگ میں جلتی ہے سحرِ سوتے تک

اس قسم کی باریع و نادر تشبیہات سے مرزا کے دونوں دیوانِ اردو اور فارسی بھرے ہوئے ہیں قطع نظر تشبیہات کے مرزا ہر ایک بات میں جیسا کہ پہلے جھٹے میں بیان ہو چکا ہے ابتداء سے

رہا آباد عالم اہل ہمت کے نہونے سے بھرے ہیں عقیدہ عالم و سب مینجانہ خالی ہے
 یہ خیال شاید کسی اور کے دل میں بھی گذرا ہو مگر تشکیل نے اس کو بالکل ایک اچھوتا مضمون بنا دیا
 اور شکر کو نہایت بلند کر دیا ہے کہتے ہیں کہ دنیا میں اگر اہل ہمت کا وجود ہوتا جو دنیا کو محض ناچیز سمجھ کر اسکی
 طرف التفات نہ کرتے تو دنیا ویران ہو جاتی پس یہ جانتا چاہئے کہ عالم اسی سبب آباد نظر آتا ہے کہ
 اہل ہمت مفقود ہیں یعنی محیط مینجانے میں عالم و سب کو کائنات کے پھر اہل ہمت اس بات کی دلیل ہے کہ مینجانے میں کوئی
 مینجو نہیں ہے اسی طرح عالم کا آباد و مہمور ہونا نہ لالت کرتا ہے کہ اسی اہل ہمت معدوم ہیں۔
 منحصر مرنے پہ ہو جسکی امید ناامیدی اسکی دیکھا چاہئے
 ناامیدی کی غایت اس سے بڑھ کر اور ایسی خوبی سے شاید ہی کسی نے بیان کی ہو۔
 ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملو یار بیاگران کردہ گناہوں کی سزا ہے
 یعنی جو گناہ ہم نے کئے ہیں اگر انکی سزا ملنی ضرور ہے تو جو گناہ بسبب عدم قدرت کے ہم نہیں کر سکے
 اور انکی حسرت دل میں رہ گئی انکی داد بھی ملنی چاہئے۔

علاوہ جدت مضامین اور ظرفی خیالات کے اور بھی چند خصوصیتیں مرزا صاحب کے
 کلام میں ایسی ہیں جو اور ریختہ گوئیوں کے کلام میں شاذ و نادر پائی جاتی ہیں (اولاً عام اور متبذل تشبیہیں
 جو عموماً ریختہ گوئیوں کے کلام میں متداول ہیں مرزا جہاں تک ہو سکتا ہے ان تشبیہوں کو استعمال
 نہیں کرتے بلکہ تقریباً ہمیشہ نئی نئی تشبیہیں ابداع کرتے ہیں۔ وہ خود ایسا نہیں کرتے بلکہ خیالات
 کی جدت ان کو جدید تشبیہیں پیدا کرتے پر مجبور کرتی ہے) ان کے ابتدائی ریختہ میں
 جو تشبیہیں دیکھی جاتی ہیں وہ اکثر غریب سے خالی نہیں ہیں۔ مثلاً سانس کو موج سے،

بیٹھ رہتے، اور شوق و آرزو کی خلش سے چھوٹ جاتے؛ مگر مشکل یہ ہے کہ وہ جس طرح آسان نہیں اسی طرح دشوار بھی نہیں؛ اور اس لئے شوق و آرزو کی خلش سے کسی طرح نجات نہیں ہوتی۔

وفا داری بشرط استواری اصل ایمان ہے بڑے تجانے میں تو کبے میں گاڑو برہمن کو
یعنی جب برہمن اپنی ساری عمر تجانے میں کاٹ دے، اور وہیں مر رہے، تو وہ اس بات کا
سحق ہے کہ اُسکو کبے میں دفن کیا جائے؛ کیونکہ اُسے وفاداری کا حق پورا پورا ادا کر دیا؛ اور
یہ ایمان کی اصل ہے۔

طاعت میں تار ہے نہ غے و انگیں کی لاگ دو زخ میں ڈال دو کوئی لیکر بہشت کو
یعنی جب تک بہشت قائم ہے لوگ عبادت اس امید پر کرتے ہیں کہ وہاں شہد اور شہرِ طیب
وغیرہ ملے گی؛ پس بہشت کو دو زخ میں جھونک دینا چاہئے تاکہ یہ لالچ باقی نہ رہے اور لوگ
خاصاً توجہ اللہ عبادت کریں۔

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اُسے کہا میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میری ہے
کسی کے حسن بیان کی اس سے بہتر تعریف نہیں ہو سکتی کہ جو بات قائل کے منہ سے نکلے وہ سامع
کے دل میں اس طرح اتر جائے کہ اُسکو یہ شبہ ہو کہ یہ بات پہلے ہی سے میرے دل میں تھی۔
اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا جامِ جم سے یہ مرا جامِ سفال اچھا ہے
جامِ جم پر جامِ سفال کو کس خوبی سے ترجیح دی ہے کہ اُسکی کچھ تعریف نہیں ہو سکتی اور بالکل نیا
خیال ہے جو کہیں نظر سے نہیں گذرا۔

سالک کو تمام موجوداتِ عالم میں حق ہی حق نظر آئے اسکو شہود کہتے ہیں۔ اور غیبِ افسانہ سے مراد مرتبہ احدیت ذات ہے جو عقل و ادراک و بصیرت سے ورار و رار ہے۔ کہنا ہے کہ جسکو ہم شہود سمجھے ہوئے ہیں وہ درحقیقت غیبِ افسانہ ہے۔ اور اسکو غلطی سے شہود سمجھنے میں ہماری ایسی مثال ہے جیسے کوئی خواب میں کھے کہ میں جاگتا ہوں۔ پس کہ وہ اپنے تئیں بیدار سمجھتا ہے مگر فی الحقیقت وہ ابھی خواب ہی میں ہے۔ یہ مثال بالکل نئی ہے؛ اور اس سے بہتر اس مضمون کے لئے مثال نہیں ہو سکتی۔

۱۔ نظر لگے نہ کہیں اُسکے دست و بازو کو یہ لوگ کیوں جڑے زخم جگر کو دیکھتے ہیں
عشقِ حقیقی ہو یا مجازی اُسکے زخم کی گہرائی اس سے بہتر کسی اسلوب میں بیان نہیں ہو سکتی۔
۲۔ سچ سے خوگر ہوا انسان تو بٹ جاتا ہر سچ مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آسان ہو گئیں
یہ خیال بالکل اچھوتا ہے؛ اور زرا خیال ہی نہیں بلکہ فیکٹ ہے؛ اور ایسی خوبی سے بیان ہوا ہے کہ اُس سے زیادہ تصویر میں نہیں اُسکتا۔ مشکلات کی کثرت کا اندازہ ضدِ حقیقی یعنی اُنکے آسان ہو جانے سے کرنا درحقیقت حسنِ مبالغہ کی معراج ہے۔ جس کی نظیر آج تک نہیں دیکھی گئی۔

۳۔ مناسبت اگر نہیں آسان تو سہل ہے دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں
ایک فیکٹ کے بیان میں ایسے متناسب محاورات کا دستیاب ہو جانا عجیب اتفاق ہے۔
اس مضمون کو چاہو حقیقت کی طرف لجاؤ، اور چاہو مجاز پر محمول کرو، دونوں صورتوں میں مطلب یہ ہے کہ اگر تیرا ملنا آسان نہ تھا۔ یعنی دشوار ہوتا۔ تو کچھ دقت نہ تھی؛ کیونکہ ہم یوں کر

آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یادِ مجھ سے میرے گنہ کا حساب یا بخدا مانگ

اس میں بھی نئی طرح کی شوخی ہے جو بالکل اچھوتی ہے۔ بظاہر درخواست کرتا ہے کہ اسے خدا مجھ سے میرے گناہوں کا حساب نہ مانگ؛ اور درپردہ الزام دیتا ہے؛ گویا یہ کہتا ہے کہ گناہوں کا حساب کیونکر دوں؟ وہ شماریں اس قدر زیادہ ہیں کہ جب انکو شمار کرتا ہوں تو وہ داغِ جو تونے دنیا میں دیے ہیں، اور جو شماریں اُسی کثرت سے ہیں جس کثرت سے میرے گناہ ہیں، انکی گنتی یاد آتی ہے۔ گناہوں اور داغوں کے شمار میں برابر ہونے سے یہ مراد رکھی ہے کہ جب کسی گناہ کا مرتکب ہوا تو سببِ عدم استطاعت کے اُسکو خاطر خواہ نہ کر سکا؛ کوئی نہ کوئی حسرت ضرور باقی رہ گئی۔ مثلاً شراب پی تو وصلِ نصیب ہوا؛ اور وصلِ مستیر آیا تو شراب نہ ملی۔ پس جتنے گناہ کئے ہیں اتنے ہی داغِ دل پر کھائے ہیں۔

مجھ کو دیارِ غیر میں مارا وطن سے دو رکھ لی میرے خدا نے میری سیسی کی شرم

پردیس میں مرنا۔ جو شخص کو ناگوار ہوتا ہے۔ اُس پر خدا کا اس لئے شکر کرتا ہے کہ اگر وہاں بے گور و کفن پڑے رہے تو کچھ مضائقہ نہیں؛ کیونکہ کوئی شخص نہیں جانتا کہ یہ کون تھا اور کس رتبے کا آدمی تھا؛ لیکن وطن میں مرنا جہاں ایک زمانہ واقفِ حال ہو، مگر خیر و غم و آؤ ایک بھی نہ ہو، وہاں مرنے کی اس طرح مٹی خراب ہونی سخت رسوائی اور ذلت کی بات تھی۔ پس خدا کا شکر ہے کہ اس نے پردیس میں مار کر میری سیسی کی شرم رکھ لی۔ اس میں گویا ظاہرِ خدا کا شکر ہے مگر فی الحقیقت سراسر اہلِ وطن کی شکایت ہے۔ جسکو ایک غیبِ پیرائے میں ظاہر کیا ہے۔ ہے غیبِ غیب جسکو سمجھتے ہیں غمِ شہو نہیں اب میں ہنوز جو جاگے ہیں غمِ اب میں

یہ ہے کہ معشوق کو نہ ہمارے ساتھ دشمنی ہے نہ دوستی؛ اگر دشمنی بھی ہوتی تو اس لئے کہ اسمیں بھی ایک نوع کا تعلق ہوتا ہے۔ ہم اسی کو دوستی سمجھتے۔ لیکن جب نہ دوستی ہو اور نہ دشمنی تو پھر کس بات پر دھوکا کھائیں۔ قطع نظر خیال کی عمدگی اور ندرت کے لاگ اور لگا و ایسے دو لفظ ہم پہنچائے ہیں جن کا ماخذ متحد اور معنی متضاد ہیں۔ اور یہ ایک عجیب اتفاق ہے جس نے خیال کی خوبی کو چار چند کر دیا ہے۔

گرنی تھی ہم پر برق تجلی نہ طور پر دیتے ہیں بادہ ظرف قبح خوار پر
اس شعر میں اس آیت کے مضمون کی طرف اشارہ ہے جس میں ارشاد ہوا ہے کہ ہم نے امانت کو زمین و آسمان اور پہاڑوں کے سامنے پیش کیا؛ مگر وہ اُسکے متحمل نہ ہوئے، اور ڈر گئے، اور انسان نے اُسکو اٹھالیا، شاعر کہتا ہے کہ برق تجلی کے گرنے کے ہم متحمل تھے نہ کو طور؛ کیونکہ شراب خوار کا ظرف دیکھا اُسکے موافق اُسکو شراب دی جاتی ہے؛ پس کوہ طور جو منجملہ جمادات کے ہے۔ وہ کیونکر تجلی الہی کا متحمل ہو سکتا ہے۔ یہ خیال بھی مع اس تمثیل کے جو اسمیں بیان ہوئی ہے بالکل اچھوتا خیال معلوم ہوتا ہے۔

حریف مطلب مشکل نہیں فسون نیاز دعا قبول ہو یارب کہ عمر خضر دراز
چونکہ خیال وسیع تھا، اور مضمون مطلع میں بندھنے کا متقاضی تھا، اس لئے پہلا مصرع اُردو روزمرہ سے کسی قدر بعید ہو گیا ہے؛ مگر بالکل ایک نئی شوخی ہے جو شاید کسی کو نہ سوجھی ہوگی کہتا ہے کہ کسی مشکل مقصد کے حاصل ہونے میں تو عجز و نیاز کا منتر کچھ کام نہیں دیتا؛ لاچار اب یہی دعا مانگیں گے کہ اسی خضر کی عمر دراز ہو یعنی ایسی چیز طلب کرینگے جو پہلے ہی دیا جا چکی ہو۔

فیضیت
نوع انسانی

شوخی

صرف اس یقین کی بدولت ہے کہ یہاں رہنے کا زمانہ بہت تھوڑا ہے۔ یہ افسانہ کی ایک طبعی
تصلیت معلوم ہوتی ہے کہ جس قدر فرصت قلیل ہوتی ہے اسی قدر زیادہ سرگرمی سے کام کو سرانجام
کرتا ہے۔ اور جس قدر زیادہ مہلت ملتی ہے اسی قدر کام میں تاخیر اور سہل بھاری زیادہ کرتا ہے۔
نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ تھا تو خدا ہوتا ڈوبیا بھگو ہونے نے نہ تو میں تو کیا ہوتا

بالکل نئی طرح سے نیستی کو ہستی پر ترجیح دی ہے؛ اور ایک عجیب توقع پر معدوم محض ہونے کی تمنا کی
ہے۔ پہلے مصرع کے معنی ظاہر ہیں۔ دوسرے مصرع کے بظاہر یہ مفہوم ہوتا ہے کہ اگر میں نہ ہوتا تو
کیا بُرائی ہوتی؛ مگر قائل کا مقصود یہ ہے کہ اگر میں نہ ہوتا تو دیکھنا چاہیے کہ میں کیا چیز ہوتا؛ مطلب
یہ کہ خدا ہوتا؛ کیونکہ پہلے مصرع میں بیان ہو چکا ہے کہ اگر کچھ نہ تھا تو خدا ہوتا۔

توفیق با نذاذہ ہمت ہے ازل سے آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گہر نہ ہوا تھا
بالکل نیا اور اچھوتا اور باریک خیال ہے۔ اور نہایت صفائی اور عمدگی سے اُسکو ادا کیا گیا ہے۔
اگر کسی کی سمجھ میں نہ آئے تو اُسکی فہم کا قصور ہے۔ دعوے یہ ہے کہ جس قدر ہمت عالی ہوتی ہے
اسی کے موافق اُسکی تائید غیب سے ہوتی ہے۔ اور ثبوت یہ ہے کہ قطرہ اشک جیسکو آنکھوں میں
جگہ ملی ہے۔ اگر اُسکی ہمت جبکہ وہ دریا میں تھا۔ موتی بننے پر قانع ہو جاتی تو اُسکو جیسا کہ ظاہر
یہ درجہ یعنی آنکھوں میں جگہ ملنے کا حاصل نہ ہوتا۔

لاگ ہو تو اُس کو، رسم جھین لگاؤ جب نہو کچھ بھی تو دھوکا کھائیں کیا
لاگ دشمنی اور لگاؤ محبت۔ یہ مضمون عجب نہیں کہ کسی اور نے بھی باندا ہوا؛ مگر ہم نے آج تک
نہیں دیکھا۔ اگر کسی نے باندا بھی ہوگا تو اس خوبی اور لطافت سے ہرگز نہ بندھا ہوگا۔ مطلب

بمبور کیا تو اُن کو بھی آخر اسی سُرخ چلنا پڑا۔ مگر جس لیک پر قافلہ جارہا تھا اُسکے سوا ایک اور لیک اسی کے متوازی اپنے لئے نکالی اور جس چال پر اور لوگ چل رہے تھے اُس چال کو چھوڑ کر دوسری چال اختیار کی چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جب میر و سودا اور اُن کے مقلدین کے کلام میں ایک ہی قسم کے خیالات اور مضامین دیکھتے دیکھتے جی اکتا جاتا ہے اور اُسکے بعد مرزا کے دیوان پر نظر ڈالتے ہیں تو اُس میں ہمو ایک دوسرا عالم دکھائی دیتا ہے؛ اور جس طرح کہ ایک خشکی کا سیاح سمندر کے سفر میں، یا ایک میدان کا رہنے والا پہاڑ پر جا کر، ایک بالکل نئی اور نرالی کیفیت مشاہدہ کرتا ہے؛ اسی طرح مرزا کے دیوان میں ایک اور ہی سماں نظر آتا ہے۔ یہاں اول ہم چند شعر مرزا کے دیوان سے ایسے نقل کرتے ہیں جن سے اُنکے خیالات کا اچھوتا پن ثابت ہوتا ہے

”بکہ مشکل ہے ہر اک کام کا آسان ہونا آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا“

بادی النظر میں یہ ایک معمولی بات معلوم ہوتی ہے؛ مگر غور سے دیکھا جائے تو بالکل اچھوتا خیال ہے دعوتے یہ ہے کہ دنیا میں آسان سے آسان کام بھی دشوار ہے۔ اور دلیل یہ ہے کہ آدمی جو عین انسان ہے اُسکا بھی انسان بننا مشکل ہے۔ یہ منطقی استدلال نہیں ہے؛ بلکہ شاعرانہ استدلال ہے جس سے بہتر ایک شاعر استدلال نہیں کر سکتا۔

”ہو س کو ہے نشاط کار کیا کیا نہ ہو مرزا تو بھینے کا مزا کیا“

نشاط کے معنی اُتنگ کے ہیں۔ نشاط کار یعنی کام کرنے کی اُتنگ۔ یہ بھی جہاں تک کہ معلوم ہے ایک نیا خیالی ہے؛ اور نرالی خیال ہی نہیں بلکہ فیکٹ ہے؛ کیونکہ دنیا میں جو کچھ پھیل پھیل رہا ہے وہ

اظہار

نشاط

جس قدر بلند اور عالی خیالات مرزا کے رغبت میں نکلیں گے اُس قدر کسی رغبت کو کے کلام میں نکلنے کی توقع نہیں ہے۔ البتہ ہکو مرزا کے عمدہ اشعار کے جانچنے کے لئے ایک جداگانہ معیار مقرر کرنا پڑیگا۔ جسکو امید ہے کہ اہل انصاف تسلیم کریں گے۔

میر و سودا اور ان کے مقلدین نے اپنی غزل کی بنیاد اس بات پر رکھی ہے کہ جو عاشقانہ مضامین صدیوں اور قرونوں سے اولاً فارسی اور اُس کے بعد اردو غزل میں بندھتے چلے آئے ہیں وہی مضامین بہ تبدیل الفاظ اور بتغییر اسالیب بیان عامۃ اہل زبان کی معمولی بول چال اور روزمرہ میں ادا کئے جائیں۔ چنانچہ میر سے لیکر ذوق تک جتنے مشہور غزل گو مرزا کے سوا اہل زبان میں گزرے ہیں انکی غزل میں ایسے مضامین بہت ہی کم نکلیں گے جو اس محدود دائرے سے خارج ہوں۔ انکی بڑی کوشش یہ ہوتی تھی کہ جو مضمون پہلے متعدد طور پر بندھ چکا ہے وہی مضمون ایسے بلیغ اسلوب میں ادا کیا جائے کہ تمام اگلی بندشوں سے سبقت لیجائے۔ برخلاف اسکے مرزا نے اپنی غزل کی عارت دوسری بنیاد پر قائم کی ہے۔ انکی غزل میں مادہ تر ایسے اچھوتے مضامین پائے جاتے ہیں جنکو ادب شعرا کی فکر نے بالکل سس نہیں کیا۔ اور معمولی مضامین ایسے طریقے میں ادا کئے گئے ہیں جو سب سے زالا ہے؛ اور ان میں ایسی نزاکتیں رکھی گئی ہیں جن سے اکثر اساتذہ کا کلام خالی معلوم ہوتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اور لوگوں نے اول سے آخر تک قوم کی شاہراہ سے سیر و اعتراف نہیں کیا؛ اور جس چال سے کہ انگلوں نے راہ طے کی تھی اُسی چال سے تمام رستہ طے کیا ہے۔ مرزا نے اول شاہراہ کا رخ چھوڑ کر دوسرے رخ چلنا اختیار کیا؛ اور جب راہ کی مشکلات نے

مگر چونکہ مرزا کے معاصرین اکثر مکتبہ پنج اور مکتبہ شناس تھے اس لئے وہ رغبت کے سر انجام کرنے میں بھی اپنی پوری توجہ اور بہت صرف کرتے تھے اور دونوں زبانوں میں اپنی فوقیت اور برتری قائم رکھنے کی برابر فکر کرتے تھے۔

یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ شاعر اور اسکے کلام کے رتبہ کا اندازہ اسکے کلام کی قلت اور کثرت سے نہیں ہوتا؛ بلکہ اس بات سے ہوتا ہے کہ اسکے منتخب اور برگزیدہ اشعار کس درجے کے ہیں۔ یہ کی قدر لوگ اس لئے نہیں کرتے کہ اُسے متعدد ضخیم دیوان چھوڑے ہیں؛ بلکہ صرف اسکے منتخب اشعار نے۔ جو تعداد میں نہایت قلیل ہیں۔ اُسکو تمام رغبت گو شاعروں کا سرباج بنا دیا ہے۔

لطیف علیاں اور آتشکدہ میں نوری صفائی کی نسبت لکھا ہے کہ اسکے دیوان کا مختصر ہونا یہی اسکے کلام کی خوبی اور حسنِ طبع کی کافی دلیل ہے۔ یہ بھی معلوم رہے کہ تمام شعر کا کلام کی معیار سے نہیں جانچا جاتا؛ ورنہ فردوسی و نظامی و دو نونوی میں، اور نوری و خاقانی و دو نون قصیدے میں، مسلم الثبوت نہیں ٹھہر سکتے۔ کیونکہ انوری کا قصیدہ اور فردوسی کی مثنوی باعتبار سادگی اور صفائی و عام فہم ہونے کے خاقانی کے قصیدے اور نظامی کی مثنوی سے کچھ مناسب نہیں رکھتے؛ حالانکہ چاروں شخص فارسی شاعری کے رکنِ رکن مانے جاتے ہیں۔ پس ضرور ہے کہ جدا جدا کلام جدا جدا معیاروں سے جانچے جائیں۔ مرزا کے اردو کلام میں جیسا کہ اوپر مذکور ہوا غزل کے سوا کوئی صنفِ شمار کے قابل نہیں ہے۔ مرزا کی موجودہ غزلیات۔ گو بقابلہ بعض شعرا کے تعداد میں کیسی ہی قلیل ہوں۔ لیکن جس قدر منتخب اور برگزیدہ اشعار مرزا کی غزلیات میں موجود ہیں وہ تعداد میں کسی بڑے سے بڑے دیوان کے انتخابی اشعار سے کم نہیں ہیں۔ اور

بہت زیادہ کام لیا گیا تھا اور اس لئے اُس میں ایک غیر معمولی بلند پروازی پیدا ہو گئی تھی۔ جب قوتِ تمیز نے اُسکی باگ اپنے قبضے میں لی تو اُس نے وہ جو ہر گالے جو کسی کے وہم و گمان میں نہ تھے۔

یہاں یہ امر تبادینا ضرور ہے کہ مرزا نے ریختہ گوئی کو اپنا فن قرار نہیں دیا تھا؛ بلکہ محض نقشِ بیع کے طور پر کبھی اپنے دل کی آج سے، کبھی دوستوں کی فرمائش سے، اور کبھی بادشاہ یا ولی عہد کے حکم کی تعمیل کے لئے، ایک آدھ غزل لکھ لیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اُنکے اُردو دیوان میں غزل کے سوا کوئی صنف بقدر معتد بہ نہیں پائی جاتی۔ وہ منشی نبی بخش مرحوم کو ایک خط میں لکھتے ہیں: ”بھائی صاحب تم غزل کی تعریف کرتے ہو؛ اور میں شرماتا ہوں۔ یہ غزلیں گامیکو ہیں؛ پیٹ پالنے کی باتیں ہیں۔ میرے فارسی کے وہ قصیدے جن پر مجکو ناز ہے کوئی اُنکا لطف نہیں اُٹھاتا۔ اب قدردانی اس بات پر منحصر ہے کہ گاہ گاہ حضرت ظلِ سبحانی فرما بیٹھے ہیں کہ کبھی تم بہت دن سے کوئی سوغات نہیں لائے۔ یعنی یارِ ریختہ۔ ناچار کبھی کبھی یہ اتفاق ہوتا ہے کہ کوئی غزل کم کر لیجا تا ہوں۔“

قطع نظر اسکے وہ اُس زمانے کے خیالات کے موافق اُردو شاعری کو داخلِ کمالات نہیں سمجھتے تھے؛ بلکہ اُسی میں اپنی کسرِ شان جانتے تھے۔ چنانچہ ایک فارسی قطعہ میں جسکی نسبت مشہور ہے کہ اُس میں شیخ ابراہیم ذوق کی طرف خطاب ہے۔ کہتے ہیں

”فارسی ہیں تا بہ بنی نقشبانی ننگِ بگ
بگذرا ز مجموعہ اُردو کہ بے رنگِ سنبت“

”راہت میگویم من از راست سرترا کشید
ہر چہ در گفتار فخر تست آن ننگِ سنبت“

مرزا کو اس شعر کا اپنی طرف منسوب ہونا غالباً اسلئے ناگوار گذرا ہو گا کہ مرے شیر اور رحمت
خدا کی یہ دونو محاورے زیادہ تر عایموں اور سوتیلیوں کی زبان پر جاری ہیں؛ اور اس قدر
رعایت سے مرے شیر کہنا یہ بھی انکی طبیعت کے خلاف تھا؛ کیونکہ وہ ایسی مبتذل رعایتوں کو
جو ہر شخص کو باسانی سوجھ جائیں۔ مبتذل جانتے تھے۔

اس قسم کی اور بہت سی حکایتیں ہیں جن سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف شاعری
میں بلکہ وضع میں، لباس میں، طعام میں، طریق ماند و بود میں، یہاں تک کہ مرنے اور
جینے میں بھی عام طریقے پر چلنا پسند کرتے تھے۔ یہاں ایک لطیفہ قابل لکھنے کے ہے۔
مرنے سے آٹھ سات برس پہلے انھوں نے ایک مادۂ تالیخ اپنی وفات کا نکالا تھا۔
جس میں شے نہ نکلتے تھے۔ اتفاق سے اسی سال شہر میں وبا آئی؛ مگر مرزا بچ گئے۔ اس
امر کی نسبت ایک خط میں لکھتے ہیں درمیاں شام آلم ہو بات غلط نہ تھی (یعنی اسی سن میں
مجھے مرنا چاہئے تھا) مگر میں نے دبا سے عام میں مرنا اپنے لائق نہ سمجھا؛ واقعی اسمیں میری
کبر شان تھی۔ بعد نفع فساد ہوا کے سمجھ لیا جا دیگا، اگر چہ چین ایک ہنسی کی بات لکھی ہے؛ مگر
انکی طبیعت کا اقتضا اس سے صاف جھلکتا ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ مخاطب جسکو یہ خط لکھا ہے
وہ انکی اس فصاحت سے خوب واقف ہے۔

بہر حال مرزا ایک مدت کے بعد اپنی بیزاہر روی سے خیردار ہوئے۔ اور استقامت طبع اور
سلامتی ذہن نے انکو راہِ راست پر ڈالے بغیر نہ چھوڑا۔ گو ان کا ابتدائی کلام جسکو وہ حد سے
زیادہ جگر کا دمی اور دماغ سوزی سے سرا انجام کرتے تھے مقبول نہوا؛ مگر چونکہ قوتِ تخیل سے

نہ کریں، اور انکے نقش قدم پر قدم رکھتے چلے جائیں۔ وہ اپنے ارادے اور اختیار سے ایسا نہیں کرتے بلکہ دوسرے رستے پر چلنا انکی قدرت سے باہر ہوتا ہے۔

برخلاف اسکے جنکی طبیعت میں اُچھیلیٹی اور غیر معمولی پُنج کا مادہ ہوتا ہے وہ اپنے میں ایک ایسی چیز پاتے ہیں جو اگلوں کی پیروی پر انکو مجبور نہیں ہونے دیتی۔ انکو قدم کی شاہ راہ کے سوا بہت سی راہیں ہر طرف کھلی نظر آتی ہیں۔ وہ جس عام روش پر اپنے ہم فنوں کو چلتا دیکھتے ہیں اُس پر چلنے سے انکی طبیعت ابا کرتی ہے۔ یہ ممکن ہے کہ جو طریق غیر مسلوک وہ اختیار کریں وہ منزل مقصود تک پہنچانے والا نہ ہو؛ مگر یہ ممکن نہیں کہ جب تک وہ دائیں بائیں چل پھر کر طبیعت کی جولانیاں نہ دیکھ لیں اور تھک کر چورنو جائیں عام رہگیزوں کی طرح انکھیں بند کر کے شارع عام پر پڑ جائیں۔ مرزا کی طبیعت اسی قسم کی واقع ہوئی تھی وہ عام روش پر چلنے سے ہمیشہ ناک چڑھاتے تھے۔ وہ جست بشر کا کہ سبب خود شاعر اس ہر نفرت ظاہر کرتے تھے۔ عایدہ خیالات اور محاورات سے جہاں تک ہو سکتا تھا اجتناب کرتے تھے۔

ایک صاحب نے جو غالباً بنارس یا لکھنؤ سے دلی میں آئے تھے مرزا کے ایک شعر کی انکے سامنے نہایت تعریف کی۔ مرزا نے کہا ارشاد تو ہو وہ کونسا شعر ہے؟ انھوں نے میرا مانی متخلص بہ اسد شاگرد مرزا رفیع کا یہ شعر پڑھا

”اسد اس جفا پر توں سے وفا کی
مرے شیر شاہ باش رحمت خدا کی“

چونکہ شعر میں اسد متخلص واقع ہوا تھا انھوں نے یہ سمجھا کہ مرزا غالب کا شعر ہے۔ مرزا یہ سنکر بہت جڑ پڑھا اور فرمایا اگر کسی اور اسد کا شعر ہے تو اسکو رحمت خدا کی اور اگر مجھ اسد کا شعر ہے تو مجھے لعنت خدا کی۔

جو نہ اُن سے پہلے اُردو میں دیکھے گئے نہ فارسی میں۔ مثلاً اُنکے موجودہ اُردو دیوان میں ایک شعر ”قری کہت خاکستر دبیل قفس زنگ“ اسے نالہ نشان جگر سوختہ کیا ہے

میں نے خود اس کے معنی مرزا سے پوچھے تھے فرمایا کہ اُسے کی جگہ جُڑ پڑھو؛ معنی خود سمجھ میں آجائیں گے۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ قری۔ جو ایک کہت خاکستر سے زیادہ۔ اور بیل۔ جو ایک قفسِ عنقریب سے زیادہ نہیں۔ اُنکے جگر سوختہ یعنی عاشق ہونے کا ثبوت صرف اُنکے چمکنے اور بولنے سے ہوتا ہے۔ یہاں جس معنی میں مرزا نے اُسے کا لفظ استعمال کیا ہے ظاہر یہ انھیں کا اختراع ہے ایک شخص نے یہ معنی سُکر کہا کہ ”اگر وہ اُسے کی جگہ جُڑ کا لفظ رکھ دیتے یا دوسرا مصرعہ سطح کہتے“ اُسے نالہ نشان تیرے سوا عشق کا کیا ہے، تو مطلب صاف ہو جاتا، اُس شخص کا یہ کہنا بالکل صحیح ہے مگر مرزا چونکہ معمولی اسلوبوں سے تابع ورنہ پختے تھے اور شائع عام پر چلنا نہیں چاہتے تھے اس لئے وہ یہ نسبت اُسکے کہ شعر عام فہم ہو جائے اس بات کو زیادہ پسند کرتے تھے کہ طرز خیال اور طرز بیان میں جدت اور نزلا پن پایا جائے۔

مرزا کے ابتدائی کلام کو مہل و بے معنی کہو یا اُسکو اُردو زبان کے دائرے سے خارج سمجھو مگر اُس میں شک نہیں کہ اس سے اُنکی اُرجیلٹی اور غیر معمولی اُچھ کا خاطر خواہ سُراغ ملتا ہے اور یہی اُنکی ٹیڑھی ترجمی چالیں اُنکی بلند فطرتی اور غیر معمولی قابلیت و استعداد پر شہادت دیتی ہیں۔ معمولی قابلیت و استعداد کے لوگوں کی معراج یہ ہے کہ جس پک ڈنڈی پر اگلی بھیر پ کا گتہ چلا جاتا ہے اُسی پر اُنکھیں بند کر کے گتے کے پیچھے پیچھے ہولیں؛ اور لیک کے ادھر ادھر اُنکھ اٹھا کر نہ دیکھیں جو ہنر یا پیشہ اختیار کریں اُس میں اگلوں کی چال ڈھال سے سرمو تجاوز

خاموشی ہی کا دائرہ دیتا ہے؛ کیونکہ میرا کلام کسی کی سمجھ ہی میں نہیں آتا۔

چونکہ مرزا کی طبیعت فطرتاً نہایت سلیم و ناع ہوئی تھی اس لئے نکتہ پتیبوں کی تدابیر انہوں سے انگوہت بہتہ ہوتا تھا؛ اور آہستہ آہستہ ان کی طبیعت راہ پر آتی جاتی تھی۔ اسکے سوا جب سوہوی فاضل حق سے مرزا کی راہ و رسم بہت بڑھ گئی اور مرزا انگوہا پنا خالص و مخلص دوست اور خیر خواہ سمجھنے لگے تو انہوں نے اس قسم کے اشعار پر بہت روک ٹوک کرنی شروع کی؛ بیان تک کہ انہیں کی تحریک سے انہوں نے اپنے اردو کلام میں سے جو اس وقت موجود تھا ڈولٹلٹ کے قریب نکال ڈالا؛ اور اسکے بعد اس روش پر چلنا بالکل چھوڑ دیا۔

مرزا نے ریختہ میں جو روش ابتدا میں اختیار کی تھی نکال دیا ہے کہ وہ کسی طرح مقبول عام نہیں ہو سکتی تھی۔ نوں عموماً میر، سودا، میر حسن، جرات اور انشا وغیرہ کا سیدھا سادہ اور صاف کلام سننے کے عادی تھے۔ جو محاورے روزمرہ کی بول چال اور بات چیت میں برتنے جاتے تھے انہیں کو جب اس زبان و وزن کے سانچے میں ڈھلا ہوا دیکھتے تھے تو انکو زیادہ لذت آتی تھی اور زیادہ لطف حاصل ہوتا تھا۔ شعر کی بڑی خوبی یہی سمجھی جاتی تھی کہ ادھر قائل کے سہ سے نکلا؛ اور ادھر سامع کے دل میں اتر گیا؛ مگر مرزا کے ابتدائی ترختے میں یہ بات بالکل نہ تھی۔ جیسے خیالات انہی تھے ویسی ہی زبان غیر مانوس تھی۔ فارسی زبان کے مصداقاً فارسی کے محروف ربط اور توابع فعل۔ جو کہ فارسی کی خصوصیات میں سے ہیں۔ انکو مرزا اردو میں عموماً استعمال کرتے تھے۔ اکثر اشعار ایسے ہوتے تھے کہ اگر ان میں ایک لفظ بدل دیا جائے تو سارا شعر فارسی زبان کا ہو جائے۔ بعض اسلوب بیان خاص مرزا کے مختصرات میں بھی تھے

میں۔ جہاں مرزا بھی ہوتے تھے۔ تعریفاً ایسی غزلیں لکھ کر لاتے تھے جو الفاظ اور ترکیبوں کے لحاظ سے تو بہت پر شوکت و شاندار معلوم ہوتی تھیں؛ مگر معنی نادر و؛ گویا مرزا پر یہ ظاہر کرتے تھے کہ آپ کا کلام ایسا ہوتا ہے۔

ایک دفعہ مولوی عابد القادری رام پوری نے۔ جو نہایت ظریف الطبع تھے۔ اور جنکو چند روز قلعہ ملی سے تعلق رہا تھا۔ مرزا سے کسی موقع پر یہ کہا کہ آپ کا ایک اردو شعر سمجھ میں نہیں آتا؛ اور اسی وقت دو مصرعے خود موزوں کر کے مرزا کے سامنے پڑھے

”پہلے تو روغنِ گل بھینس کے اندھے نکال پھر دوا جتنی ہے کل بھینس کے اُسیے نکال“
مرزا شکر سخت حیران ہوئے؛ اور کہا حاشا یہ میرا شعر نہیں۔ مولوی عابد القادری نے ازراہ مزاح کے کہا میں نے خود آپ کے دیوان میں دیکھا ہے؛ اور دیواں ہو تو میں اب دکھا سکتا ہوں۔ آخر مرزا کو معلوم ہوا کہ مجھے اس پیرائے میں اعتراض کرتے ہیں؛ اور گویا یہ جتاتے ہیں کہ تمہارے دیوان میں اس قسم کے اشعار ہوتے ہیں۔

مرزا نے اس قسم کی نکتہ چینیوں پر اردو اور فارسی دیواں میں جا بجا اشارہ کیا ہے۔ اردو میں ایک جگہ کہتے ہیں

”نہ ستایش کی تمنا نہ صلے کی پروا“

گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

ایک اور اردو غزل کا مطلع ہے

”گر خاموشی سے فائدہ انہائی حال ہے“

خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے

یعنی اگر خاموشی سے یہ فائدہ ہے کہ حال دل ظاہر نہیں ہوتا تو میں خوش ہوں کہ میرا بولتا بھی

اُن کے دیوان میں ایک ثلث کے قریب بہت سے اشعار ایسے پائے جاتے ہیں جن پر رد و زبان کا اطلاق مشکل سے ہو سکتا ہے۔ جیسے ذیل کے اشعار جواب دیوان میں موجود ہیں۔

۱ شمار بوجہ مرعوب بہت مشکل پسند آیا	تماشا بیک کہ بردنِ صدرِ سپند آیا
۲ ہوا بے سیرِ گلِ آئینہ بے مہرِ قاتل	کہ اندازِ بچوں غلطیدنِ بسملِ سپند آیا
۳ رے گئے خاک میں ہم داغِ تنائے نشا	تو ہوا اور آپ بعد رنگِ گلستاں ہوا
۴ شبِ خامِ چشمِ ساقیِ رستخیزِ اندازہ تھا	تا محیطِ بادہ صورتِ خجائے خمیا زہ تھا
۵ یک قدمِ وحشت سے درینِ قبرِ امکاں گھلا	جادو اجزائے دو عالمِ دشتِ کاشیرا تھا

ان اشعار کو مہمل کہو یا بے معنی مگر اس میں شک نہیں کہ مرزا نے وہ نہایت جانکامی اور جگر کاوی سے سرا انجام کئے ہونگے۔ جب کہ اپنے معمولی اشعار کاٹتے ہوئے لوگوں کا دل دکھتا ہے تو مرزا کا دل اپنے اشعارِ نظری کرتے ہوئے کیوں نہ دکھتا ہوگا؟ ظاہر یہی سبب تھا کہ انتخاب کے وقت بہت سے اشعار جو فی الواقع نظری کرنے کے قابل تھے۔ انکے کاٹنے پر مرزا کا قلم نہ اٹھ سکا۔ ممکن ہے کہ ایک مدت کے بعد یہ اشعار انکی نظریں کھٹکے ہوں؛ مگر چونکہ دیوان چھپ کر شائع ہو چکا تھا اس لئے انھوں نے ان اشعار کا نکالنا فضول سمجھا۔

مرزا کے حق میں جو پیشین گوئی میر تقی نے کی تھی اُسکی دونوں شخصیات انکے حق میں پوری ہوئی۔ ظاہر ہے کہ مرزا اول اول ایسے رستے پر پڑے تھے کہ اگر استقامتِ طبع، اور سلامتِ ذہن، اور بعض صحیح مذاقِ دوستوں کی مدد نہ ہو، اور نکتہ چین ہمعصروں کی خرد گیری اور طعن و تمیز، سب راہ نہ ہوتی تو وہ شدہ شدہ منزلِ مقصود سے بہت دُور جا پڑتے۔ سنا گیا ہے کہ اہلِ دہلی عرو

- (۲) اسد ہر اشک کے ایک حلقہ بزر بخیر اقرودن
 بہ بند گریہ ہے نقش بر آب اسید رستن
 (۳) بحسرت گاہ تا زکشتہ جاں بخشی خواب
 خضر کو چشمہ آب بجا سے تڑپیں پایا
 (۴) رکھا غفلت نے دور قنادہ ذوق قناد
 اشارت فہم کو ہر ناخن بریدہ ابرو تھا
 (۵) پریشانی سے مغریر ہوا ہے پیشہ بالش
 خیال شوخی خواب کو راحت آفریں پایا
 (۶) موسم گل میں مجے گلگوں حلال میکشاں
 عقد وصل دخت رز انگور کا ہر دانہ تھا
 (۷) ساتھ جنبش کے بیک برخاستن ہو گیا
 گویا صحرا عیار دامن دیوانہ تھا

چونکہ مذکورہ بالا شعروں میں قطع نظر اسکے کہ طرز بیان اردو بول چال کے خلاف ہے۔ خیالات میں بھی کوئی لطافت نہیں معلوم ہوتی؛ اس لئے ان کے معنی بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ صرف چوتھے شعر کی جو کسی قدر آسان ہے یہاں بطور نمونے کے شرح کیجاتی ہے؛ تاکہ معلوم ہو کہ مرزا نے مشق سخن کس قسم کے خیالات سے شروع کی تھی اور کس قدر کاوش سے وہ یہ نئی قسم کے مضمون پیدا کرتے تھے۔

کہتا ہے کہ فنا میں جو لذت اور ذوق تھا ہماری غفلت نے اس سے ہمیشہ دور دور رکھا۔ اگر یہ غفلت نہ ہوتی تو اشارت فہم کے لئے ہر ایک ناخن۔ جو کاٹ کر پھینک دیا جاتا ہے۔ ابرو کا کام دیتا تھا۔ ابرو کا کام ہے اشارہ دایا کرنا؛ اور ناخن بریدہ جو ابرو کی شکل ہوتا ہے وہ بھی فنا کی لذت کی طرف اشارہ کرتا تھا؛ کیونکہ ناخن کے کٹنے سے جو ایک قسم کی فنا ہے لذت اور راحت حاصل ہوتی ہے۔ یہ ادھر کی سات بیتیں ہنئے مرزا کے ان نظری اشعار اور نظری غزلوں میں سے نقل کی ہیں جو انھوں نے اپنے دیوانِ رنجیتہ کو انتخاب کرتے وقت اس میں سے نکال ڈالی تھیں۔ مگر اب بھی

لکھنا شروع کیا تھا۔ قطع نظر اسکے کہ اُس زمانے کا کلام خود ہمارے پاس موجود ہے۔ اُس روش کا اندازہ اس حکایت سے بخوبی ہوتا ہے۔ خود مرزا کی زبانی سنا گیا ہے کہ امیر تقی نے جو مرزا کے ہم وطن تھے اُنکے لڑکپن کے اشعار سن کر یہ کہا تھا کہ ”اگر اس لڑکے کو کوئی کامل استاد مل گیا اور اسے اسکو سیدھے رستے پر ڈال دیا تو لا جواب شاعر بن جائیگا؛ ورنہ مہمل کہنے لگے گا۔“

مرزا کے ابتدائی اشعار دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ تو طبیعت کی مناسبت سے اور زیادہ تر علامہ عبد الصمد کی تعلیم کے سبب۔ فارسیت کا رنگ ابتدا ہی میں مرزا کے بول چال اور اُنکی قوت تخیل پر چڑھ گیا تھا۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح اکثر ذکی الطبع لڑکے ابتدا میں سیدھے سادے اشعار کی نسبت شکل اور پیچیدہ اشعار کو جو بغیر غور و فکر کے آسانی سے سمجھ میں نہیں آتے زیادہ شوق سے دیکھتے اور پڑھتے ہیں۔ مرزا نے لڑکپن میں بیدل کا کلام زیادہ دیکھا تھا چنانچہ جو روش مرزا بیدل نے فارسی زبان میں اختراع کی تھی اُسی روش پر مرزا نے اردو میں چلنا اختیار کیا تھا جیسا کہ وہ خود فرماتے ہیں

”طرز بیدل میں رنجیت لکھنا اسد اللہ خاں قیامت ہے۔“

یہاں بطور نمونہ کے مرزا کے ابتدائی کلام میں سے چند اشعار لکھے جاتے ہیں :

(۱) گرے گر فکر تعمیر خرابیاں بے دل گردوں نہ بکھے خشت مثل استخوان بیرون قابلیا

مرزا کی ولادت ۱۲۸۵ھ میں ہوئی ہے اور میر کی وفات ۱۲۵۵ھ میں واقع ہوئی اس سے ظاہر ہے کہ مرزا کی عمر میر کی وفات کے وقت تیرہ چودہ برس کی تھی۔ مرزا کے اشعار اُنکے بچپن کے دوست نواب محام الدین حیدر خاں مرحوم والدہ ناصر حسین مرزا صاحب نے میر تقی کو دکھائے تھے۔

* پھر مرزا نے اپنے دیوانِ پنجیس سے تو کمال ڈالا مگر دیوانِ فارسی میں بتقریب الفاظ داخل کر دیا یعنی اس طرح ”کنڈ گر فکر تعمیر خرابیاں مار گردوں چہ نیاید خشت مثل استخوان بیرون ز قالب“

پیرورش پانی تھی بہت آسودہ حال تھی اور تنہیال کی ثروت سے ظاہر امرزا اور اُنکے بھائی سے
 پڑھکر کوئی قائدہ اُٹھانے والا نہ تھا۔ آغاز شباب میں جبکہ سرپر کوئی مرتبی نہ ہو۔ دولت و آسودگی سے
 زیادہ کوئی چیز قانہ بر انداز نہیں ہو سکتی۔ مرزا کی نوجوانی کے ساتھ اُس آسودگی نے وہ کام کیا جو کہ
 آگ پارود کے ساتھ کرتی ہے جس آزادی اور مطلق العنانی میں مرزا کی جوانی گزری ہے اُسکی کیفیت
 کا خود اُنہیں کے الفاظ سے اندازہ ہو سکتا ہے۔ وہ ایک جگہ اپنی جوانی کی حالت اِس طرح ظاہر
 کرتے ہیں: ”بافرو فرہنگ بیگانہ، وبانام و تنگ دشمن، با فردایاں مہنشین، و با ادب باش ہزنگ،
 پاسے بیراہن پوس، دزباں بے مرفوگے، در شکست خویش گردوں را دستیار، و در آزار خویش دشمن
 را آموزگار“ اِسکے بعد لکھتے ہیں ”تیزی رفتار من از مسجد و تہخانہ گردانگشت، و خانقاہ و میکدہ را بیکدگر
 زد“، المعترض مرزا کا لڑکپن اور اُنکی جوانی ایسی حالت میں بسر ہوئی تھی کہ ایک ایسے فن میں
 جسکا نہ کوئی قدر داں نظر آتا تھا اور نہ کوئی خریدار دکھائی دیتا تھا، اعلیٰ درجے کا کمال ہم پہنچانا
 تو درکنار؛ اُس کا خیال بھی دل میں گزرنے کا قریب ناممکن کے تھا۔ پس یہ صرف اُنکی طبیعتی سبب
 اور فطری قابلیت کا اقتضا تھا کہ اُس غفلت و دبستی کے عالم میں بھی شعر کا کھٹکا برابر لگا رہا اور شاعری
 کی تکمیل کا خیال ایسی بے خبری کے زمانے میں بھی فراموش نہیں ہوا۔

مرزانے گل رعنا کے دیباچے میں لکھا ہے کہ میں نے اول اُردو زبان میں شعر کہنا شروع کیا تھا
 اِس لئے ہم بھی پہلے اُنکے اُردو دیوان کا ذکر کرتے ہیں جس روش پر مرزانے ابتدا میں اُردو شعر

سے مرزانے اپنے گلوتے کے ایک دوست مولوی سراج احمد کی فرمائش سے اپنے تمام اُردو اور فارسی دیوان کا انتخاب کیا تھا جس کا
 دیباچہ اُنکے کلیات شرفارسی میں موجود ہے اُسکا نام گل رعنا رکھا تھا۔

دفع عنہم میت جہلعتہم خردن چارہ کار نیست جسہر کردن

مرزا کی شاعری اکتسابی نہ تھی بلکہ انکی حالت پر غور کرنے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ
ملکہ ان کی فطرت میں ودیعت کیا گیا تھا۔ انہوں نے۔ بیسا کہ اپنے فارسی دیدار کے خاتمہ
میں تصریح کی ہے۔ گیارہ برس کی عمر میں شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ اسی زمانے میں انہوں نے
فارسی میں کچھ اشعار ابو نعل کے موزوں کہے تھے؛ جنکی ردیعت میں کہ چہ بجائے معنی چہ کے
استعمال کیا تھا۔ جب انہوں نے وہ اشعار اپنے استاد شیخ معظم کو سنائے تو انہوں نے کہا کہ
یہ کیا مہل ردیعت اختیار کی ہے، ایسے بے معنی شعر کہنے سے کچھ فائدہ نہیں۔ مرزا یہ سنکر خاموش
ہو رہے۔ ایک روز نامہ تلہری کے کلام میں ایک شعر انکی نظر پڑ گیا جسکے آخر میں لفظ کہ چہ معنی
چہ کے معنی میں آیا تھا۔ وہ کتاب لے کر دوڑے ہوئے استاد پاس گئے اور وہ شعر دکھایا شیخ
معظم اسکو دیکھ کر حیران ہو گئے؛ اور مرزا سے کہا کہ فارسی زبان سے خداداد مناسبت ہے؛
تم ضرور فکر شعر کیا کرو؛ اور کسی کے اعتراض کی کچھ پروا نہ کرو۔

مرزا کو بیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے باپ نے پانچ برس کی اور چچا سنے نیر برس کی عمر میں چھوڑ
تھا۔ چچا کے بعد کوئی مرتبی دسر پرست انکے سر پر نہ رہا تھا۔ مرزا کی تخیال جہاں انہوں نے

سلسلہ شریاری ال متناق کا بیان ہے کہ لاکھنؤ لال ایک صاحب گرو کے رہنے والے مرزا صاحب کے ہوتے ایک اردو میں آئے اور جب
مرزا صاحب سے ملے تو ان سے کلام میں لکھو یاد دلایا کہ جہنوی آپ نے چنگ بانی کے زمانے میں لکھی تھی وہ بھی آپکو یاد ہے؟ انھوں
نے انکار کیا لالہ صاحب نے کہا وہ اردو و مثنوی میرے پاس موجود ہے چاہئے انہوں نے وہ مثنوی مرزا کو لاکر دی
اور وہ اسکو دیکھ کر بہت خوش ہوئے اگلے آخر میں یہ فارسی شعر کسی استاد کا چنگ کی زبان سے لاحق کر دیا تھا۔
”رشتہ در گردنم انگند دوست دے کشد ہر جا کہ خاطر خواہ اوست“ لالہ صاحب کا بیان تھا کہ مرزا صاحب کی عمر جبکہ یہ مثنوی لکھی
تھی آٹھ نو برس کی تھی ۱۲

دوسرا حصہ

مرزا کے کلام پر ریویو اور اُسکا انتخاب

مرزا کے کلام پر ریویو کرنا، اور اُسکی حقیقت لوگوں کے ذہن نشین کرنی۔ ایک ایسے زمانے میں جبکہ فارسی زبان ہندوستان میں بہتر لہجہ زبان کے ہو گئی ہے اور ذوق شعر روز بروز کا فور ہوتا جاتا ہے۔ ایک نہایت مشکل کام ہے مرزا کے کلام میں جو چیز سب سے زیادہ گراں قدر ہے وہ اُنکی فارسی نظم و نثر ہے۔ لیکن اذل تو فارسی زبان سے ملک میں عام اجنبیت پائی جاتی ہے؛ دوسرے مرزا کے کلام میں بعض خصوصیتیں ایسی ہیں جن سے لوگوں کے مذاق بالکل نا آشنا ہیں۔ پس جو شخص اس زمانے میں اُن کے کلام پر ریویو کرنا، اور اُسکے ذریعے سے مصنف کی حقیقت اور اُسکا رتبہ پبلک پر ظاہر کرنا چاہتا ہے وہ درحقیقت ایک ایسے کام کے درپے ہے جس میں کامیابی کی بہت ہی کم امید ہو سکتی ہے۔ لیکن اگر کچھ امید ہے تو اُسی صورت میں ہے کہ کچھ کیا جائے؛ نہ یہ کہ کام کی مشکلات پر نظر کر کے اُس سے ہاتھ اٹھایا جائے۔

سخن سراے نو آئیں لوائے رانا زم
 بہ نکتہ شیوہ شاگردین بہن ماہست
 اگر چہ دوست ارسطو دمن ملامطو نم
 زمین کو کے مرا آسماں کند ہر صبح
 اگر شوم بہ مثل آتشے شرارہ فتاں
 بہ بھر گر قدم رہ۔ بود سفینہ بین
 بہ ہمدوست دہم دل۔ نشاط خاطرین
 گرم ز غصہ تہ گشتہ کار۔ مونس من
 زہے زردے تو پیدا فروغ دانش و دنا
 ز تو کہ آئندہ فیض صحبت آدنی
 مرا ستودی و گفتی کہ من از آن توام
 سعادت و شرف چون منے بعض کمال
 بتالہ ہمنفس من بہ شور ہمسر من
 صنم بصورت خود سے ترا شد آذرین
 بود بپا یہ ارسطو کے من سکندرین
 طلوع نیل روشیں ز طرف نظر من
 شود بقاعدہ ہمدی سمندری من
 بہ تخت گرد بودم رای۔ گرد و انسرین
 بہ کین خصم نہم آن خلوایے لشکر من
 درم ز کار فردماندہ دست۔ یادین
 بدیں فروغ۔ جہاں تاب گشتہ اخترین
 ہوایے دیدن غالب قنادر دسین
 خداے آن تو بادا استل و اکثرین
 نہ بس بود کہ بود چوں تو شے ناگزین؟

نواب محمد مصطفیٰ خاں مرحوم جو فارسی میں حسرتی اور اردو میں شیفہ تخلص کرتے تھے اگرچہ
 مرزا کے تلامذہ میں شمار نہیں ہوتے تھے بلکہ جب تک مومن خاں مرحوم زندہ رہے انہیں سے
 مشورہ سخن کرتے رہے لیکن خان موصوف کی وفات کے بعد رنجشہ اور فارسی دونوں زبانوں میں
 وہ برابر مرزا کو اپنا کلام دکھاتے تھے اور اگر ہمارا قیاس غلط نہ ہو تو مرزا کے بعد ان کے معاصرین میں

اسے معلوم ہوتا ہے کہ نواب مرزا کی عیج میں کوئی قصیدہ لکھا تھا جسکی طرف ان دونوں ہی میں اشارہ ہے ۱۲

نواب
 محمد مصطفیٰ خاں

وحشت و حقیقت اب مرنے لکھیں شاید مرگیا غالب آشفہ نوا کہتے ہیں

یہ دونو صاحب باہدگر نہایت گہری دوستی رکھتے تھے؛ یہاں تک کہ انکی دوستی عشق کے درجے تک پہنچ گئی تھی۔ ایک دفعہ جبکہ راقم بھی جہانگیر آباد میں موجود تھا سید غلام علی خاں مرحوم نواب صاحب سے ملنے کو آئے ہوئے تھے اور مرزا صاحب نے بھی اُن کا میاں آنا سن لیا تھا۔ انہیں دنوں میں مرزا کا خط نواب صاحب کے نام آیا۔ انہیں خاں صاحب کو بھی سلام لکھا تھا اور اخیر میں حافظ کے مشہور شعر کا پہلا مصرع اسطرح بدل کر لکھا تھا

”چو با حبیب نشینی دچاے پیائی بیاد آر حسد لیفان بادہ پیار“

ایک عزیز نے یہ لطیفہ سنکر کہا کہ خواجہ حافظ کے اصل شعر میں اس قدر لطفت نہ تھا جیسا کہ اس موقع پر مرزا صاحب کے اس تصرف سے اُس میں لطفت پیدا ہو گیا۔

مرزا صاحب کے اُن شاگردوں کا حال جنکے نام کے بہت سے خطوط اردو سے معلیٰ اور عود ہندی میں مرزا کے لکھے ہوئے موجود ہیں یہاں لکھنے کی ضرورت نہیں؛ اس لئے ہم صرف دو صاحبوں کا مختصر ذکر اس مقام پر لکھتے ہیں ایک نواب ضیاء الدین احمد خاں مرحوم اور دوسرے نواب مصطفیٰ خاں مرحوم کہ غالباً ان دونو بزرگوں میں سے کسی کے نام کا کوئی خط مرزا کے اردو مکاتبات میں نہیں ہے جن سے اُن کی خصوصیت مرزا صاحب کے ساتھ خاص عام کو معلوم ہو۔ نواب ضیاء الدین احمد خاں جو فارسی میں نیر اور اردو میں رخشاں تخلص کرتے تھے۔ قطع نظر کمال شاعری و انشا پردازی کے تاریخ، جغرافیہ، علم انساب، علم اسماء رجال تحقیق و نقاد

۴۰ یعنی نواب صاحب نے شراب سے محبت تھی اور مرزا پتہ تھے اس لئے انکی نسبت چاویائی اور اپنی نسبت بادہ پیکا لفظ کہا۔

طوفان

نواب ضیاء الدین احمد خاں

یہ دائرہ بہت وسیع کر دیا تھا۔ جو شخص اصلاح کے لئے آئے پاس غزل بھیجتا تھا ممکن نہ تھا کہ وہ اس کے خط کا جواب اور اس کی غزل میں اصلاح دیکر نہ بھیجیں۔ اگرچہ مرزا کی فطرت شاعری میں اپنے طبقے کے لوگوں سے اس قدر بلند واقع ہوئی تھی کہ وہ کسی شاگرد یا مستفید کو اپنے ساتھ ساتھ نہیں لے چل سکتے تھے۔ جیسا کہ انہوں نے خود ایک فلری شعر میں اس مضمون کی طرف اشارہ کیا ہے؛ وہ کہتے ہیں

ماہمائے گرم پر دازیم فیض از ما جوے سایہ بچون ددو بالا میر و دازبال ما

باہنمہ اہل دہلی و نواح دہلی میں چند اصحاب جو مرزا کے فیض صحبت اور مشورہ سخن سے زیادہ مستفید ہوئے تھے ان کے ارشد تلامذہ سمجھے جاتے تھے؛ جیسے نیررخشان، عارف، سالک، مجروح، علائی، قفہ وغیرہم۔ ان کے سوا خاص اہل دہلی میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو عرفاً مرزا کے شاگرد نہیں سمجھے جاتے تھے لیکن درحقیقت ان کے شاگرد معنوی تھے؛ جیسے نواب مصطفیٰ خاں مرحوم جنہوں نے سوسن خاں مرحوم کی وفات کے بعد ہمیشہ اپنا کلام فارسی ہو یا اردو مرزا ہی کو دکھایا۔ یا جیسے سید علام علیجاں مرحوم تخلص بہ وحشت جو مرزا کے حد سے زیادہ ماننے والے اور معتقد اور ان کی صحبت سے مستفیض رہے تھے۔ مرزا نے انہیں دونوں صاحبوں کی طرف اپنی ایک اردو غزل کے مقطع میں اشارہ کیا ہے اور کہا ہے

۱۔ صاحب دلی کے ممتاز لوگوں میں تھے ان کے والد کا نام سید فرحت اللہ خاں تھا اور مولانا رشید الدین خاں مرحوم کے دادا تھے قطع نظر علم و فضل کے اردو و فارسی دونوں زبانوں میں نہایت خوش بیان اور شعور کا ذوق اعلیٰ درجے کا رکھتے تھے اول سرکار انگریزی میں ملازم رہے پھر انور میں نوحدار ہو گئے پھر لکھنؤ میں نواب سعید الدین اور مرحوم نائب وزیر کے توسط سے کراٹھ سے قرابیت قریب رکھتے تھے ایک معزز خدمت پر ممتاز ہو گئے وہاں سے پھر انور علی آئے تھے اور غدرنگ میں رہے غدرنگ کے بعد اخیر غدرنگ سرشارتہ تعلیم میں منسلک رہے اور نواب مصطفیٰ خاں مرحوم ان کی بہر حال میں مدد کرتے رہے ۱۲

پہلا مصع مجھے یاد نہیں رہا دوسرا مصع یہ تھا وہ مذکور ہجیرہ دارالمن سر تو سلامت،، مرنے سے پہلے اکثر شہر
 در و زباں رہتا تھا ” دم واپس بر سر راہ ہے غزیرہ! اب اللہ ہی اللہ ہے“

آخر ذیقعدہ ۱۲۸۵ ہجری کی دوسری اور فروری ۱۸۶۹ء کی پندرہویں کو تہتر برس اور چار مہینے کی عمر میں
 دنیا سے رحلت کی، اور درگاہ حضرت سلطان نظام الدین قدس سرہ میں اپنے خسر کے پائین فرادفن کئے گئے۔
 انکی وفات کی تاریخیں جدیدت تک ہندوستان کے اردو اخباروں میں چھپتی رہیں وہ گنتی اور شمار سے باہر ہیں، صرف
 ایک تاریخ جیسے دس بارہ آدمیوں کو توار دہوا۔ یاد رکھنے کے قابل ہے (یعنی آہ غالب برد) جبکہ مختلف لوگوں نے
 مختلف طور پر قطعات میں منظم کیا تھا۔ تاریخوں کے علاوہ مرزا قربان علی بیگ سالک، میر محمد حسین مجروح، اور
 کتابخانے اردو میں اور تہشی ہر گوبال تھتہ نے فارسی میں؛ مرزا اکرمیہ بھی لکھے تھے۔ جو اسی زمانہ میں چھپ کر شائع ہو گئے تھے۔
 مرزا کے جنازے پر جب کہ دہلی دروازے کے باہر نماز پڑھی گئی۔ راقم بھی موجود تھا، اور شہر کے اکثر علماء اور
 ممتاز لوگ جیسے نواب ضیاء الدین احمد خاں، نواب محمد مصطفیٰ خاں، حکیم احسن اللہ خاں وغیرہم، اور سب سے
 اہل سنت اور امامیہ دونوں فرقوں کے لوگ جنازے کی شایعت میں شریک تھے۔ سید صفدر سلطان بنیرہ پشی
 محمود خاں نے نواب ضیاء الدین احمد خاں مرحوم سے کہا کہ مرزا صاحب شیعہ تھے؛ بلکہ اجازت ہو کہ ہم
 اپنے طریقے کے موافق انکی تجنیز و تکفین کریں۔ مگر نواب صاحب نے نہیں مانا؛ اور تمام مراسم اہل سنت کے
 موافق ادا کئے گئے؛ ہمیں شک نہیں کہ نواب صاحب سے زیادہ انکے اہلی مذہبی خیالات سے کوئی شخص واقف نہیں
 ہو سکتا تھا؛ مگر ہمارے نزدیک بہتر ہوتا کہ شیعہ اور تہشی دونوں بلکہ علیحدہ علیحدہ انکے جنازے کی نماز پڑھتے اور حلیہ زندگی
 میں انکا براؤ تہشی اور شیعہ دونوں کے ساتھ یکساں رہا تھا۔ اہل طحمرنیکے بعد بھی دونوں فرقوں کی حق گزاری میں شریک ہوتے
 مرزا صاحب کے شاگرد اطراف ہندوستان میں بٹھا رہے۔ انکی وسعت اخلاق اور عام رضا جوئی نے

بانی
 وفات

تاریخ
 جنازہ

شہر
 کون

کر اُسکے ننھے ننھے ننھے ہیں؛ اب اگر تیسری شادی نہ کرے تو کیا کرے؟ اور بچوں کی کس طرح پرورش ہو؟ مرزا اُسکے جواب میں لگتے ہیں دو امر اور سنگہ کے حال پر اُسکے واسطے رحم اور اپنے واسطے رشک آتا ہے۔ اللہ اللہ!! ایک وہ ہیں کہ دودو بار انکی بیڑیاں کٹ چکی ہیں، اور ایک ہم ہیں کہ ایک اور پڑپانش برس سے جو بچانسی کا پھندا اگلے میں پڑا ہے تو نہ پھندا ہی ٹوٹتا ہے، نہ دم ہی نکلتا ہے۔ اُسکو سمجھاؤ کہ بھائی تیرے بچوں کو میں پال لوں گا تو کیوں بلا پس پھندا ہے، وہ ہمیشہ تعلقات خانگی کو جدا یا ہنر لا ایک سخت مصیبت بتایا کرتے تھے۔

جاڑے کے موسم میں ایک دن طوطے کا بچہ اسانے رکھا تھا۔ طوطا سردی کے سبب پردن میں نہ چھپائے بیٹھا تھا۔ مرزانے دیکھ کر کہا درمیاں بیٹھو! نہ تھا اسے جو رد نہ بچے، تم کس فکر میں یوں سر جھکائے بیٹھے ہو؟ ایک دفعہ مرزا مکان بدلنا چاہتے تھے۔ ایک مکان آپ خرید دیکھ کر آئے؛ اُسکا دیوانخانہ تو پسند آگیا، مگر مجلسراخوندہ دیکھ کے گھر پر آکر اُسکے دیکھنے کے لئے بی بی کو بھیجا۔ وہ دیکھ کر آئیں تو اُن سے پسند ناپسند کا حال پوچھا۔ انھوں نے کہا اسیں تو لوگ بلاتاتے ہیں۔ مرزانے کہا کیا دنیا میں آپ سے بھی بڑھکر کوئی بلا ہے؟ یہاں مرزا کا ایک قطعہ اور ایک باغی مقصداے مقام کے موافق لکھی جاتی ہے

گیر کہ در روزِ حشر چوں تو بختی	بہ سبِ دفعِ نمنند تیرہ نمنین
لیک نباشد در اں مضیقِ مصیبت	در طلبِ نان و جامہ کشش از زن
لیک نباشد در اں مقامِ صعوبت	شورِ تقاضاے ناروا سے ہماجن
اسے اک کہ براہِ کعبہ و بے داری	داغِ کہ گزیدہ آرزو بے داری
زین گو نہ کہ تمیزی خرامی - داغ	در خانہ زرنے ستیزہ خوئے داری

مرزا اپنی شوخی طبع کے ماتھے سے مجبور تھے، اور کسی موقع پر خوش طبعی کرنے سے نہ چوکتے تھے۔

ناچار ز راہِ حق گذاری تا کردہ شود تلاشی آں
 من نیز طلب کنم برایش ایں خواہش اگر نیست آساں
 آئینہ و تاج از سکنہ انگشت تخت از سیماں
 از عالمِ غیب جامِ جمشید از چشمِ خفتہ آبِ حیواں
 عمر ابد و نشاطِ جاوید نیروی دل و تابِ ایماں
 تو بیتی جواب نامہ خویش تو فیضِ عطا و بذلِ احساں

مرزا کی بی بی - جو الہی بخش خاں معودت کی بیٹی تھیں - وہ نہایت متقی پرہیزگار اور نماز روزہ کی سخت پابند تھیں۔ جس قدر مرزا مذہبی معاملات میں بے مبالغہ تھے اُسی قدر ان کی بی بی احکامِ مذہبی کی پابند تھیں؛ یہاں تک کہ بی بی کے کھانے پینے کے باسن الگ اور شوہر کے الگ رہتے تھے۔ با ایں ہمہ بی بی شوہر کی خدمتگداری اور خدمت گیری میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہ کرتی تھیں۔ مرزا صاحب ہمیشہ مزدانے مکان میں رہتے تھے مگر اُنکے کھانے اور دوا ٹھنڈائی اور جڑا دل وغیرہ کا انتظام سب گھر میں سے ہوتا تھا۔ مرزا میں جب تک چلنے پھرنے کی طاقت رہی ہمیشہ وقتِ معین پر ایک بار وہ گھر میں ضرور جاتے تھے۔ اور بی بی اور ان کے تمام رشتہ داروں کے ساتھ نہایت عمدہ برتاؤ دیتے تھے، اور اپنی جان سے بڑھکر ان کی ضروریات اور اخراجات کا خیال رہتا تھا۔ مگر چونکہ شوخی اور ظرافت انکی گھٹی میں پڑی تھی انکی زبان و قلم سے بی بی کی نسبت اکثر ایسی باتیں نکل جاتی تھیں جنکو ناواقف آدمی نفرت یا بے تعلقی پر محمول کر سکتا ہے۔

کسی نے امرائے شنگ نام ایک شاگرد کی دوسری بی بی کے مرنے کا حال مرزا کو لکھا، اور اُس میں یہ بھی لکھا

حاصلی
تفصیلات

بظہور

ز ایں سودا اثرے بسیج عنوان	ایں ہر دور رسید و نیست پیدا
اے کاشش نہ گشتے ثنا خواں	رنجید مگر ز مدح تو آب
از گفتہ خویش تن پشیاں	ہیہات چہ گفتہ ام کہ باشم
ز نہار مخور فریب شیطان	عقلم بچو آب گفت "غالب!"
تا نامہ فرستدت با ماں	نواب لبیک را رفغان است
ز دود آں حسمہ جمع کرد نتوان	و اہا کہ بخاطرش گذشتہ است
ویرست کہ دادہ است فرماں	ز دوست کہ جہم نیز گردد
آرند بکوشش مند راواں	تا راہ روان بحسہ و برگرد
الما س ز معدن دوزخاں	و یبازد مشق و محمل از دم
توسن ز عداق و در زعمال	فیس از دکن و ز مرد از کوہ
یا قوت گزیدہ از بدخشاں	فیروزہ نغز از شاہ پور
شمیر بر بندہ از صفناہاں	جہانازہ تینر ز رعناہ
ز رفعت گراں ہباز ایراں	پشیمینہ قیستی ز کشمیر
بر پنج و طال نیست برہاں	بالجملہ درنگ چوں ازین ست
گفت ایں ہمہ راز با پیناں	چوں پیر حسد بد لہنہ زہی
مرحہم ہنوز خم یاس و حرماں	گشتم بدہم امید واری
اکی قبلہ و قبلہ گاہ عیاں	گفتم کہ چو با من ایں کرم کرد

بھیجا تھا، اور اُسکے ساتھ عرضداشت بھی گزرائی تھی؛ پھر کیا سبب ہے کہ جواب عنایت نہیں ہوا؟
 کیا نواب مجھے آزر دہ ہو گیا؟ اگر یہ بات ہے تو میں نے ناحق تعریف لکھی۔ خدا جانے میں نے کیا لکھ دیا
 ہو گا جیسے نواب کو آزر دہ لگی ہوئی، عقل نے کہا تو کیوں گھبراتا ہے؟ نواب جس ساز و سامان کے ساتھ صلہ
 بھیجنا چاہتا ہے وہ جلدی فراہم نہیں ہو سکتا۔ اُسے بہت دن سے حکم دے رکھا ہے کہ دمشق سے دیبا،
 روم سے نخل، معدن سے الماس، کان سے سونا، دکن سے ہاتھی، پہاڑ سے زرد، عراق سے گھڑا،
 دریا سے موتی، نیشاپور سے فیروزہ، بدخشاں سے یاقوت، بغداد سے سائوئی، اصفہاں سے تنوار، کشمیر سے
 پشمینہ، ایران سے زربفت، یہ سب چیزیں فراہم کر کے لائیں؛ تب غالب کو صلہ بھیجا جائے۔ پس جبکہ یہ
 ساری ڈھیل اس وجہ سے ہے تو اُسکو نواب کی آزر دہی کی دلیل نہ سمجھنا چاہیے۔ جب عقل نے مجھکو یہ دم دیا
 تو میری تمام یاس و ناامیدی امید کے ساتھ بدل گئی۔ میں نے بھی اپنے دل میں کہا کہ جب ممدوح میرے
 لئے یہ کچھ کرنا چاہتا ہے تو میں بھی اُسکے لئے آئینہ اور تاج سکندر سے، انگشتری اور تخت سلیمان سے، جامِ
 عالم غیب سے، آبِ حیاں چشمہ خضر سے، عرابد، نشاط جاوید، دل کی قوت، ایمان کی مضبوطی اپنے خدا
 سے، اور اپنی عمری کا جواب اور قصیدے کا صلہ ممدوح سے کیوں نہ مانگوں۔“

قطعہ

گفتم بخرد نخلوت انس	کائے شمع و چراغ ہفت ایواں
آیا ز چہ رُو بود کہ نواب	نموشست جوابِ نامہ ام - ہاں!
اں گو نہ عینہ کہ دانی	در ویش نوشتہ سوے سلطان
اں گو نہ قصیدہ کہ گوئی	از صفحہ دمیدہ سنبستان

بڑے بڑے لوگوں سے تعریف سنی گئی ہے۔ کیس وہ دلی میں آئے ہیں؛ اور مرزا کے مکان پر ٹیسرے ہیں
 اُن کی نسبت منشی ہر کو پال قفقہ کو ایک فارسی خط میں لکھتے ہیں جسکا حاصل یہ ہے کہ ”خدا نے میری
 بیکسی اور تمنائی پر رحم کیا؛ اور ایسے شخص کو میرے پاس بھیجا جو میرے زخموں کا مرہم، اور میرے درد
 کا درماں اپنے ساتھ لایا؛ اور بنے میری اندھیری رات کو روشنی کر دیا۔ اُسے اپنی باتوں سے
 ایک ایسی شمع روشن کی جسکی روشنی میں میں نے اپنے کلام کی خوبی۔ جو تیر و پنجی کے اندھیرے میں غم
 میری ماہ سے مخفی تھی۔ دیکھی۔ میں حیران ہوں کہ اس فرزندِ یگانہ منی منشی نبی بخش کو کس درجے کی سخن
 اور سخن سنجی عنایت ہوئی ہے؛ حالانکہ میں شعر کستا ہوں اور شعر کنا جانتا ہوں؛ مگر جب تک میں نے اس
 بزرگوار کو نہیں دیکھا یہ نہیں سمجھا کہ سخن فنی کیا چیز ہے؛ اور سخن فہم کسکو کہتے ہیں؛ مشہور ہے کہ خدا نے
 سخن کے دو حصے کئے: آدھا یوسف کو دیا اور آدھا تمام نبی نورِ انسان کو، کچھ تعجب نہیں کہ فہم سخن اور
 ذوقِ سنجی کے بھی دو حصے کئے گئے ہوں اور آدھا منشی نبی بخش کے اور آدھا تمام دنیا کے حصے میں آیا ہو
 گو زندہ اور آسمان میرا کیسا ہی مخالفت ہو میں اس شخص کی دوستی کی بدولت زمانے کی دشمنی سے بیفکر
 ہوں: اور اس نعمت پر دنیا سے تانے۔

مرزا پر جب شعر کے متعلق کوئی ایسی فرمائش کی جاتی تھی جو اُن سے آسانی سرانجام نہ ہو سکتی تھی
 تو وہ اس بات کا کچھ خیال نہ کرتے تھے کہ میری شاعری کی شہرت و ناموری پر حرف آئیگا؛ بلکہ صاف
 لکھتے جھپٹتے تھے کہ میری طاقت سے باہر ہے۔ ایک بار غالباً مجتہد العصر سید محمد صاحب مرحوم و مغفور نے
 مرزا سے اس بات کی خواہش کی کہ اردو میں جناب سید الشہداء کا مرثیہ لکھیں۔ چونکہ مرزا انکی بہت
 تعلیم کرتے تھے اور انکے سوال کو رد کرنا نہیں چاہتے تھے اُن کے حکم کی تعمیل کے لئے مرثیہ لکھنے بیٹھے۔ چونکہ

قسم، وساتیر کی قسم، زند کی قسم، پازند کی قسم، اُستاک کی قسم، گرو کے گزنتھ کی قسم، نہ میرے پاس وہ قصیدہ،
 نہ مجھے وہ رباعیاں یاد۔ کلیات کے باب میں جو عرض کر چکا ہوں۔
 برہانیم کہ استیم و ہماں خواہد بود۔

مرزا کی اسی راستبازی کا سبب تھا کہ وہ کوئی کام چھپا کر نہیں کرتے تھے۔ جو دل میں تھا وہی زبان
 پر تھا۔ جو خلوت میں کرتے تھے وہی جلوت میں بھی کرتے تھے۔ پس اگر اُن میں کوئی عیب تھا تو وہی تھا
 جسکو ہر کس و ناکس جانتا تھا؛ مخفی عیبوں سے وہ بالکل پاک تھے
 وہ اس خیال سے کہ اُن کے کلام کی قدر کرنے والے بہت کم تھے اکثر تنگ دل رہتے تھے۔ چنانچہ
 اس بات کی انھوں نے فارسی اور اردو نظم و نثر میں جا بجا شکایت کی ہے ایک روز قلعے سے سیدھے
 نواب مصطفیٰ خاں کے مکان پر آئے؛ اور کہنے لگے کہ ”آج حضور نے ہماری بڑی قدر دانی فرمائی۔ عید
 کی مبارکباد میں قصیدہ لکھ کر لے گیا تھا؛ جب میں قصیدہ پڑھ چکا تو ارشاد ہوا کہ ”مرزا تم پڑھتے بہت
 خوب ہو،“ اسکے بعد نواب صاحب اور مرزا زمانے کی ناقدر دانی پر دیر تک افسوس کرتے رہے۔
 مہر نیم وز میں اس مضمون کو کہ میں نے اپنا کمال شاعری محض ناقدر دانوں کی مدح سرائی میں صرف
 کیا وہ ایک جگہ اس طرح بیان کرتے ہیں ”در سینہ من نغمے داشت بہ رواں آسانی نسیم کہ از نثر ناز
 دزد و زبایاں زده من۔ کہ دم خبر نہا بایست نہ ز دم۔ بنان مرا طے بود بہ دجلہ باری ابرے
 کہ از قبلہ خیزد؛ بیدہ کوش من۔ کہ باراں بشورہ زار فردر بختم،“ یہی وجہ تھی کہ جب حسن اتفاق
 سے اُن کو کوئی سخن سنج اور سخن فہم میسر آجاتا تھا تو اسکو ایک نعمت غیر مترقبہ سمجھتے تھے۔ منشی
 نبی بخش حقیر تخلص۔ جو ایک زمانے میں کول میں سرشتہ دار تھے، اور خلی سخن فہمی اور سخن سنجی کی

ناقد دانی
 کی شکایت

سخن فہمی
 قدر
 منشی حقیر کی

سرایت کر گئی تھی باوجود اسکے وہ روایت اور حکایت اور وعدہ و اقرار اور بات چیت میں نہایت راست گفتار اور صادق اللہیت تھے۔ اسی لئے جو شخص انکے وعدے یا اقرار کا یقین نہ کرتا تھا اُس سے نہایت ناراض ہوتے تھے۔ تفصل حسین خاں مرحوم خلعت دیوان فضل اللہ خاں سے مرزا نے اپنا دیوان مانگا ہے اور اقرار کیا ہے کہ میں اُسکو دیکھ کر واپس بھیج دوں گا۔ اُنھوں نے دیوان کے دینے سے انکار کیا ہے۔ اُن کے انکار کے جواب میں مرزا لکھتے ہیں در کیوں صاحب! یہ چچا بھتیجا ہونا اور شاگردی و استادی سب پر پانی پھر گیا؟ اگر کوئی ہزار پانسو کی چیز ہوتی اور میں تم سے مانگتا تو خدا جانے تم کیا غضب ڈھاتے؟ میرا کلام! خرید آٹھ دن روپیے کی! سودہ بھی میں یہ نہیں کہتا کہ مجھکو دے ڈالو؛ تلمو مبارک رہے؛ مجھکو مستعار دو؛ میں اُسکو دیکھ لوں؛ جو میرے پاس نہیں ہے اُسکی نقل کروں؛ پھر تم کو واپس بھیج دوں؛ اس طرح کی طلب پر نہ نیا دلیل اسکی ہے کہ مجھکو جھوٹا جانتے ہو؛ میرا اعتبار نہیں؛ یا یہ کہ مجھکو آزار دینا اور ستانا بدل منظور ہے۔ وہ کتاب ابھی میرے آدمی کو دیدو۔ باللہ واللہ میں اُمیں سے جو میرے پاس نہیں ہے نقل کر کے بھیج دوں گا۔ اگر تلمو واپس نہ دوں تو مجھے لعنت؛ اور اگر تم میری قسم کو نہ مانو اور کتاب حامل رقمہ کو نہ دو تو تلمو آفریں،

اسی طرح ایک خط میں نواب علاؤ الدین خاں کو لکھتے ہیں

”پرست مرگ دے بدتر از گمان تو نیست“

مکرر لکھ چکا ہوں کہ قصیدے کا مسودہ میں نے نہیں رکھا؛ مکرر لکھ چکا ہوں کہ مجھے یاد نہیں کون سی رباعیاں مانگتے ہو؛ پھر لکھتے ہو کہ رباعیاں بھیج، قصیدہ بھیج؛ معنی اسکے یہ کہ توجھوٹا ہے؛ ابکے تو مقرر نہ بھیجے گا۔ بھائی قرآن کی قسم؛ انجیل کی قسم، تورات کی قسم، زبور کی قسم، ہنود کے چار بیڑ کی

لکھا ”دخوک سُم دار و نہ پنجہ اگر تزدیک اسانزدہ اطلاق سُم و پنجہ بیک محل روا باشد اعلام باید فرمود“ مرزا نے اسکے جواب میں صاف لکھ دیا اگر کلیات فارسی کے چھپنے سے پہلے آپ کا خط پہنچ جاتا تو میں اس لفظ کو بل ڈالتا؛ اور اس مصرع کو اس طرح بنا دیتا ”دخوک شد و بنفسی ساز کرد“، چنانچہ جب مرزا کا کلام دوسری بار چھپا تو انھوں نے یہ مصرعہ اسی طرح بنا دیا۔

مرزا کے ایک فارسی قصیدے کی تشبیب کا یہ شعر ہے۔

ہمچسباں در ترقی غیب ثبوتے دارند بوجودے کہ نذر نذر خارج اعیان
مرزا صاحب خود مجھے کہتے تھے کہ میں نے ثبوتے کی جگہ نمودے لکھا تھا۔ مولوی فضل حق کو جب یہ شعر سنایا تو انھوں نے کہا کہ اعیان ثابۃ کے لئے نمود کا لفظ نامناسب ہے اسکی جگہ ثبوت بنا دو۔ چنانچہ طبع ثانی میں انھوں نے بجائے نمود کے ثبوت بنا دیا ہے اسطرح ایک قصیدے کے مطلع کا پہلا مصرعہ یہ ہے

عید اسٹھے بسر غازی زمستاں آمد

مرزا نے اول عید قرباں لکھا تھا پھر نواب معطفے خاں مرحوم کے کہنے سے عید اسٹھے بنایا گیا۔ حالانکہ نواب صوف خود مرزا سے مشورہ مخبر کرتے تھے اور مومن مرحوم کے بعد ہمیشہ انھیں کو اپنا کلام دکھاتے تھے۔ ان باتوں کے بیان کرنے سے مرزا کی تفریش خلقت کو دکھانی مقصود نہیں ہیں بلکہ انصاف اور حق پسندی کی شریف خصلت اور وہ ملکہ جسکے بغیر انسان کبھی ترقی نہیں کر سکتا مرزا کی ذات میں دکھانا مقصود ہے۔ جن لوگوں میں اپنی غلطی کو تسلیم کرنے کی قابلیت نہیں ہوتی ان کا اپنے فن میں ترقی کرنا ناممکن ہے۔

حالانکہ ایشیائی شاعری۔ جسکی بنیاد جھوٹ اور مبالغے پر رکھی گئی ہے۔ مرزا کی رگ و پے میں

شاہیر نے اسپر شریں تقریظیں لکھی تھیں ؛ اور مرزا نے نظم میں ایک ثمنوی لکھی تھی۔ جو انکے کلیات میں موجود ہے۔ باوجودیکہ مرزا کو سرسید کی خاطر بہت عزت تھی ، اور وہ اُن سے اور انکے خاندان سے مثل گیاروں کے ملتے تھے ؛ مگر چونکہ مرزا۔ ابو الفضل کی طرزِ تحریر کو پسند نہیں کرتے تھے ، اور جو آئین اُس کتاب میں لکھے ہیں انکو اس زمانے کے آئینوں کے مقابلے میں ہیچ و بیچ سمجھتے تھے ، اور تاریخ کا مذاق جیسا کہ خود انھوں نے اعتراف کیا ہے بالکل نہ کرتے تھے اس لئے آئینِ اکبری کی تصحیح کو انھوں نے ایک فضول کام سمجھا۔ گو انکی یہ رائے غلط ہو یا صحیح۔ مگر جو کچھ آئینِ اکبری اور اسکی تصحیح کی نسبت اُن کا خیال تھا اُسکو تقریظ میں ظاہر کئے بغیر نہیں رہے۔ چنانچہ اُس ثمنوی کے اول کے چند شعوریم اس مقام پر نقل کرتے ہیں۔

ثروہ یاراں را کہ ایس دیریں کتاب	یافت از اقبالِ سید فتح باب
ویدہ سینا آمد و باز و قوی	کننگی پوشید قشریتِ نوی
دیں کہ در تصحیح آئینِ رائے اوست	ننگ و عابرِ ہمتِ والاے اوست
دل بہ شغلے بست و خود را شاد کرد	خود مبارک بندہ آزاد کرد
گو ہر شس را انکہ نتواند ستود	ہم بدیں کار شس ہی دانستود
بر چنین کارے کہ اصلش ایس بود	اں ستاید کش ریا آئین بود
من کہ آئینِ ریا را دشمنم	درد و اندازہ دانِ خود منم

مرزا آثارِ افساد کی تقریظ میں سرسید کی نسبت لکھتے ہیں دو باگمنا نش دلست از فرزانی بآئینِ ہر دمی دانا ؛ و با منش پائی ہر
 از نشینی بیچونہ خوں مانا ،
 مبارک بندہ آزاد کردن عبت کام کرنے کو کہتے ہیں۔ ہمیں لطف یہ ہے کہ ابو الفضل کے باپ کا نام مبارک تھا ،

نہوں - ختم ہو جاتا تھا - اخیر میں کتاب کی نسبت چند جملے جو اصلیت سے خالی نہوتے تھے ، اور مصنف کے خوش کرنے کے لئے کافی ہوتے تھے ، لکھ دیتے تھے ۔ اسی وجہ سے بعض اوقات ایسا بھی ہوتا تھا کہ لوگ مرزا سے شکایت کرتے تھے کہ آپ نے سائنس میں مضائقہ کیا ہے ۔

جب مرزا نے منشی ہرگوپال تفتہ کے دیوان کی تقریظ جو کلیات شریعالب میں موجود ہے - لکھ کر بھیجی تو انھوں نے بھی اسی قسم کی شکایت کی تھی ۔ مرزا کے جواب میں لکھتے ہیں ” کیا کروں اپنا شیوہ ترک نہیں کیا جاتا ۔ وہ روش ہندوستانی فارسی لکھنے والوں کی ٹھکونیسی آتی کہ بالکل بھاٹوں کی طرح بکنا شروع کر دیں ۔ میرے قصیدے دیکھو ؛ تشبیب کے شعر بہت پاؤ گے ؛ اور مرچ کے شعر کمتر نثر میں بھی یہی حال ہے ۔ نواب مصطفیٰ خاں کے تذکرے کی تقریظ کو ملاحظہ کرو کہ اُن کی مرچ کتنی ہے ؟ مرزا رحیم الدین بہادر جیہ تخلص کے دیوان کے دیباچے کو دیکھو ۔ وہ جو تقریظ انطباع دیوان حافظ کی - جان جاکوب بہادر کی فرمائش سے لکھی ہے اُسکو دیکھو ؛ کہ فقط ایک بیت میں اُنکا نام اور اُنکی مرچ آئی ہے اور باقی نثر میں اور ہی اور مطالب ہیں ۔ واللہ باللہ اگر کسی شاہزادے یا امیر زادے کے دیوان کا دیباچہ لکھتا تو یہی مرچ اتنی ذکر تا کہ جتنی تمھاری مرچ کی ہے ۔ ہلکو اور ہماری روش کو اگر پہچانتے تو اتنی مرچ کو بہت جانتے ۔ فقہ مختصر تمھاری خاطر کی اور ایک فقرہ تمھارے نام کا بدل کر اُسکے عوض ایک فقرہ اور لکھ دیا ہے ۔ اس سے زیادہ بھٹی میری روش نہیں ۔ ظاہر اتم خود فکر نہیں کرتے ؛ اور حضرات کے بکائے میں آجاتے ہو ۔ وہ صاحب تو بیشتر اس نظم و نثر کو مہل کہیں گے ۔ کس واسطے کہ اُن کے کان اس آواز سے آشنا نہیں ۔ جو لوگ کتیل کو اچھے لکھنے والوں میں جانی گئے وہ نظم و نثر کی خوبی کو کیا پہچانیں گے ۔

(نثر) سید احمد خاں نے جب نہایت جانتقانی اور عرق ریزی سے آئین اکبری کی تصحیح کی تو دہلی کے

فیضان
دیوان
تقریظ

نثر

ہوئے! اور مجھے بار بار پڑھواتے تھے اور سر دھنتے تھے۔ ہم بھی دیکھتے ہیں کہ مرزا نے اپنے اردو خطوں میں اس شعر کا جابجا ذکر کیا ہے۔ جہاں عمدہ شعر کی مثالیں دی ہیں وہاں اس شعر کو ضرور لکھا ہے۔ اسی طرح مومن خاں کا جب یہ شعر سنا۔

تم مرے پاس ہوتے ہو گو یا جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

تو اسکی بہت تعریف کی اور یہ کہا، "کاش مومن خاں میرا سارا دیوان لے لیتا اور صرف یہ شعر مجھ کو دیتا، اس شعر کو بھی انھوں نے اپنے متعدد خطوں میں نقل کیا ہے۔ اسی طرح سودا کا یہ شعر بھی ایک مقام پر لکھا ہے دکھلائے لجا کے تجھے مصرعہ کا بازار لیکن کوئی خواہاں نہیں وہاں جنس گراں کا ایک محبت میں نواب مرزا خاں داغ کے اس شعر کو بار بار پڑھتے تھے اور اس پر وجد کرتے تھے۔

سُبحِ روشن کے آئے شمع رکھ کوہِ یہ کہتے ہیں اُدھر جاتا ہے دیکھیں یا اُدھر پروانہ آتا ہے" بعض اوقات وہ اپنے شاگردوں کے کلام سے اس قدر متاثر ہوتے تھے کہ اسکی تعریف میں شاید انکا دل بڑھانے کو عمدہ سے زیادہ مبالغہ کرتے تھے۔ انھوں نے اخیر عمر میں اپنے ایک شاگرد کی غزل دیکھ کر اسکی بے انتہا تعریف کی؛ اور یہ کہا "اگر اس اب رنگ کر نیکی قابل ہوتا تو تم محسود ہوتے اور میں حاسد،

مرزا پر تقرظوں کی بے انتہا فرمائشیں ہوتی تھیں۔ اور جیسا کہ ظاہر ہے تعریف کی مستحق فی الحقیقت بہت ہی کم کتابیں ہوتی ہیں۔ مرزا کی طبیعت چونکہ صلح جو اور نرم و مرنجاں واقع ہوئی تھی وہ کسی سے انکار تو نہیں کرتے تھے؛ مگر تقریظ نگاری کا انھوں نے ایسا طریقہ اختیار کیا تھا کہ کوئی بات راستی کے خلاف بھی نہ ہو اور صاحب کتاب خوش بھی ہو جائے۔ بہت سادہ تمہیدیں، یا مصنف کی ذات اور اس کے اخلاق، یا اسکی محبت اور دوستی کے بیان میں، یا اور لطیف اور پاکیزہ باتوں کے ذکر میں بیچل

نکاح
حقیقہ
چھوٹا

اس واقعے کے بعد یہ بات عموماً مشہور ہو گئی کہ بادشاہ شیعہ ہو گئے۔ اس شہرت کا بڑا اثر ہوا، اور حکیم احسن اللہ خاں مرحوم نے اسکے تدارک کے لئے کچھ رساں ۱۰۰

اشتمارات کو چوں اور بازاروں میں چسپاں کرائے گئے، اور بادشاہ نے اسکے ہر ایک شعر پر خواہ اچھا بھی ایک مثنوی فارسی زبان میں لکھی۔ جگانام غالباً مثنوی شعر میں کچھ تیز نہیں کی جاتی؛ مرزا کی کو تشیع کے اتمام سے بری کیا گیا تھا۔ اس مثنوی پر دومی ہو جب تک اسکا کوئی شعر فی الواقع مرزا کو بلکہ جو معنا میں حکیم احسن اللہ خاں نے بتائے تھے اے۔

جب یہ مثنوی لکھو پہونچی تو مجتہد اے۔ ایہ میں تو اں کا نقل سماعت انتہا کو پہونچ گیا تھا؛ مگر شعر اُن کے دل میں نہ چھپتا تھا اس سے مس نہوتے تھے۔ اُنکے بعض معاصرین اس بات سے آزرہ رہتے تھے؛ اور اسی لئے اُنکی شاعری پر نکتہ چینیاں کرتے تھے۔ مگر مرزا باوجودیکہ اُن کی طبیعت نہایت

صلح جو واقع ہوئی تھی۔ شعر کی داد دینے کا جو طریقہ اُنھوں نے اختیار کیا تھا اسکو وہ کبھی ہاتھ سے نہ دیتے تھے۔ لیکن جو شعرا اُن کے دل میں چھب جاتا تھا اسکی تعریف بھی ایسی کرتے تھے جو بلائے کی حد کو پہونچ جاتی تھی۔ و در حقیقت کسی کے خوش کرنے کے لئے ایسا نہیں کرتے تھے؛ بلکہ ذوق سخن اُن کو بے اختیار کر دیتا تھا۔ شیخ ابراہیم ذوق خلی نسبت مشہور ہے کہ مرزا کو اُن سے چشمک مٹی۔ ایک روز جب کہ مرزا شطرنج میں مصروف تھے منشی غلام علی خاں مرحوم نے اُنکا یہ شعر کسی دوسرے شخص کے سامنے کو پڑھا۔ اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مرزا بیٹنگ

مر کے بھی چنین نہ پایا تو کہ مرزا بیٹنگ

خان مرحوم کہتے تھے کہ مرزا کے کان میں بھی اسکی بیٹنگ پڑ گئی فوراً شطرنج چھوڑ دی اور مجھ سے کہا بیٹا تنے کیا پڑھا؟ میں نے پھر وہ شعر پڑھا۔ پوچھا کس کا شعر ہے؟ میں نے کہا ذوق کا۔ یہ سنکر نہایت متعجب

راہ ہے! اور مجھے بار بار پڑھواتے تھے اور سر دھنتے تھے۔ ہم بھی دیکھتے ہیں کہ مرزا نے اپنے اردو خطوں میں اور جس طرح میں کتنا ہنر ہے۔ جہاں عمدہ شعر کی مثالیں دی ہیں وہاں اس شعر کو ضرور لکھا ہے۔ اسی طرح سے کہ کوئی تعلق تھا؛ بلکہ صرف دوستی۔

کی۔ جو کچھ پہلے لکھ چکے تھے اسکو تو اسی طرح گو یا جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

غالب ایسے اندیشہ پذیر مہمے، ناں میرا سارا دیوان لے لیتا اور صرف یہ شعر مجھ کو دیتا، اس

اے کہ ختم المرسلینش غوانہ کیا ہے۔ اسی طرح سودا کا یہ شعر بھی ایک مقام پر لکھا ہے

ایں اعت لائے کہ اشتقاق راست حکم کیا۔ کوئی خواہاں نہیں وہاں جس گراں کا

منشأ ایجاد ہر عالم کیست گرد و صفت ز عالم بود خام یکیت

اسکے بعد اسی مضمون کو اور زیادہ پھیلا یا ہے؛ اور پھر مثنوی کو ان دو شعروں پر جن میں نظیر خاتم نہیں کے متعلق بالذات ہونے کی تصریح ہے ختم کر دیا ہے۔

منفرد اندر کمال ذاتی است لاجرم شلش محال ذاتی است

نیز عقیدت بزرگ دردم و اسلام نامہ را درمے نور دم و اسلام

اد پر کے بیان سے ناظرین کو معلوم ہوا ہو گا کہ مرزا کی طبیعت میں کس قدر سلاست روی تھی؟ اور اعوجاج سے کس قدر اتکا ذہن! با کرتا تھا؟ با وجودیکہ مولانا فضل حق نے اس مسئلے کے متعلق جو کچھ انگلی راے تھی مرزا کے خوب ذہن نشین کر دی تھی اور مرزا اسی کو اپنی مثنوی میں بیان کرنا چاہتے تھے مگر جس طرح ایک ٹیڑھی چیز نیکی میں اگر سیدھی ہو جاتی ہے اسی طرح مرزا کی راست بیانی نے اس ٹیڑھی راے کے تمام بل نکال ڈالے اور بغیر اسکے کہ مرزا کو دباہیوں کی حمایت منظور ہو جو ٹھیک بات تھی وہ

اس واقعے کے بعد یہ بات عموماً مشہور ہو گئی کہ بادشاہ شیعہ ہو گئے۔ اس شہرت کا بادشاہ کو بہت
سبب ہوا؛ اور حکیم احسن اللہ خاں مرحوم نے اسکے تدارک کے لئے کچھ رسالے شائع کرائے، اور یہی
اشتہارات کو چوں اور بازاروں میں چسپاں کرائے گئے، اور بادشاہ کے حکم سے مرزا صاحب نے
بھی ایک شنیوی فارسی زبان میں لکھی۔ جس کا نام غالباً منع الباطل رکھا گیا تھا، اور جس میں بادشاہ
کو تشیع کے اہتمام سے بری کیا گیا تھا۔ اس شنیوی میں مرزا نے اپنی طرف سے کوئی بات نہیں لکھی تھی
بلکہ جو مفنا میں حکیم احسن اللہ خاں نے بتائے تھے اُن کو فارسی میں نظم کر دیا تھا۔

جب یہ شنیوی لکھنو پہنچی تو مجتہد العصر نے مرزا سے دریافت کیا کہ کیا آپ نے خود مذہب شیعہ اور مرزا
حیدر شکوہ کی نسبت اس شنیوی میں ایسا اور ایسا لکھا ہے؟ مرزا نے بلکہ بھیجا کہ میں ملازم شاہی ہوں
جو کچھ بادشاہ کا حکم ہوتا ہے اسکی تعمیل کرتا ہوں۔ اس شنیوی کا مضمون بادشاہ اور حکیم احسن اللہ خاں
کی طرف سے اور الفاظ میری طرف سے تصدیق فرمائے جائیں۔

مرزا کی طبیعت نہایت سلیم واقع ہوئی تھی۔ باوجودیکہ تیزی ذہن اور سلامتی طبع دونوں ایک جگہ بہت کم
جمع ہوتی ہیں؛ مرزا میں یہ دونوں باتیں بوجہ اتم موجود تھیں۔ اسی سلامتی طبع کا اقتضا تھا کہ ابتداء سے
مشق سخن میں جو طرزِ حارستہ انھوں نے اختیار کیا تھا۔ بغیر اسکے کہ کوئی استاد رہبری کرے۔ جس قدر
عقل و تیز رفتاری گئی اسی قدر آہستہ آہستہ اس سے انحراف ہوتا گیا؛ اور آخر کار اساتذہ مسلم البتہ
کی روش مستقیم پر آرہے۔

کتابی حکیم

مرزا اندازہ عجز و انکسار کما کرتے تھے کہ قصائد کی تشبیہ میں تو میں بھی جہاں عافی و انوری پہنچتے ہیں
انہاں دخیلاں پہنچ جاتا ہوں؛ مگر مریج و شائش میں مجھے اُن کا ساتھ نہیں دیا جاتا۔ مرزا کا یہ کہیں بلکہ

مرزا بیباں سرت بادشاہ کے خوش کرنے اور اس دربار کے ہمناسے کے لئے لکھی گئی تھیں؛ کیونکہ
 دربار میں ایک متعین بھی ایسا تھا جو مرزا کو شہنشاہ یا کم سے کم تفتیشی نہ جانتا ہو۔ مرزا اکثر مواقع پر
 بادشاہ کے خوش کرنے کو اس قسم کے اشعار و باریں پڑھا کرتے تھے ایک روز سلطان نظام الدین
 نے اس سترہ اور امیر خسرو کی شہریت کا ذکر دربار میں ہوا، ہاتھ مرزا نے اسی وقت یہ شعر انشا کر کے چلا

مے دوزخ شدوں کہ بدست حق سے ہیں طالب نظام الدین کو خسرو سراج الدین کو غالب

رضوان کا مینا تھا؛ ایک سنی موبی مرزا سے ملنے کو آئے، عہد کا وقت تھا۔ مرزا نے قندکار
 سے پانی مانگا۔ موبو بیباں نے تعجب سے کہا، کیا جناب کو روزہ نہیں ہے؟ مرزا نے کہا، سنی
 مسلمان ہوں؛ چار گھنٹہ دن رہے روزہ کھول لینا ہوں۔

ایک دفعہ بیمار شاہ بہت سخت بیمار ہوئے۔ اس زمانے میں مرزا حیدر شاہ جو اکبر شاہ کے
 بیٹے اور مرزا سیلاہاں شاہ کے بیٹے تھے وہ بھی لکھنؤ سے آئے ہوئے تھے اور بادشاہ کے ہاں
 معائنہ تھے۔ ان کا مذہب اثنا عشری تھا۔ جب بادشاہ کو کسی طرح آرام نہ ہوا مرزا حیدر شاہ کی
 صدا سے خاک تھادی گئی اور اس کے بعد بادشاہ کو صحت ہو گئی۔ مرزا حیدر شاہ نے نذر مانی تھی
 کہ بادشاہ کو صحت ہو جائیگی تو حضرت عباس کی درگاہ میں جو کہ لکھنؤ میں ہے علم چڑھاؤنگا۔ چنانچہ
 انہوں نے لکھنؤ جا کر بادشاہ کو عرضداشت بھیجی کہ میرا مقدمہ نذر ادا کرنے کا نہیں ہے؛ حضور مرد
 فرمائیں۔ یہاں سے بادشاہ نے کچھ روپیہ مرزا حیدر شاہ کو بھیج دیا اور انہوں نے بڑی دھوم دھام
 سے علم چڑھایا۔ جس میں اودھ کا تمام شاہی خاندان اور امرات و علمائے شریک تھے۔ اور مجتہد اعظم
 کے ہاتھ سے علم چڑھوایا گیا۔

نہیں جانتا کہ مگر نے کس طرح مجھے باغی مسلمانوں میں شمار کیا۔

اگرچہ مرزا کا اصل مذہب صلح کل تھا مگر زیادہ تر انکا میلان طبع تشیع کی طرف پایا جاتا تھا اور جناب امیر کو وہ رسول خدا کے بعد تمام امت سے افضل جانتے تھے۔

ایک بار مرحوم بہادر شاہ نے دربار میں یہ کہا کہ مہنے سنا ہے کہ مرزا اسد اللہ خاں غالب شیعی المذہب ہیں۔ مرزا کو بھی اطلاع ہو گئی۔ چند رباعیاں لکھ کر حضور کو سنائیں۔ جن میں تشیع اور رفض سے تماشائی کی تھی۔ ان میں سے ایک رباعی جو بہت لطیف ہے مجھ کو یاد رہ گئی ہے جو یہاں لکھی جاتی ہے

رباعی

جن لوگوں کو ہے مجھ سے عداوت گہری کہتے ہیں مجھے وہ را فضی اور دہری
دہری کیونکر ہو جو کہ ہو دے صوفی؟ شیعی کیونکر ہو ماوراء النہری؟

دہریت اور تصوف میں جو نین بعید ہے وہ ظاہر ہے؛ دہری خدا کے وجود ہی کا قائل نہیں اور صوفی صرف خدا ہی کو موجود جانتا ہے اور ماسوا کو بیچ سمجھتا ہے پس صوفی دہری کیونکر ہو سکتا ہے؟ چوتھے مصرع کا یہ مطلب ہے کہ ماوراء النہر یعنی ترکستان کے لوگ متعصب سنی ہونے میں ضرب المثل ہیں؛ یہاں تک کہ شیعوں کو نا صبی اور خارجی سمجھتے ہیں۔ چونکہ مرزا کی اصل ماوراء النہر سے تھی اس لیے کہتے ہیں کہ ایک ماوراء النہری را فضی یا شیعی کیونکر ہو سکتا ہے؟

جو لوگ مرزا کی طرز مزاج اور طرز کلام سے نا آشنا ہیں وہ شاید یہ سمجھیں کہ مرزا نے بادشاہ کی حضور میں اپنا رسوخ قائم رکھنے کے لئے اپنا مذہب غلط بیان کیا؛ لیکن اصل حقیقت یہ ہے کہ یہ سب

لہذا
بیان

انہوں نے تمام عبادات اور قرائن و واجبات میں سے صرف دو چیزیں لے لی تھیں ایک توحید
وجودی اور دوسرے بنی اور اہمیت بنی کی محبت ؛ اور اسی کو وہ وسیلہ نجات سمجھتے تھے ۔

اگرچہ شاعر کے کلام سے اُسکے عقائد پر استدلال نہیں ہو سکتا مگر حوالات دل سے نکلتی ہے وہ بھی
نہیں رہتی معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح اکثر حکماء اسلام نے نعیم جہانی سے انکار کیا ہے مرزا بھی اُسکے
قائل نہ تھے چنانچہ انہوں نے اس خیال کو اپنے شاعرانہ انداز میں متعدد جگہ ظاہر کیا ہے ایک جگہ
کہتے ہیں ”ہم کو معلوم ہے حجت کی حقیقت لیکن ہر دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے“

یہی خیال ایک فارسی رباعی میں اس طرح ظاہر کیا ہے ”گردیدن ز اہداں بر جنت گستاخ
واں دست درازی بہ تر شاخ بشاخ ؛ چوں نیک نظر کنی ز روی تشبیہ ؛ ماند بہ ہاتم و غلت زار فراخ“
مرزا با وجودیکہ احکام ظاہری کے بہت کم پابند تھے ؛ لیکن مسلمانوں کی ذلت کی کوئی بات سن پکے
تھے تو ان کو سخت رنج ہوتا تھا ایک روز میرے سامنے اسی قسم کے ایک واقعہ پر نہایت افسوس کرتے
تھے اور کہتے تھے کہ مجھ میں کوئی بات مسلمانی کی نہیں ہے ؛ پھر میں نہیں جانتا کہ مسلمانوں کی ذلت پر
جھکوں کیوں اس قدر رنج اور تاسف ہوتا ہے ؛ مگر چونکہ طبیعت نہایت شدرخ واقع ہوئی تھی ۔ جب کوئی
گرم فقرہ سوجھ جاتا تھا پھر اُن سے بغیر کہے نہیں رہا جاتا تھا ؛ خواہ اس میں اُنکو کوئی کافر سمجھے ؛ یا
رند مشرب کہے ؛ یا بد مذہب جانے ۔

عذر کے بعد ۔ جبکہ نیشن بند تھی اور دربار میں شریک ہونے کی اجازت نہ ہوئی تھی ۔ پندت
موتی لال میر منشی نقشبندی پنجاب مرزا صاحب سے ملنے کو آئے ۔ کچھ پیشین کا ذکر چلا ۔ مرزا صاحب
نے کہا ”تمام عمر میں ایک دن شراب نہ پی ہو تو کافر ؛ اور ایک دفعہ نماز پڑھی ہو تو گنہگار ؛ پھر میں

میر ہمدی مجروح نے جے پور سے خط بھیجا ہے اور وہاں جو کسی تقریب میں کئی تئوں مصری کا شربت مہانوں کے لئے کیا گیا تھا اسکا ذکر لکھا ہے اسکے جواب میں مرزا لکھتے ہیں

”میر احمد حسین و مرزا قربان بیگ نامہ شمارا خواندند وہ ذوق شربت ہفت صد من نبات ہر دورا آب درد ہن گشت سخن از بادۂ ناب نبود ورنہ مرا نیز دل از جارفے“

مرزا نے غزلیات و قصائد و قطعات و رباعیات میں شراب کے متعلق جس قدر مضمون باندھے ہیں وہ خواجہ حافظ اور عمر قیام سے کم نہونگے ؛ یہاں ایک شعراء دو غزل کا اور ایک فارسی غزل کا اور ایک فارسی رباعی لکھی جاتی ہے۔

گل کے لئے کراچ نہخت شراب میں یہ سورطن ہے ساقی کوثر کے باب میں

خجالت نگر کہ درخشا تم نیاقتند جز روزہ درست یہ صبا کشودہ

غالب بہ سخن گرچ گشت ہنسیت از نشہ ہوش بچیت اندر نرسیت

مے خواہی دمفت و نقر و انگہ بسیار !! ایں بادہ فروش ساقی کوثر نرسیت

مرزا اسلام کی حقیقت پر نہایت پختہ یقین رکھتے تھے اور توحید و جود کو اسلام کا اصل اصول اور رکن دیکھ جانتے تھے۔ اگرچہ وہ بظاہر اہل حال سے نہ تھے ؛ مگر جیسا کہ کہا گیا ہے ”من حب شیئاً اکثر ذکرہ“، توحید و جود کی انکی شاعری کا عنصر بن گئی تھی۔ اس مضمون کو انھوں نے حق و اصناف سخن میں بیان کیا ہے غالباً نظیری اور بیدل کے بعد کسی نے نہیں بیان کیا۔ مرزا کے حق میں اگر اور کچھ نہیں تو عرفی کا یہ شعر ضرور صادق آتا ہے۔

امید ہست کہ بیگانے عرفی را بہ دوستی سخن ہا سے آشنا بخشند

میلوم

بیانی

اسلامیہ
پیشین

ایک روز میر محمدی مجروح بیٹھے تھے؛ اور مرزا پلنگ پر پڑے ہوئے کرا رہے تھے۔ میر محمدی پانوں
 دابنے لگے۔ مرزانے کہا: بھی تو سید زادہ ہے؛ مجھے کیوں گنہگار کرتا ہے؟ اُنھوں نے نہ مانا؛ اور
 کہا: آپ کو ایسا ہی خیال ہے تو پیر دابنے کی اجرت دیتے تھے گا۔ مرزانے کہا: ہاں اسکا مضائقہ نہیں
 جب وہ پیر داب چکے اُنھوں نے اجرت طلب کی۔ مرزانے کہا: دو بھتیا کیسی اجرت؟ تم نے
 میرے پانوں دابے؛ میں نے تمہارے پیسے دابے؛ حساب برابر ہوا۔

ایک دن قبل غروب آفتاب کے مرزا صاحب شام کا کھانا کھا رہے تھے اور کھانے میں صرف شامی کباب
 تھے میں بھی وہاں موجود تھا اور اُنکے سامنے بیٹھا رومال سے مکھیاں جھل رہا تھا۔ مرزانے کہا: آپ
 ناحق تکلیف فرماتے ہیں؛ میں ان کبابوں میں سے آپ کو کچھ نہ دے گا۔ پھر آپ ہی یہ حکایت بیان کی کہ
 ”نواب عبدالاحد خاں کے دسترخواں پر اُن کے مصاحبوں اور عزیزوں اور دوستوں کے لئے ہر قسم کے
 کھانے چنے جاتے تھے؛ مگر خاص اُنکے لئے ہمیشہ ایک چیز تیار ہوتی تھی۔ وہ اُسکے سوا اور کچھ نہ کھاتے
 تھے۔ ایک روز اُنکے لئے مرعرق پکا تھا؛ وہی اُنکے سامنے لگایا گیا۔ مصاحبوں میں ایک دوم بہت
 منہ لگا ہوا تھا جو اسوقت دسترخوان پر موجود تھا۔ نواب نے اُسکو کھانا دینے کے لئے خالی رکابی
 طلب کی۔ اُسکے آنے میں دیر ہوئی۔ نواب کھانا کھاتے جاتے تھے اور خالی رکابی بار بار مانگتے تھے۔
 وہ مصاحب نواب کے آگے رومال ہلانے لگا؛ اور کہا: ”حضور اور رکابی کیا کیجیے گا اب یہی خالی
 ہوئی جاتی ہے۔“ نواب یہ فقرہ سنکر پھٹک گئے اور وہی رکابی اُسکی طرف سرکا دی۔“

ایک دفعہ رات کو پلنگ پر لیٹے ہوئے آسمان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ تاروں کی طاہری بے نظمی
 اور انتشار دیکھ کر بوسے ”جو کام خود رائی سے کیا جاتا ہے اکثر بے ڈھنگا ہوتا ہے۔ ستاروں کو تو دیکھو“

باہر سے دور دور کا آم بطور سوغات کے آتا تھا؛ مگر حضرت کا جی نہیں بھرتا تھا۔ نواب مصطفیٰ خاں مرحوم ناقل تھے کہ ایک صحبت میں مولانا فضل حق اور مرزا اور دیگر احباب جمع تھے؛ اور آم کی نسبت ہر شخص اپنی اپنی رائے بیان کر رہا تھا کہ اُس میں کیا کیا خوبیاں ہونی چاہئیں۔ جب سب لوگ اپنی اپنی کہہ چکے تو مولانا فضل حق نے مرزا سے کہا کہ تم بھی اپنی رائے بیان کر۔ مرزا نے کہا بھی میرے نزدیک تو اُم میں صرف دو باتیں ہونی چاہئیں؛ میٹھا ہو اور بہت ہو۔ سب حاضرین ہنس پڑے۔

مرزا کو مدت سے رات کو سوتے وقت کسی قدر پینے کی عادت تھی۔ جو مقدار انہوں نے مقرر کر لی تھی اُس سے زیادہ کبھی نہیں پیتے تھے۔ جس کیس میں بولیں رہتی تھیں اُسکی کچی داروغہ کے پاس رہتی تھی؛ اور اُسکو سخت تاکید تھی کہ اگر رات کو سرخوشی کے عالم میں مجھ کو زیادہ پینے کا خیال پیدا ہو تو ہرگز میرا کسانہ ماتا؛ اور کبھی مجھ کو دنیا۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ وہ رات کو کبھی طلب کرتے تھے؛ اور نشے کی جھانجھ میں داروغہ کو بہت برا بھلا کہتے تھے؛ مگر داروغہ نہایت خیر خواہ تھا ہرگز کبھی نہ دیتا تھا۔ اول تو وہ مقدار میں بہت کم پیتے تھے؛ دوسرے اُسیں دو تین حقے گلاب ملا لیتے تھے۔ جس سے اُسکی جدت اور تیزی کم ہو جاتی تھی۔ چنانچہ ایک جگہ کہتے ہیں۔

آسودہ باد خاطر غالب کہ خوسے دوست
آئینختن بہ بادہ صافی گلاب را

مگر باوجود اس قدر احتیاط اور اعتدال کے اس کا فرشتے کی عادت نے آخر کار مرزا کی صحت کو سخت صدمہ پہنچا یا جسکی شکایت سے اُنکے تمام اُردو رفات بھرے ہوئے ہیں۔

مرزا کے خاص خاص شاگرد اور دوست جن سے نہایت بے تکلفی تھی۔ اکثر شام کو اُن کے پاس جا کر بیٹھتے تھے۔ اور مرزا سرور کے عالم میں اُس وقت بہت پر لطف باتیں کیا کرتے تھے۔

کے متولی صاحب کو آموں کی طلب میں لکھا ہے، ”ہمیں لکھتے ہیں، ”نئی شکم بندہ ام، و قدرے ناتواں، ہم آرائش خواں جویم، و ہم آرائش جاں۔ خرد و زان داند کہ ایس ہر دو صفت یہ انبہ اندرست؛ و اہل کلکتہ برآند کہ قلم و انبہ ہنگلی بندرست۔ آری انبہ از ہنگلی، و گل از گلشن؛ ایتار از جناب، و سپاں از من۔ شوق می سگالد کہ تا پایان موسم دوسہ بار بخاطر دلی نمت خواہم گزشت۔ و آرمی نالکہ کہ حاشا بدین بر خور واری خورند نخواہم گشت“

ایک روز مرحوم بہادر شاہ آموں کے موسم میں چند مصاحبوں کے ساتھ۔ جن میں مرزا بھی تھے۔ باغ حیات بخش یا مہتاب باغ میں ٹہل رہے تھے۔ آم کے پیڑ رنگ برنگ کے آموں سے لدرہے تھے۔ یہاں کا آم بادشاہ یا سلاطین یا بیگات کے سو کسی کو میسر نہیں آسکتا تھا۔ مرزا بار بار آموں کی طرف غور سے دیکھتے تھے۔ بادشاہ نے پوچھا ”مرزا اس قدر غور سے کیا دیکھتے ہو؟ مرزا نے ہاتھ باندھ کر عرض کیا ”پیر مرشد یہ جو کسی بزرگ نے کہا ہے ”بر سر ہر دانہ نوشتہ عیاں“ کایں فلاں ابن فلاں اسکو دیکھتا ہوں کہ کسی دانے پر میرا اور میرے باپ دادا کا نام بھی لکھا ہے یا نہیں۔ بادشاہ مسکرائے اور اسی روز ایک ہنگلی عمدہ عمدہ آموں کی مرزا کو بھیجوائی۔

حکیم رضی الدین خاں جو مرزا کے نہایت دوست تھے ان کو آم نہیں بھاتے تھے ایک دن وہ مرزا کے مکان پر برآمدے میں بیٹھے تھے؛ اور مرزا بھی وہیں موجود تھے۔ ایک گدھے والا اپنے گدھے لئے ہوئے بجلی سے گذرا۔ آم کے چھلکے پڑے تھے؛ گدھے نے سونگھ کر چھڑ دیے۔ حکیم صاحب نے کہا دیکھیے آم ایسی چیز ہے جسے گدھا بھی نہیں کھاتا۔ مرزا نے کہا بے شک گدھا نہیں کھاتا۔ مرزا کی نیت آموں سے کسی طرح سیر نہوتی تھی۔ اہل شہر تحفہ بھیجتے تھے، خود بازار سے شگواتے تھے،

بغیر ملے نکل گئے۔ مرزا کو معلوم ہوا تو انہوں نے ایک رقعہ دیوان جی کو لکھا، مضمون یہ: "کہ آج مجھ کو سزا
نہایت ہوتی ہے کہ شرم کے مارے زمین میں گڑا جاتا ہوں۔ اس سے زیادہ اور کیا مالالتقی ہو سکتی ہے
کہ آپ کبھی نہ کبھی تو اس ظن سے گدیں اور میں سلام کو حاضر ہوں،" جب یہ رقعہ دیوان جی پاس
پہنچا وہ نہایت شرمندہ ہوئے اور اسی وقت گاڑی میں سوار ہو کر مرزا صاحب کے ملے کو آئے۔

مرزا کی نہایت مرغوب غذا گوشت کے سوا اور کوئی چیز نہ تھی۔ وہ ایک وقت بھی بغیر گوشت کے
نہیں رہ سکتے تھے؛ یہاں تک کہ سسل کے دن بھی انہوں نے کھڑی یا شولہ کبھی نہیں کھایا۔ اخیر میں
اُن کی خوراک بت کم ہو گئی تھی۔ مہج کو وہ اکثر شیرہ بادام پیتے تھے۔ دن کو جو کھانا اُن کے لئے گھڑی کے
آتا تھا اُس میں صرف پادسیر گوشت کا قورسہ ہوتا تھا۔ ایک پیالے میں بوٹیاں، دوسرے میں کباب،
یا شوربا، ایک پیالی میں ایک ٹھکے کا چھلکا شیر بے میں ڈوبا ہوا، ایک پیالی میں کبھی کبھی ایک ٹڈے
کی زردی، ایک اور پیالی میں دو تیس پیسہ بھر دی، اور شام کو کسی قدر شامی کباب، یا سیخ کے کباب،
بس اس سے زیادہ اُنکی خوراک اور کچھ نہ تھی۔

ایک روز وہ پیر کا کھانا آیا، اور دسترخواں بچھا، برتن تو بہت سے تھے؛ مگر کھانا نہایت
فیل تھا۔ مرزا نے مسکرا کر کہا: "اگر برتنوں کی کثرت پر خیال کیجیے تو میرا دسترخوان یزید کا دسترخوان
معلوم ہوتا ہے؛ اور جو کھانے کی مقدار کو دیکھیے تو بایزید کا"

نو کہ میں آم اُن کو نہایت مرغوب تھا۔ آموں کی فصل میں اُن کے دوست و دور سے اُنکے
لئے عمدہ عمدہ آم بھیجتے تھے؛ اور وہ خود اپنے بعض دوستوں سے تقاضا کر کے آم منگواتے تھے۔
اُنکے فارسی مکتوبات میں ایک خط ہے جو غالباً گلتے کے قیام کے زمانے میں انہوں نے امام بابائے

بہت جھک کر جانا پڑتا تھا؛ اُسیں ہمیشہ فرش بچھا رہتا تھا اور مرزا اکثر گرمی اور ٹوکے موسم میں دس بجے سے تین چار بجے تک وہاں بیٹھتے تھے۔ ایک دن جبکہ رمضان کا مہینا اور گرمی کا موسم تھا۔ مولانا آزرود ٹھیک دوپہر کے وقت مرزا سے ملنے کو چلے آئے۔ اُس وقت مرزا صاحب اُسی کو ٹھڑی میں کسی دوست کے ساتھ چوسر یا شطرنج کھیل رہے تھے۔ مولانا بھی وہیں پہنچے؛ اور مرزا کو رمضان کے مہینے میں چوسر کھیلتے ہوئے دیکھ کر کہنے لگے کہ ”ہم نے حدیث میں پڑھا تھا کہ رمضان کے مہینے میں شیطان مقید رہتا ہے؛ مگر آج اس حدیث کی صحت میں تردید پیدا ہو گیا، مرزا نے کہا ”دقیقہ! حدیث بالکل صحیح ہے؛ مگر آپ کو معلوم رہے کہ وہ جگہ جہاں شیطان مقید رہتا ہے وہ یہی کو ٹھڑی تو ہے۔“

الغرض مرزا کی کوئی بات لطف اور ظرافت سے خالی نہ ہوتی تھی۔ اگر کوئی اُنکے تمام ملفوظات جمع کرنا تو ایک ضخیم کتاب لطائف و ظرائف کی تیار ہو جاتی۔

باوجودیکہ مرزا کی آمدنی اور نقد و بہت کم تھا؛ مگر خود داری اور حفظ وضع کو وہ کبھی ہاتھ سے نہ دیتے تھے۔ شہر کے امراء و عماء سے برابر کی ملاقات تھی۔ کبھی بازار میں بغیر بالکی یا ہوادار کے نہیں نکلتے تھے۔ عماء شہر میں سے جو لوگ اُنکے مکان پر نہیں آتے تھے؛ وہ بھی کبھی اُنکے مکان پر نہیں جاتے تھے۔ اور جو شخص اُنکے مکان پر آتا تھا وہ بھی اُسکے مکان پر ضرور جاتے تھے۔ ایک روز کسی سے بل کر نواب مصطفیٰ خان مرحوم کے مکان پر آئے؛ میں بھی اُس وقت وہاں موجود تھا؛ نواب صاحب نے کہا آپ مکان سے سیدھے یہیں آتے ہیں یا کہیں اور بھی جانا ہوا تھا؟ مرزا نے کہا مجھ کو آن کا ایک آنا دینا تھا؛ اس لیے اول وہاں گیا تھا؛ وہاں سے یہاں آنا ہوا۔ ایک دن دیوان فضل اللہ خاں مرحوم۔ چرٹ میں سوار۔ مرزا کے مکان کے پاس سے

تقریباً

کلیف

تو وہاں نواب صاحب آئے لیکن کھڑے تھے۔ مرزا نے اُن کو دیکھ کر یہ مصرع پڑھا "کہ آبِ شہیم
میراں درونِ تارِ کیمیت" جب دیوانہ نے میں پہنچے تو اُسکے دالان میں بسببِ شرقِ ربوہ ہونے کے
دم پھری ہوئی تھی۔ مرزا نے وہاں یہ مصرع پڑھا "ایں نازِ تمامِ آفتابِ ست" ایک صحبت
میں مرزا۔ میر تقی کی تعریف کر رہے تھے۔ شیخِ براہیم ذوق بھی موجود تھے؛ انہوں سو دا کو میر پر تنقید
ادی۔ مرزا نے کہا "میں تو تلو میری سمجھتا تھا مگر اب معلوم ہوا کہ آپ سودا گری میں

دوبلے نام بخش صہبانی مرحوم کی اسے پختہ قہ اور مینا بازار کی نسبت یہ بھی کہ یہ دونو تحریریں بھی
مثلِ سہِ شتر کے ناماً نموری کی ہیں مگر مرزا اسکے خلاف تھے۔ ایک جلسے میں دونو صاحب
موجود تھے۔ اتفاق سے یہ ذکر منبر گیا۔ مرزا نے کہا "تج نظر اسکے کہ سہ شتر کی اور پختہ قہ و مینا بازار
کی طرز میں ہون بعد ہے۔ نموری کی شان سے نہیں ہے کہ وہ شتر کے ساتھ نظم لکھے۔ تمام سہ شتر
میں ایسا ایک مفہوم بھی شکل سے نکلے گا جس میں شتر ہو اور نظم نہ ہو۔ بر خلاف اسکے تمام پختہ قہ و مینا بازار میں
ایک شعر کے سوا کہ وہ بھی نموری کا نہیں ہے۔ نظم کا کیس بتائیں۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ جو شخص نظم
شتر و نو چیزوں پر برابرت رکھتا ہو اسکی شتر میں کیس نظم نہ پائی جائے" مولانا صہبانی نے کہا "اے
اتفاقات اکثر ہو جاتے ہیں یہ محض ایک اتفاق کی بات ہے" مرزا نے کہا "بے شک! مگر یہ ایسا اتفاق
ہو گا کہ ایک شخص ہر ایک لہجہ سے نہایت سنجیدہ، شایستہ، اور مقول آدمی ہے؛ مگر اتفاق سے کبھی کبھی
کاٹ بھی لگتا ہے" یہ منکر ب لوگ ہنس پڑے؛ اور مولانا صہبانی مسکرا کر خاموش ہو رہے۔

مکان کے جس کمرے میں مرزا دن بھر بیٹھے اُٹھتے تھے وہ مکان کے دروازے کی چیت پر تھا؛
اور اُسکے ایک جانب ایک کوٹھڑی تنگ و تاریک تھی۔ جس کا در اس قدر چھوٹا تھا کہ کوٹھڑی میں

کہ کونسا مطلع اچھا ہے؟ اور بطور مٹھین کے اول نظیری کے مطلع کا یہی ترجمہ پڑھا۔ ابھی مولانا اپنا مطلع پڑھنے نہیں پائے تھے کہ مرزا اُس مطلع کو سُکر سر دھننے لگے؛ اور تجتیر ہو کر پوچھنے لگے کہ یہ مطلع کس نے لکھا؟ اور اس قدر تعریف کی کہ مولانا آزر دہ کو یہ امید نہ رہی کہ اس سے زیادہ میرے مطلع کی داویلیگی۔ چنانچہ انھوں نے اپنا مطلع نہیں پڑھا؛ اور سب لوگ نہایت تعجب کرتے ہوئے وہاں سے اُٹھے۔

مرزا حقائق و معارف کی کتابیں اکثر مطالعہ کرتے تھے اور اُن کو خوب سمجھتے تھے۔ نواب ممدوح فرماتے تھے کہ میں شاہ ولی اللہ کا ایک فارسی رسالہ جو حقائق و معارف کے نہایت دقیق مسائل پر مشتمل تھا۔ مطالعہ کر رہا تھا؛ اور ایک مقام بالکل سمجھ میں نہ آتا تھا۔ اتفاقاً اُسی وقت مرزا صاحب آئے۔ میں نے وہ مقام مرزا کو دکھایا۔ انھوں نے کسی قدر غور کے بعد اُسکا مطلب ایسی خوبی اور وضاحت کے ساتھ بیان کیا کہ شاہ صاحب بھی شاید اُس سے زیادہ نہ بیان کر سکتے۔

مرزا کی تقریر میں انکی تحریر اور اُن کی نظم و نثر سے کچھ کم لطف نہ تھا اور اسی وجہ سے لوگ اُن سے ملنے اور انکی باتیں سننے کے مشتاق رہتے تھے۔ وہ زیادہ بولنے والے نہ تھے؛ مگر جو کچھ انکی زبان سے نکلتا تھا لطف سے خالی نہ ہوتا تھا۔ طرافت مزاج میں اس قدر تھی کہ اگر اُن کو بجائے حیوانِ طبع کے حیوانِ طبع کہا جائے تو بجا ہے۔ حسن بیان، حاضر جوابی، اور بات میں سے بات پیدا کرنا انکی خصوصیات میں سے تھا۔

ایک دفعہ جب رمضان گزر چکا تو قلعے میں گئے۔ بادشاہ نے پوچھا مرزا تم نے کتنے روزے رکھے؟ عرض کیا پیر و مرشد ایک نہیں رکھا۔ ایک دن نواب مصطفیٰ خاں کے مکان پر ملنے کو آئے۔ ایک مکان کے آگے چھتہ بہت تاریک تھا۔ جب چھتے سے گزر کر دیوانہ خانے کے دروازے پر پہنچے۔

کتاب
فنی

حسن
بیان

اور
طرافت

لطیفہ

لطیفہ

شعری اور کتاب فی میں وہ ایک شے آدمی تھے۔ کیسا ہی مشکل مضمون ہو وہ اکثر ایک سری نظر میں اسکی تہ کو پہنچ جاتے تھے۔ نواب مصطفیٰ خاں مرحوم گلشن بیجا میں مرزا کی نسبت لکھتے ہیں ”مضامین شعری را کہا ہو حقیقتی فہم، و جمیع نکات و لطائف پنے می برد؛ و این فضیلت است کہ مخصوص خواص اہل سخن است۔ اگر طبع سخن شناس داری بایں نکتہ می رسی؛ چہ۔ خوش فکر اگر چہ کیاب است اما خوش فہم کیاب تر۔ خوشا حال کسیکہ از ہر دو شربے یافتہ، و حلقے ربودہ۔ بالجلجلیہ جنیں نکتہ بیخ فقر گفتار کمتر مری شدہ“، نواب مدوح نے مجھے ایک واقعہ بیان کیا جس سے مرزا کی سخن سنجی کا بہت بڑا ثبوت ملتا ہے۔ مولانا آزرہ نے ”دور نہیں“، ”خو نہیں“ اس زمین میں غزل لکھی تھی۔ انہیں اتفاق سے مطلع بہت اچھا غزل آیا تھا۔ مولانا نے اپنی غزل دوستوں کو سنا کر اُن سے کہا کہ ”اگرچہ مجھ کو دوسری ہے مگر اسی ردین و قافیہ میں نظیری کی بھی ایک غزل ہے جسکا مطلع یہ ہے ”عشق عصیانست اگر مستور نیست پکشتہ جرم زباں مغفور نیست“، ظاہر ہے کہ اگر نظیری ہندی نژاد ہوتا اور اسی زمین میں۔ جس میں ہماری غزل ہے۔ اُردو غزل لکھتا تو اُسکا مطلع اس طرح ہوتا ”عشق عصیاں ہے اگر مخفی و مستور نہیں پکشتہ جرم زباں ناجی و مغفور نہیں“، آؤ آج مرزا غالب کے ہاں چلیں اور۔ بغیر اسکے کہ قائل کا نام لیا جائے۔ اپنا مطلع اور نظیری کے مطلع کا یہی اُردو ترجمہ (جو اوپر مذکور ہوا) مرزا کو سنائیں اور پوچھیں کہ کون سا مطلع اچھا ہے، چونکہ نظیری کا مطلع اُردو ترجمے سے بہت بہت ہو گیا تھا۔ سب کو یقین تھا کہ مرزا نظیری کے مطلع کو ناپسند کرینگے اور مولانا آزرہ کے مطلع کو ترجیح دینگے۔ چنانچہ مولانا اور نواب صاحب اور بعض اور احباب مرزا کے ہاں پہنچے۔ معمولی بات چیت کے بعد مولانا نے کہا کہ اُردو کے دو مطلع ہیں؛ ان میں آپ مجھ کو کیجیے

اور اُس میں شطرنجی اور ایک ٹین کا ٹوماس سوت کی رسی کے لٹکانوں اور پیادہ پاچل دون ؛ کبھی شیراز
 جا نکلا ، کبھی مصر میں جا ٹھہرا ، کبھی نجف جا پہنچا ۔ نہ وہ دستگاہ کہ ایک عالم کامیزبان بن جاؤں ۔ اگر تمام
 عالم میں تھوسکے نہ سی ؛ جس شہر میں رہوں اُس شہر میں تو بھوکا نکلا نظر نہ آئے ۔ خدا کا مقہور ، خلق کا
 مردود ، بوڑھا ، ناتوان ، بیمار ، فقیر ، نکبت میں گرفتار ۔ میرے اور معاملات کلام و کمال سے قطع نظر
 کرو ؛ وہ جو کسی کو بھیک مانگتے نہ دیکھ سکے اور خود در بدر بھیگ مانگے وہ میں ہوں ۔“

عیسیٰ مرزا کی طبیعت میں درازی اور ذہن میں جودت اور سرعت انتقال تھی اسی طرح آنکا حافظہ بھی
 نہایت قوی تھا ۔ ہم اوپر لکھ چکے ہیں کہ اُنکے گھر میں کتاب کا کیس نشان نہ تھا ؛ ہمیشہ کرایے کی کتابیں
 منگوا لیتے تھے ؛ اور اُنکو دیکھ کر واپس بھیج دیتے تھے ۔ مگر جو لطیف یا کام کی بات کتاب میں نظر پڑ جاتی
 تھی اُن کے دل پر نقش ہو جاتی تھی ۔ فارسی کلام میں وہ کوئی لفظ یا محاورہ یا ترکیب ایسی نہیں
 برتتے تھے جسکی سداہل زبان کے کلام سے نہ دے سکتے ہوں ۔ کلکتے میں جن لوگوں نے اُن کے
 کلام پر اعتراض کئے تھے ، اور خبکے جواب میں مرزا نے مثنوی باء مخالفت لکھی تھی ؛ اُن کو مثنوی
 کے علاوہ ایک ایک اعتراض کے جواب میں دس دس بارہ سترہ سترہ اساتذہ کے کلام سے
 لکھ کر علیحدہ بھیجی تھیں ۔ چنانچہ اُنھوں نے اپنے خطوط میں اُنکو مفصل بیان کیا ہے ۔ برہان قاطع
 پر جو کچھ اُنھوں نے لکھا وہ محض اپنی یادداشت کے بھر دے پر لکھا ۔ فکر شعر کا یہ طریقہ تھا کہ اکثر
 رات کو عالم سرخوشی میں فکر کیا کرتے تھے ۔ اور جب کوئی شعر سرانجام ہو جاتا تھا تو کمربند میں ایک گہ
 لگا لیتے تھے ۔ اسی طرح آٹھ آٹھ دس دس گزہیں لگا کر سورتے تھے ۔ اور دوسرے دن صرف
 یاد پر سوچ سوچ کر تمام اشعار طبع کر لیتے تھے ۔

خدر کے بعد ایک باڑی سے نڈو دیکھا کہ فواب انٹرنٹ گورنر کے دربار میں اُن کو حسب معمول سات پارچہ کا غلامت مع تین رقوم جو اہر کے ملا تھا۔ لغتنی کے چیرا سی اور جمودار قاعدے کے موافق انعام لینے کو آئے۔ مرزا صاحب کو پہلے ہی معلوم تھا کہ انعام دینا ہوگا اس لئے اُنہوں نے دربار سے آتے ہی غلامت اور رقوم جو اہر بازار میں فروخت کرنے کے لئے بھیج دی تھیں۔ چیرا سیوں کو الگ مکان میں بٹھا دیا اور جب بازار سے غلامت کی قیمت آئی تب اُن کو انعام دے کر رخصت کیا۔

وہ اپنے اُن دوستوں کے ساتھ جو گردش روزگار سے بگڑ گئے تھے نہایت شرفیاءہ طور سے سلوک کرتے تھے۔ دلی کے عمائد میں سے ایک صاحب - جو مرزا کے دلی دوست تھے، اور خدر کے بعد اُنکی حالت سقیم ہو گئی تھی - ایک روز ہسپتال کا فرغل پہنچے ہوئے مرزا سے ملنے کو آئے۔ مرزا نے کبھی اُنکو مالیدہ یا جامہ وار وغیرہ کے پنوں کے سوا ایسا حقیر کپڑا پہنے نہیں دیکھا تھا۔ ہسپتال کا فرغل اُن کے بدن پر دیکھ کر دل بھر آیا۔ اُن سے پوچھا کہ یہ ہسپتال آپ نے کہاں سے لی؟ مجھے اسکی وضع بہت ہی بھلی معلوم ہوتی ہے، آپ مجھے بھی فرغل کے لئے یہ ہسپتال منگوادیں۔ اُنہوں نے کہا یہ فرغل آج ہی بن کر آیا ہے، اور میں نے اسی وقت اسکو پہنا ہے؛ اگر آپ کو پسند ہے تو یہی حاضر ہے۔ مرزا نے کہا جی تو یہی چاہتا ہے کہ اپنی قیمت آپ سے چھین کر بہن لوں مگر جاڑا شدت سے پڑ رہا ہے آپ یہاں سے مکان تک کیا بہن کر جائینگے؟ پھر ادھر ادھر دیکھ کر کھوٹی پر سے اپنا مالیدہ کا نیا چٹخہ اتار کر انھیں پہنا دیا اور اس خوبصورتی کے ساتھ وہ پیچھے اُنکی نذر کیا۔

وہ ایک خط میں لکھتے ہیں دو قلندر سی وازادگی واثار و کرم کے جو دوائے میرے خالق نے مجھ میں بھرو دیے ہیں بقدر ہزار یک فلور میں نہ آئے۔ نہ وہ طاقت جہانی کہ ایک لاکھی ہاتھیں لوں

آزادگان بخشد تبرک • بیع و شرائیت • چون و چرا نیست • ہرچہ فرستادہ ام از مغان ست • و ہرچہ
خواہم فرستاد از مغان خواهد بود“

امروت اور لحاظ مرزا کی طبیعت میں بدرجہ غایت تھا • باوجودیکہ اخیر عمر میں وہ اشعار کی اصلاح دینے
سے بہت گہرا نئے لگے تھے ؛ با اینہم کبھی کسی کا قصیدہ یا غزل بغیر اصلاح کے واپس نہ کرتے تھے •

ایک صاحب کو لکھتے ہیں ”جہاں تک ہو سکا احباب کی خدمت بجالایا • اوراق اشعار لیٹے لیٹے دیکھتا تھا“
اور اصلاح دیتا تھا • اب نہ انکھ سے اچھی طرح سوچھے ، نہ ہاتھ سے اچھی طرح لکھا جائے • کہتے ہیں کہ شاہ شرف

بوعلی قلندر کو بنیب کبریا کے خدا نے فرض اور پیر نے سنت معاف کر دی تھی • میں متوقع ہوں کہ میرے
دوست بھی خدمت اصلاح اشعار مجھے معاف کریں • خطوط شوقیہ کا جواب جس صورت سے ہو سکے گا لکھ کر دوں گا“

باوجود اسکے بھی لوگ مرزا کو براہ راستا رہتے تھے • ایک دفعہ کہیں مرزا غفٹہ نے یہ لکھ دیا تھا کہ آپ نے
بسبب ذوق سخن کے اصلاح اشعار منظور فرمائی تھی • اُسکے جواب میں لکھتے ہیں ”لا حول ولا قوۃ ! کس

ملعون نے بسبب ذوق شعر کے اشعار کی اصلاح منظور رکھی ؟ اگر میں شعر سے بیزار نہ ہوں تو میرا حسد
مجھے بیزار • میں نے تو بطریق قدر و بیش بجا درویش لکھا تھا ؛ جیسے اچھی جو روپے خاوند کے

ساتھ مرزا بھڑنا اختیار کرتی ہے میرا تمہارے ساتھ وہ معاملہ ہے“

اگرچہ مرزا کی آمدنی قلیل تھی مگر حوصلہ فراخ تھا • سائل اُنکے دروازے سے خالی ہاتھ بہت کم جاتا تھا •
اُنکے مکان کے آگے اندر سے لنگڑے لڑے اور اپنا بیچ مردود عورت ہر وقت پڑے رہتے تھے • غدر کے بعد

آئمی آمدنی کچھ اور پڑیٹھ سو روپیہ ماہوار کی ہو گئی تھی ؛ اور کھانے پینے کا خرچ بھی کچھ لمبا چڑا نہ تھا ؛
مگر وہ غریبوں اور محتاجوں کی مدد اپنی بساط سے زیادہ کرتے تھے ؛ اس لئے اکثر تنگ رہتے تھے •

وہ یہ بھی کہتے تھے کہ ایک دفعہ مرزا دیر مرحوم نے اسی شعر پر ہرے لگائے تھے مگر انکو خود پسند آئے اور کیا
لوگوں میں رتبہ کا یہ شعر بے ویسے ہرے نہیں لگ سکتے۔

مرزا کے اخلاق و عادات و نیالائے

مرزا کے اخلاق نہایت وسیع تھے۔ وہ ہر ایک شخص سے برائے سے ملنے باتا تھا بہت کساد و پشانی
سے ملتے تھے۔ چونکہ ایک دفعہ ان سے بل آتا تھا اسکو ہمیشہ ان سے ملنے کا اشتیاق رہتا تھا۔ وہ چونکہ
دیکھ کر وہ بڑا باغ ہو جاتے تھے۔ اور ان کی خوشی سے خوش اور ان کے غم سے غمگین ہوتے تھے۔ اپنے
ان کے دوست ہرقت اور ہر مذہب کے نہ صرف دہلی میں بلکہ تمام ہندوستان میں بے شمار تھے۔ جو غلط
انہوں نے اپنے دوستوں کو لکھے ہیں ان کے ایک ایک حرف سے ہر محبت و غمخواری و گناہت پکلی پڑتی
ہے۔ ہر ایک خط کا جواب لکھتا وہ اپنے ذمے فریضہ عین سمجھتے تھے۔ ان کا بہت سادقت دوستوں کے
خطوں کے جواب لکھنے میں صرف ہوتا تھا۔ بیماری اور کلینت کی حالت میں بھی وہ خطوں کے جواب لکھنے
سے باز نہ آتے تھے وہ دوستوں کی فرمائشوں سے کبھی تنگدل نہ ہوتے تھے۔ غزلوں کی اصلاح کے سوا
اور طرح طرح کی فرمائشیں انکے بعض خالص و فاض دوست کرتے تھے اور وہ انکی تعمیل کرتے تھے۔ لوگ انکو اکثر
بزرگ خطا سمجھتے تھے مگر ان کو کبھی ناگوار نہ گذرتا تھا۔ اگر کوئی شخص لفافے میں ٹکٹ رکھ کر بھیجتا تھا تو
شکایت کرتے تھے۔ انہوں نے میسور کے ایک شہزادے کو اپنی کوئی کتاب بھیجی ہے اسنے کتاب کی رسید
لکھی ہے، اور قیمت دریافت کی ہے۔ اسکے جواب میں لکھتے ہیں ”حرف پرش مقدارت قیمت چرا بر زبان
رفت؟ ہنجا رہو از ش نیاز منداں بے نوا نہ نیست۔ بے سرمایہ ام نہ فردایہ۔ سخنورم نہ سوداگر۔ موئیدہ پویشم
نہ کتاب فروش۔ پذیرندہ عطایم نہ گیرندہ ہما۔ ہرچہ آزادگاں بشہزادگاں فرستند ندرست؛ و ہرچہ شاہزادگاں

زیادہ دلکش اور موثر تھا۔ میں نے غدر سے چھ سال پہلے۔ جب کہ دیوان عام میں مشاعرہ ہوتا تھا۔ نہایت ایک دفعہ مرزا صاحب کو مشاعرے میں پڑھتے سنا ہے۔ چونکہ اُنکے پڑھنے کی باری سب کے بعد آتی تھی اس لئے صبح ہو گئی تھی۔ مرزا نے کہا صاحبو! میں بھی اپنی بھیر دیں لاپتا ہوں؛ یہ کلمہ اول اُردو طرح کی غزل اور اُسکے بعد فارسی کی غیر طرح نہایت پردرد آواز سے پڑھی۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا مجلس میں کسی کو اپنا قدردان نہیں پاتے؛ اور اس لئے غزل خوانی میں فریاد کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔

جس زمانے میں میر نظام الدین منوں شاہ صاحب کے پرانے مدرسے میں مشاعرہ کرتے تھے ایک شاعرے میں مرزا نے اپنا فارسی قصیدہ دریا گریستن اور تنہا گریستن جو جناب سید الشہدائی منقبت میں اُنھوں نے لکھا تھا پڑھا۔ سنا ہے کہ مجلس مشاعرہ بزمِ غرابن گئی تھی۔ جب تک قصیدہ پڑھا گیا لوگ برابر روتے رہے۔ مفتی صدر الدین خاں مرحوم بھی موجود تھے اتفاق سے اُسی حالت میں مینہ بھی برسنے لگا مفتی صاحب نے کہا دو آسماں ہم گریستن

اسی قصیدے کی نسبت سید اکبر مرزا خلیفۃ الصدق ناظر سید حسین مرزا مرحوم بیان کرتے ہیں کہ بندر گاہ بصرہ میں ایک جگہ مجلسِ عزائم تھی، اور بارش ہو رہی تھی۔ بانی مجلس نے مجھے کہا کہ تم بھی کچھ پڑھو۔ میرے پاس اس وقت پڑھنے کی کوئی چیز مرثیہ یا کتابہ تھی۔ اسی قصیدے کے چند اشعار زبانی یاد تھے؛ میں نے وہی پڑھ دیے۔ پانچ ہی سات شعروں پر مجلس میں خوب رقت ہوئی۔ عرب، عجم، اور ہندی سب اس مجلس میں شریک تھے۔ مجلس کے بعد ہر ایک عجمی مجھے پوچھتا تھا کہ یہ اشعار کس شخص کے تھے؟ خصوصاً اس شعر کی بہت تعریف کرتے رہے۔

مزد شفاعت وصلہ صبر و خو نہا ہیچ از کسے نخواستہ الا اگر لیستن

قول کا انداز و صرف استقامت طبع سے ہو سکتا ہے۔ اور مجروں میں کلام موزوں نہیں کر سکتے۔ چنانچہ مولانا
 روم فرماتے ہیں: "من موانع فاعلایقن فاعلامات" شعر می گویم براقت و نبات: مرزا کا ایسا حال تھا
 چنانچہ فارسی اور اردو میں متعدد ناولیں اور نیز ایک آدھ فارسی قصیدہ ایسی طبعی مجریں میں انھوں نے
 لکھا ہے کہ اکثر موزوں طبع بغیر واقفیت عروض کے اُن مجروں میں نہیں چل سکتے۔ علم نجوم سے کسی قدر، اور
 اسکی اصطلاحات سے پوری واقفیت اُن کو تھی۔ چنانچہ انکی نظم فارسی میں بابا اس کا کافی ثبوت ملتا
 ہے۔ موت و نبوت سے جبکی نسبت کما گیا ہے کہ: "برائے شعر نقش خوبست"، اُن کو خاص مناسبت تھی
 اور تقابح و معارف کی کتابیں اور رسالے کثرت سے انکے مطالعے سے گذرے تھے۔ اور بیچ پوچھیے تو
 انھیں متعوضانہ خیالات تھے مرزا کو نہ صرف اپنے معرووں میں بلکہ بارہویں اور تیرہویں صدی کے تمام
 شعرا میں ممتاز بنا دیا تھا۔ فنِ تاریخ اور سیاق و ساحت وغیرہ سے اُن کو مطلق لگاؤ نہ تھا۔ جس زمانے
 میں کہ وہ خانانِ تیموریہ کی تاریخ یعنی مہرِ موز لکھ رہے ہیں کسی نے اُن کو مورخ سمجھ کر کچھ سوالات کئے ہیں۔ اسکے
 جواب میں لکھتے ہیں: "میں فنِ تاریخ و ساحت و سیاق سے آنا بیگانہ ہوں کہ اس فنون کو سمجھ بھی نہیں سکتا۔
 مگر پردازانِ دفتر شاہی غلامانہ اعمال اور دو کتب اردو میں لکھ کر میرے پاس بھیجتے ہیں، میں اسکو فارسی کر کر حوالے کرتا
 ہوں۔ میرے ہاں ایک کتاب بھی نہیں، میں اسی قدر ہوں کہ نظم و شعر بقدر اپنی استعداد کے لکھ سکتا ہوں، مورخ نہیں ہوں۔"

"ماقتلہ سکندر و درار خواندہ الیم از ما بجز حکایت مہر و وفا سپہر"

مرزا کا شطرنج شفیقا آمیز نہایت شیریں اور دلادیز تھا جیسا کہ اکثر اہل ایران کا ہوتا ہے اور
 باوجود خوشحالی کے نہایت زود نویس اور تیز دست تھے۔ شعر پڑھنے کا انداز بھی خاص کر مشاعروں میں حد سے

۴۰ لطیفہ: شمس العلماء مولوی دکن را شد سے کسی نے پوچھا کہ مرزا صاحب کو ریاضی میں بھی کچھ دھن تھا یا نہیں؟ انھوں نے کہا
 "ایسا ہی دھن تھا جیسا مجھے شاعری میں ہے"

چو شکوہ جز بقا ضاع دوستی نبود
 ز غیہ شکر و شکایت ز دوستدار کنم
 سرت پاک و دل صاف دادہ اند مرا
 بحر تلخ دے خالی از غبار کنم
 خوش آن کہ ساز کنم از تو شکوہ و حیا
 تو اعتذار کنی و من افتخار کنم
 خوش آن کہ عذر تو چوں در کند مرا ز پی
 دگر بہ پیش تو تمہید اعتذار کنم
 براں سرم کہ اگر مرگ اماں بہ زریں سپا
 ز کار ہائے جہاں خاصہ این سر کار کنم
 ز کردہ تو بہ نمایم ز گفتہ استغفار
 دگر سپاس تو نہیان و آشکار کنم

جب یہ قطعہ مرزا صاحب کے پاس پہنچا اُس پر لکھا کہ ”بس اب بیت بحیثی موقوف“ میرے پاس بھیج دیا اسکے بعد پھر اور کچھ نہیں لکھا گیا۔

امرزائے عربی میں صرف و نحو کے سوا اور کچھ اُستاد سے نہیں پڑھا تھا؛ مگر چونکہ علم لسان سے اُن کو
 فطری مناسبت تھی۔ انکی نظم و نثر اردو و فارسی کے دیکھنے سے کہیں اس بات کا خطرہ تک دل میں
 نہیں گذرنا کہ شیخ عربیت اور فنِ ادب سے ناواقف ہوگا۔ عربی الفاظ کو انھوں نے ہر جگہ اُسی
 سلیقے سے استعمال کیا ہے جس طرح ایک اچھے فاضل اور ادیب کو استعمال کرنا چاہیے۔ شاعری جسکا
 لکھ اُن کی فطرت میں ودیعت کیا گیا تھا۔ اُس سے قطع نظر کر کے فارسی زبان اور فارسی الفاظ و
 محاورات کی تحقیق اور اہل زبان کے اسالیب بیان پر مرزا کو اس قدر عبور تھا کہ خود اہل زبان میں بھی
 مستثنیٰ آدمیوں کو ایران کے مستند شعرا کی زبان پر اس قدر عبور ہوگا۔ اسکے سوا فنِ عروض میں
 بھی اُن کو کافی دستگاہ معلوم ہوتی ہے۔ اکثر بڑے بڑے نامور شعرا کو دیکھا اور سنا گیا ہے کہ باوجود کمال
 شاعری کے اس فن سے محض نا آشنا ہوتے ہیں، اور سیدھی سیدھی بحر وں کے سوا۔ خجکے وزن اور

امری

فارسی

۹۶

جس زمانے میں یہ واقعہ پیش آیا اُس زمانے میں مجھ کو نواب محمد مصطفیٰ خاں مرحوم مخلص شیعہ
 وحسرتی رئیس جہانگیر آباد کے ہاں تعلق تھا، اور اُن دنوں میں وہ دلی آئے ہوئے تھے، اور میں
 انھیں کے مکان پر مقیم تھا۔ جب یہ قطعہ مرزا صاحب کی نظر سے گذرا تو انھوں نے چار بیت کا ایک
 نہایت لطیف قطعہ نواب مرحوم کے پاس لکھ کر بھیجا جو ذیل میں درج ہے۔

قطعہ

تو اے کہ شیعہ وحسرتی لقب داری	ہمیں بلطفت تو خود را اسیر دار کنم
چو حالی از من آشفته بے سبب بخید	تو گر شفیع نگر دی بگو چہ کار کنم
دوبارہ عسمر دہندم اگر بغرض محال	براں سرم کہ در اں عمر ایں کو کار کنم
یکے او اے عبادت عسمر شیعینہ	وگر یہ پیشگرہ حالی اعتذار کنم

اگرچہ مجھ کو شرم آتی ہے کہ مرزا کے عالی رتبہ کلام کے ساتھ اپنا کم وزن دیے وقعت کلام ناظرین
 کے سامنے بار بار پیش کروں؛ مگر مقام اور موقع اس بات کا مقتضی ہے کہ جس واقعہ کا ذکر چھڑ گیا ہے
 اُسکو انجام تک پہنچایا جائے۔ مرزا صاحب کے اس قطعہ پر میں نے ایک اور قطعہ لکھ کر اُن کی خدمت
 میں بھیجا جو ذیل میں لکھا جاتا ہے۔

قطعہ

تو اے کہ عذر فرستادہ بسوے رہی	منزد کہ جان گرامی براں شمار کنم
تسکایتے کہ تو اں گفت غینِ خلاصش	گرم تو دوست شماری ہزار بار کنم
نماند قاعدہ شکر بے ریا بجاں	اساس دوستی از شکوہ استوار کنم

رسیدن نشه عفاں چو ذکر مئے راندی
 دود پر ریشہ بد لما جو حرف مهرزدی
 گهر به بزم نشاندی اگر نشا خواندی
 هزار عتده سر بسته باز بکشدی
 ز ستر تفرقه و جمع قصه باراندی
 بر آید از دل بیگماں ترانه ذوق
 لطیفه ها که به لفظ و بیان نمی گنجید
 بحق لطف کلامت که هست بر دل ما
 تو اس که هر سخن نغمه تو بدل جا کرد
 هر آنچه گفتند اندر جواب برض نیاز
 دلی بعبیده از حرف چند با خوشیم
 عجب که قاعده دان نیاز مندی
 عجب که چاشنی اندوز خاکساری را
 عجب که منفعلی راز نقد ناسره اش
 نه راه حرف بسویت نه جاب من بدت
 اگر نه روی سخن با تو بود می گفتم
 ولیک شتر ذاد بیت بر تو خرده گرفت

شگفت خاطر یاریاں گرا ز صبا گفتی
 و میدبخش تماشا چو از دلف گفتی
 اثر ز لفظ و ماندی اگر عبا گفتی
 هزار نکتہ پوشیده بر ملا گفتی
 ز سیر انفس و آفاق رازها گفتی
 چه محفل که سخن با می آشنا گفتی
 تو چوں فرشته ز غیب آمدی دوا گفتی
 که پای سخن افراشتند تا گفتی
 جز آن که در حق حالی بر فردا گفتی
 خطا بود که گلبیدم اگر خطا گفتی
 که گز گفتم ام آخر تو از کج گفتی
 سفید و معجب و خود بین و خود با گفتی
 رهین ذوق نوا سنجی آنا گفتی
 به زرق در گرد و عرض کیا گفتی
 جواب چیت اگر پرسم از کجا گفتی
 چگونه گفتی ؟ و چوں گفتی ؟ و چرا گفتی
 هر آنچه در حق من گفتم بجا گفتی

دوسرا ہی گناہ خطا ہے جیسے پہلے آپکے ہیں۔ لفافہ مجھ کو دیا کہ اس کو کھول کر پڑھو۔ میں جو دیکھتا ہوں تو حقیقت سارا خط غش و دُشام سے بھرا ہوا تھا۔ پوچھا کس کا خطا ہے؟ اور کیا لکھا ہے؟ مجھے اُسکے انہار میں تامل ہوا۔ فوراً میرے ہاتھ سے لفافہ چھپیں کہ فرمایا کہ شاید آپ کے کسی شاگردِ ممنوی کا لکھا ہوا ہے۔ پھر اول سے آخر تک خود پڑھا۔ اُس میں ایک جگہ ماں کی گالی بھی لکھی تھی۔ مسکرا کر کہنے لگے کہ ”اس اُلو کو گالی دینی بھی نہیں آتی۔ پڑھے یا ادھیڑ آدمی کو ٹیٹی کی گالی دیتے ہیں؛ تاکہ اُس کو غیرت آئے۔ جو ان کو جو رو کی گالی دیتے ہیں؛ کیونکہ اُس کو جو رو سے زیادہ تعلق ہوتا ہے۔ بچے کو ماں کی گالی دیتے ہیں؛ کہ وہ ماں کے برابر کسی سے مانوس نہیں ہوتا۔ یہ قُرم ساق جو بٹبر برس کے بڑھے کو ماں کی گالی دیتا ہے اس سے زیادہ کون بے وقوف ہوگا؟

اُسکے بعد میں اُن سے رخصت ہو کر چلا آیا۔ دوسرے روز حضرت نے ایک غزل لکھ کر میرے پاس بھیجی۔ جس میں اگرچہ میرے نام اور تخلص کی تصریح نہ تھی لیکن اُسکے بعض مضامین اور اشارات سے معلوم ہوا کہ آپس جو طعن و تعریف ہے وہ میرے ہی نسبت ہے۔ غزل یہ ہے

پہ مقصدے کہ مراں را رہِ حند اگویند	برو برو کہ ازاں سو بیا بیا گویند
کسیکے پاسے ندارد چہ گو نہ راہ رود	خود اہلِ شرع دریں دُوری چہ اگویند
زمرِ نخلِ نانا اللہ گوے۔ نا آگاہ	حدیثِ جہلویہ کہ موسیٰ و عصا گویند
مگر ز حق نبود شرم حق پرستاں را	کہ نامِ حق نہ بند و ہمیں انا گویند
ز قولِ شاں نبود دل نشینِ اہلِ نظر	جزاں صفات کہ از ذاتِ کبریا گویند
نخو اندہ در کتب و ناشنیدہ از فقہا	بغیر بے فزہ و اگویہ ہا کہ و اگویند

طرح انکسیت کرنی شروع کی۔ چونکہ ان کا تعلق بہت اہمیت کے درجے کو پہنچ گیا تھا، اور ان سے بات چیت
 صرف تحریر سے ذریعہ سے کی جاتی تھی۔ نماز پچانہ کی فرمائیت اور تاکہ پر ایک لیا چوڑا لکچر لکھ کر ان کے سامنے
 پیش کیا۔ جس سے ان سے اس بات کی درخواست تھی کہ آپ کھڑے ہو کر۔ یا بیٹھا۔ یا ایسا اشارے سے،
 غرض جس صورت بہت کے نماز پچانہ کی پابندی اختیار کریں۔ اگر وضو نہ ہو سکے تو تیمم ہی سہی، مگر نماز نہ کرنا۔
 مرزا کو یہ فریک سخت ناگوار لگتی تھی، اور ناگوار لگنے کی بات ہی تھی، خصوصاً اس وجہ سے کہ انہیں
 دلوں میں بول گناہم خلوں میں سکے، اعمال و انحال پر بہت نازیبا طریقے سے نفرین و ملامت کر رہے تھے،
 اور بازار یوں کی طرح گھل گھلایا دیاں لگتے تھے۔ مرزا صاحب نے میری لخبہ تحریر کو دیکھ کر خوب فرمایا، سننے
 کے لائق ہے۔ انہوں نے کہا، "ساری غرضت و فوج میں اندری، نہ کبھی نماز پڑھی، نہ روزہ رکھا، نہ
 کوئی نیک کام کیا۔ زندگی کے چند نفاس باقی رہ گئے ہیں، اب اگر چند روز بیٹھا، یا ایسا اشارے سے
 نماز پڑھی، تو اس سے ساری غرضتیں اٹھ جائیں گی، باقی کیز کر رہ سکے گی، میں تو اس قابل ہوں کہ جبے دل
 میرے عزیز اور دوست میرا منہ کالا کریں، اور میرے پاؤں میں تہی بازو حشر کے تمام گلی کوچوں اور
 بازاروں میں تشہیر کریں، اور پھر شہر سے باہر بجا کر کشتوں، اور چالیوں، اور کوٹوں کے کھانے کو (اگر وہ
 ایسی چیز کھانا کوار کریں) چھوڑ آئیں، اگرچہ میرے گناہ ایسے ہی ہیں کہ میرے ساتھ اس سے بھی بدتر
 سزاؤں کیا جاسکتی ہیں، لیکن اس میں شک نہیں کہ میں موعود ہوں، ہمیشہ تنہائی اور سکوت کے عالم میں یہ
 کلمات میری زبان پر جاری رہتے ہیں، "لا الہ الا اللہ، لا موجود الا اللہ، لا موشرفی الوجود الا اللہ"
 شاید اسی روز جب یہ گفتگو ہو چکی تھی اور مرزا صاحب کھانا کھا رہے تھے، چٹھی رساں نے
 ایک نفاذہ کر دیا۔ نفاذہ کی بے ریلی اور کاتب کے نام کی اجنبیت سے انکو یقین ہو گیا کہ یہ غلطی کا

جب یہ مقدمہ داخل دُقر ہو گیا ایک مدت کے بعد لوگوں نے مرزا کے نام گننام خط تصنیف سب دستم بھیجنے شروع کئے۔ جن میں شراب نوشی اور بد مذہبی وغیرہ پر سخت نفیس اور طعن و ملامت لکھی ہوتی تھی۔ اُن دنوں میں مرزا کی عجب حالت تھی؛ نہایت مکدر اور بے لطف رہتے تھے۔ اور جب چٹھی رساں ڈاک لیکر آتا تھا تو۔ اس خیال سے کہ مبادا کوئی ایسی قسم کا خط نہ آیا ہو۔ اُن کا چہرہ متغیر ہو جاتا تھا۔ اتفاق سے اُنہیں دنوں میں نور محمد مصطفیٰ خاں مرحوم کے ہمراہ میرا دلی میں آنا ہوا۔ چونکہ مجھ کو ان نالائق گننام خطوں کے سننے کا حال معلوم نہ تھا؛ ایک روز مجھے ایک ایسی غلطی ہو گئی جس کے تصور سے مجھ کو ہمیشہ نہایت شرمندگی ہوتی ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ مذہبی پسند کے نشے میں سرشار تھے۔ خدا کی تمام مخلوق میں سے صرف مسلمانوں کو، اور مسلمانوں کے بھرتزقو میں سے اہل سنت کو، اور اہل سنت میں سے صرف خفیہ کو، اور اُن میں سے بھی صرف اُن لوگوں کو جو صوم و صلوة اور دیگر احکام ظاہری کے نہایت تقید کے ساتھ پابند ہیں؛ نجات اور مغفرت کے لائق جانتے تھے۔ گویا دائرہ رحمت الہی کو کوئن و کٹوریا کی وسعت سلطنت سے بھی۔ جس میں ہندو، اور ملت کے آدمی بہ امن و امان زندگی بسر کرتے ہیں۔ زیادہ تنگ اور محدود خیال کرتے تھے۔ جس قدر کسی کے ساتھ محبت یا لگاؤ زیادہ ہوتا تھا اُسی قدر اس بات کی تمنا ہوتی تھی کہ اسکا خاتمہ ایسی حالت پر ہو جو ہمارے زعم میں نجات اور مغفرت کے لئے ناگزیر ہے۔ چونکہ مرزا کی ذات کے ساتھ محبت اور لگاؤ بدرجہ غایت تھا اس لئے ہمیشہ اُنکی حالت پر افسوس ہوتا تھا۔ گویا یہ سمجھتے تھے کہ روضہ رضواں میں ہمارا اُن کا ساتھ چھوٹ جائیگا؛ اور مرنے کے بعد پھر اُن سے ملاقات نہو سکیگی۔ ایک روز مرزا کی بزرگی اُستادی، اور کبر سنی کے ادب اور تعظیم کو بالاسے طاق رکھ کر خشک مغز و اعظوں کی

تمام فرہنگ نگاروں نے فراز کو اہل شہر کیا ہے۔ اسکی بابت مرزا لکھتے ہیں کہ ”اسکو اہل شہر قرار دینا دیا ہی اجلع ہے جیسا کہ اہل شہر نے خلافت یزید پر اجلع کیا تھا“

صاحب برہان کی چند غامضانہ غلطیاں اور اسکے بیان کی بے ربطیاں ظاہر کرنے کے بعد ایک جگہ لکھتے ہیں ”و خدا پرستوں! از بہر خدا اس عربی مقہم فارسی مدال (یعنی جامع برہان) نمی پرسم کہ کیست؟“ می پرسم کہ چیست؟ ایک اور جگہ نہایت طیش میں آکر لکھتے ہیں ”چوں شناسائی حقیقت جو ہر لفظ نثار و فرہنگ چرامی نگار د؟ بوریا می یافت، رسن می یافت، ہیزم می فروخت، گلخن می ازخوت“ مرزا نے ایک فارسی رسالے کے مولف پر جو قاطع برہان کے جواب میں لکھا گیا تھا، اور فحش و دشنام سے بھرا ہوا تھا۔ ازالہ حیثیت عربی کی نالاش بھی کی تھی؛ مگر حب کامیابی کی امید نہ رہی تو آخر کار انھوں نے راضی نامہ داخل کر دیا۔ اتنا سے تحقیقات میں دلی کے بعض اہل علم عدالت میں اس بات کے استفسار کے لئے بلائے گئے تھے کہ جو فقرے مدعی نے اپنے دعوے کے ثبوت میں پیش کئے ہیں کیا فی الواقع اُن سے فحش و دشنام مفہوم ہوتا ہے یا نہیں؟ انھوں نے غریب ملزم کو مرزا سے بچانے کے لئے اُن فقروں کے ایسے معنی بیان کئے جن سے ملزم پر کوئی الزام عائد نہ ہو۔ ان مولویوں کا مرزا سے ملنا جلنا تھا۔ کسی نے پوچھا حضرت! انھوں نے آپ کے برخلاف شہادت کیوں دی؟ مرزا نے اپنا فارسی کا یہ شعر پڑھا

بہرچہ درنگری جز بجنس مائل نیست عیار بے کسی من شرافتِ نسیست

۴۴ یعنی میری بیکی کی وجہ شرافتِ نسی ہے کیونکہ ہر شخص اپنی جنس کی طرف مائل ہوتا ہے چونکہ شرافتِ نسی میں کوئی میسر نہیں ہے اس لئے کوئی میرا ساتھ نہیں دیتا ۱۲

گرچہیں باہنہ بیاں دار و تو لا در سخن
 من ہم از ہندم چرا از من تیرا کردہ است
 مطلب از بد گفتن من چیست ؟ گویا نیک مرد
 مزدایں کار از حق - آمرزش تما کردہ است
 صاحب علم و ادب ! دانکہ ز افراط غضب
 چون سیماں و فترت فرین و دم واکردہ است
 در جہل و شام کار سو قیاں باشد - بے !
 تنگ دارد علم از کارے کہ آغا کردہ است
 انتقام جامع بر ہاں قاطع می کشد
 اں چہا کہ دیم باوے خواجہ بابا کردہ است
 من سپاہی زادہ ام گفتار من باید درشت
 دایے بروے کہ تقلید من اینا کردہ است
 زشت گفتم - لیک داد بد کہ سنجی دادہ ام
 نہشت گفتم - لیک داد بد کہ سنجی دادہ ام
 میکند تائید بر ہاں لیک بر ہاں ناپدید
 سستے طرز خرام حسانہ بر ہاں نگار
 بہر من توہین و بہر خویش تحسین جا بجا
 یا فتم از دیدن تاریختائے اں کتاب
 سستے طرز خرام حسانہ بر ہاں نگار
 بہر من توہین و بہر خویش تحسین جا بجا
 یا فتم از دیدن تاریختائے اں کتاب
 غازیان ہمراہ خویش آورد از بہر جہاد
 تانہ پنداری کہ ایں پیکار تمنا کردہ است

قاطع بر ہاں اور اُسکے متعلق مرزا کی جس قدر تحریریں ہیں اُن میں اعتراضوں اور جوابوں کے علاوہ بہت سے بیش بہا فائدے اور لطیف و دلچسپ حکایتیں اور لطائف و تراکیب بھی درج ہیں ۔
 لفظ مرزا کو صاحب برہان اضداد میں سے گنتا ہے اور فرنا کر دن کے معنی بند کرنا اور کھولنا دونوں تباہ ہے ۔ مگر مرزا اسکو اضداد میں نہیں گنتے ؛ بلکہ اُسکے معنی صرف بند کرنے کے بتاتے ہیں ؛ اور جو اشعار مخالفوں نے سندیں پیش کئے ہیں مرزا نے انھیں اشعار سے اپنے دعوے کی تائید کی ہے ۔ مگر چونکہ ہندوستان کے

اور ان جوابوں میں زیادہ تر طرافت اور شوخی طبع سے کام لیا ہے۔ کیس اُنکے طرز بیان کا خاکہ اُڑایا ہے کیس اُن کی تحقیقات کا مضحکہ کیا ہے۔

مربوی امین الدین کی کتاب دو قاطع قاطع، کا جواب مرزا نے کچھ نہیں دیا؛ کیونکہ اسمیں فحش اور ناشائستہ الفاظ کثرت سے تھے۔ کسی نے کہا حضرت! آپ نے اُسکا کچھ جواب نہیں لکھا۔ مرزا نے کہا وہ اگر کوئی گدھا تھا رکے لات مارے تو کیا تم بھی اُسکے لات مارو گے؟

ایک شخص مرزا احمد علی بیگ متوطن کلکتہ ہیں؛ جنہوں نے مرزا کے خلاف ایک مہسوط کتاب مؤید البرہان لکھی ہے؛ جسکے لکھتے وقت تمام ایشیا تک سوسائٹی کا کتب خانہ قاطع برہان کے چند اوراق کی تردید کے لئے چھان مارا ہے۔ اور مثل اور جیوں کے مرزا کے کسی اعتراض کو تسلیم نہیں کیا۔ اور جو سبک الفاظ مرزا نے صاحب برہان کی نسبت استعمال کئے تھے ویسے ہی الفاظ مرزا کی نسبت استعمال کئے ہیں۔ اپنے تئیں اصفہانی الاصل قرار دیا ہے اور ٹیک چند بہار اور قتل کی بہت تعریف کی ہے اور اپنی کتاب کی تعریف میں تقریظیں اور تائیدیں لکھوا کر کتاب کے آخر میں چھپوائی ہیں اُسکے جواب میں مرزا نے ایک رسالہ موسوم بہ تیغ تیز لکھا ہے؛ اور ایک فارسی قطعہ بھی اُن کو لکھ کر بھیجا ہے۔ جسکے چند اشعار یہاں نقل کئے جاتے ہیں، جو لطف سے خالی نہیں۔

خواجہ رازا اصفہانی بودن آبا چہ سود	خالقش در کشورِ بنگا لہ پیدا کردہ است
باقیتیل و جامعِ برہان و لالہ ٹیک چند	لاہور و سوگیری و لطف و مدارا کردہ است
داوری گا ہے بنا فرمود دور و دے ہر سہ را	منصف و صدرا مین و صدرا علی کردہ است

محققوں نے اسکی نسبت ظاہر کی ہے ، اور جو غلطیاں اور بے ربطیاں مرزا نے برہان میں بتائی ہیں اور انکے سوا اور بے شمار غلطیاں صاحب فرہنگ ناصری نے اس میں نشان دی ہیں ۔ اس سے زیادہ ایک ہندوستانی محقق کی سلامتی طبع کا اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے ؟

مرزا نے قاطع برہاں کے اخیر میں چند فوائد لکھے ہیں ؛ انہیں سے فائدہ اول کا حاصل یہ ہے کہ ”ان فوائد کے پیش کرنے میں چونکہ خود نمائی کی ہوتی ہے (اس لئے شاید لوگ یہ کہیں کہ خود ہندوستانی ہو کر اور ہندوستانیوں کو مسلم نہ جاننا اور خود زباندانی کا دعوے کرنا بے معنی ہے ۔ سو میں اقرار کرتا ہوں کہ میرا داد اتوراں سے آیا تھا“ اور میرا پاپ ولی میں پیدا ہوا ، اور میں اگرے میں ۔ حاشا کہ میں اپنے تئیں اہل زبان سمجھتا ہوں میں بلاشبہ زباندان ہوں اور میری زباندانی اولاً خدا داد سلامتی طبع کی بدولت ہے ؛ جو غلطی کو قبول نہیں کرتی اور بغیر سچائی کے تسلی نہیں پاتی ۔ دوسرے اس وجہ سے ہے کہ میری طبیعت فارسی زبان سے فطرۃً مناسب واقع ہوتی ہے ۔ تیسرے مولانا عبد الصمد کے فیض صحبت سے جو مجھ کو دو برس تک برابر حاصل رہا ۔ چودہ برس کی عمر میں میں نے اُس سے تربیت پائی ؛ اور بارہ برس مشق سخن کی ۔ اب کہ مجھ کو چھٹا سٹھواں سال ہے ۔ میں خدا کا شکر کرتا ہوں ۔ اور خدا کے سوا کوئی نہیں جان سکتا ۔ کہ ان باتوں برسوں میں اُس نے کس قدر معنی کے دروازے مجھے کھولے ہیں ؛ اور میری فکر کو کس درجہ کی بلندی بخشی ہے ۔ افسوس کہ لوگوں نے میرے کلام کی خوبی کو نہ سمجھا ؛ اور زیادہ تر افسوس یہ کہ وہ شان ایزدی کی شناخت سے محروم رہے ؛ اور میری نظم و شعر کے کثرت کو آنکھ اٹھا کر نہ دیکھا ۔ گویا نظیری جنت آما گاہ کا مقطع میرے حسب حال ہے ۔

”تو نظیری ز فلک آمدہ بودی چو سیح باز پس رفتی و کس قدر تو شناخت دریغ“

جتنے آدمیوں نے قاطع برہاں کے جواب لکھے ہیں ان میں سے بعض کے جواب مرزا نے بھی لکھے ہیں

ازودید آید۔ اسی طرح برہان کی اکثر مثل عبارتیں نقل کر کے اُسپر ہنستا ہے اور کتاب ہے کہ در ولایت ہند
 کہ نہ ترکی دانند نہ پارسی نہ بلذتیم لغات فارسی کے تو اند۔۔ ایک جگہ صاحب برہان جامع (جو گیارہویں ہے)
 کا قول برہان قاطع کے باب میں نقل کرتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ”برہان قاطع میں لغات بغیر سند اور
 شواہد کے ذکر کئے گئے ہیں: اُنپر اعتبار نہ کرنا چاہیے۔ اُس میں کنایات کو بھی غلط فہمیت قرار دیتا ہے،
 اور سُربانی و عبرانی و ترکی و ہندوستان کے غیر متعل لغات کے بیان میں، اور ایک ایک لغت کو بار
 بار مختلف صورتوں سے ذکر کرنے میں، تطویل لاطائل کرتا ہے،“ اِسکے بعد رخصتلی۔ صاحب برہان
 جامع کی تصدیق، اور اُسکے ساتھ اتفاق رائے، کرتا ہے۔ چونکہ مرزا کی لائف میں یہ بیان بے مزہ
 معلوم ہو گا اِس لئے ہم اِس سے قطع نظر کرتے ہیں جس کو زیادہ تفصیل کے ساتھ دیکھنا ہو وہ ہنگامی
 کو خود ملاحظہ کرے۔

اگرچہ مرزا نے قاطع برہان میں بعض اعتراض غلط کئے ہیں، خصوصاً لفظ افسوس کے متعلق
 ایک بڑی فاحش غلطی کی ہے۔ کہ اُسکو لفظ عربی الاصل، ماخوذ از انصاف قرار دیا ہے۔ اور اِس غلطی کا
 انہوں نے آخر کار خود بھی اعتراف کیا ہے۔ اور عربی الفاظ کی تحقیق سے اپنی لاعلمی ظاہر کی ہے،
 اور مکن ہے کہ اِسکے سوا اور بھی کہیں کہیں اُن سے غلطی ہوئی ہو، لیکن اگر انصاف سے دیکھا جائے
 تو قاطع برہان کے دیکھنے سے مرزا کی سلامتی طبع اور ذوقِ صیح کا کافی ثبوت ملتا ہے اور۔ جیسا کہ
 وہ ایک مقام پر لکھتے ہیں کہ وہ فارسی زبان کے قواعد و ضوابط میرے ضمیر میں اِس طرح جا گزیں ہیں
 جیسے فولادیں جوہر۔ فی الواقع فارسی زبان سے اُن کو فطری مناسبت معلوم ہوتی ہے۔ جوہر
 کہ انہوں نے محض اپنے وجدانِ سلیم کی ہدایت سے برہان کی نسبت قائم کی تھی وہی رائے ایران کے

تینوں کی غلطیوں اور لغزشوں کے بیان میں منعقد کیا ہے اور اُسکے بعد ایک باب میں صرف
برہان قاطع کی غلطیاں ظاہر کی ہیں۔ مثلاً یہ کہ اندلس ایک جزیرہ ہے ایک پہاڑ کے اوپر، یا
غزناطہ ایک صوبہ ہے ہندوستان کا، یا چکاک کے تین معنی لکھے ہیں، پیشانی، قبائلیوں،
اور مہرکن (اور یہ تینوں معنی غلط لکھے ہیں) یا کروخ جو ایک قریہ ہے مضافات ہرات میں اُسکو
برہان میں لکھا ہے۔ قریہ است از قرای عالم۔ یہاں از راہ طغر صاحب فرہنگ نامری لکھتا
ہے ”فی الحقیقت تحقیقے دقیق فرمودہ است“ اسی طرح بہت سی غلطیاں صاحب برہان کی اس
باب میں ظاہر کی ہیں۔ اور اسکے سوا اپنی تمام فرہنگ میں جا بجا اُسکا تجلیہ کیا ہے۔

جو اعتراض مرزا نے برہان پر وارد کئے ہیں، انکی بھی جا بجا فرہنگ نامری سے تائید ہوتی
ہے۔ اناں جملہ لفظ آپچس، استخر و صطخر، جدر، باختر، راوش، دزاوش، کار کیا،
ویرہ، داویرہ، اور اسی طرح کے اور بہت سے الفاظ کی تحقیق فرہنگ نامری میں مرزا کے
بیان کے مطابق پائی جاتی ہے۔ اسکے سوا برہان کے بیان کو جہاں مرزا نے بے معنی اور مہمل
بتایا ہے، رضاقلی خاں بھی اُسکو مہمل بتاتا ہے۔ مثلاً لفظ انچکاک کی تفسیر میں صاحب برہان
لکھتا ہے ”ہر چند فراش خیال جارد ب سنبل بر جل خرسک ریش زند از پوست آل پاک تواند“
مرزا اسکی نسبت لکھتے ہیں ”در فقرہ اخیر مگر کلام دیوست؛ ہر گاہ خوبی تحقیق چناں حسن عبارت
چنین باشد مقصود اصلی کہ معلوم کردن مجبورات است از برہان قاطع چگونہ حاصل توں کرد،“ و خالی
از راہ طغر اسی فقرے پر یہ لکھتا ہے ”دریں مقام ایس انشاء بدیع و بیان بلینج زادہ طبع انشائی
بودہ۔ برہان ذوقِ سلیم و سلیقہ مستقیم صاحب برہان خود ہیں عبارات بس است، تا از پیش

مخالفت ہوئی؛ مگر یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ اگر مرزا صاحب برہاں کی نسبت ایسے الفاظ نہ لکھتے تو بھی مخالفت ضرور ہوتی۔ کیونکہ ہندوستان کے پرانے تعلیم یافتہ جو آج کل ایک تہایت کس پیرس حالت میں ہیں۔ اُنکے لئے کچھ جنول دگنامی سے نکلنے کا کوئی موقع اسکے سوا باقی نہیں رہا کہ کسی سربراہ اور ممتاز آدمی کی کتاب کا رد لکھیں اور لوگوں پر پٹا ہر کریں کہ ہم بھی کوئی چیز ہیں جو رسالے قاطع برہاں کے جواب میں لکھے گئے ہیں جب اُن کو سرسری نظر سے دیکھا جاتا ہے تو مرزا کے اعتراضوں کے اکثر جواب بہت صحیح معلوم ہوتے ہیں۔ ہر ایک عجیب برہان کی تائید اس طرح کرتا ہے کہ جس طرح صاحب برہان نے لغت کی تحقیق کی ہے؛ اسی طرح فرہنگ جہانگیری، یا فرہنگ رشیدی، یا سراج اللغات، یا مؤند الفضلاء، یا ہفت قلم، یا کسی اور فرہنگ میں لکھا ہے۔ اور اس سے بادی النظر میں صاف یہ معلوم ہوتا ہے کہ مرزا کا اعتراض غلط ہے۔ مگر جب یہ خیال کیا جاتا ہے کہ فارسی لغات کی اکثر فرہنگیں ہندوستان میں لکھی گئی ہیں، اور جو فرہنگ سب سے پہلے لکھی گئی تھی پچھلوں نے زیادہ تر اُسکا نتیجہ کیا ہے؛ تو کسی عجیب کے جواب کی کچھ وقعت باقی نہیں رہتی۔

ایران کے ایک مشہور مصنف رضا قلی خاں ہدایت نے مشہورہ میں یعنی مرزا کی وفات سے چار برس بعد فارسی لغت کی ایک مبسوط کتاب لکھی ہے۔ جو فرہنگ نامری کے نام سے مہموم ہے، اور مرزا کی وفات سے دس بارہ برس بعد ہندوستان میں آئی ہے۔ ظاہر ہے کہ فارسی لغت کے متعلق جو کچھ اُس نے لکھا ہے وہ بہر حال اُن فرہنگ نگاروں کی تحقیقات سے جنہوں نے ہندوستان میں میٹیکر فارسی لغت کی کتابیں لکھی ہیں۔ زیادہ مستحضر اور زیادہ اطمینان کے لائق ہوگا۔ اُس نے اپنی فرہنگ کے شروع میں ایک باب فرہنگ جہانگیری، فرہنگ رشیدی، اور برہان قاطع،

نعرشیں اور بے ربطیاں ہیں جو بغیر اسکے کہ درفش کاویانی کو اول سے آخر تک دیکھا جائے ذہن نشین نہیں ہو سکتیں۔

جس وقت مرزا نے قاطع برہاں لکھی ہے نہ اس وقت اُنکے پاس ایک قلمی برہان کے سوا کوئی فرہنگ لغات تھی، اور نہ کوئی اور ایسا سامان موجود تھا۔ جس پر تحقیق لغت کی بنیاد رکھی جاتی، پس کچھ اُنھوں نے لکھا یا محض اپنی یادداشت کے بھروسے پر اور یا ذوق و وجدان کی شہادت سے لکھا۔
 یا اینہم چند مقامات کے سوا۔ جہاں فی الواقع مرزا سے نعرش ہوئی ہے، اور بعض غلطیوں کا اُنھوں نے خود بھی اقرار کیا ہے۔ اُنکے تمام ایراد و اجبی معلوم ہوتے ہیں۔ البتہ درفش کاویانی لکھتے وقت معلوم ہوتا ہے کہ فضلاء کلکتہ کی مصححہ مطبوعہ برہان مرزا کے پیش نظر تھی۔

اس کتاب کا شائع ہونا تھا کہ ہر کس و ناکس مرزا کی مخالفت پر مکر بیتہ ہو گیا۔ ایک قاطع برہاں کے جواب میں محرق قاطع، قاطع قاطع، مؤید برہان، ساطع برہان وغیرہ چند رسالے لکھے گئے۔

مخالفت کی وجہ ظاہر ہے۔ تقلید نہ صرف امور مذہبی میں بلکہ ہر چیز، ہر کام، ہر علم، اور ہر فن میں ایسی ضروری شے ہو گئی ہے کہ تحقیق کا خیال نہ خود کسی کے دل میں خلور کر رہا ہے، اور نہ کسی دوسرے کو اس قابل سمجھا جاتا ہے کہ سلف کے خلاف کوئی بات زبان پر لائے۔ جو کتاب تنوید و تنویر سے پہلے لکھی جا چکی ہے وہ وحی منزل کی طرح واجب التسلیم سمجھی جاتی ہے۔ پس مرزا کے اعتراضات برہان قاطع پر کیسے ہی صحیح اور دجیبی ہوتے، ممکن نہ تھا کہ اُنکی سختی کے ساتھ مخالفت نہ کیا جاتی۔

بعض لوگوں کو یہ خیال ہے کہ مرزا نے جو ازراہ شوخی طبع کے صاحب برہان کا جابجا خاک اڑایا ہے اور کہیں کہیں الفاظ نامالام بھی غیظ و غضب میں اُنکے قلم سے ٹپک پڑے ہیں زیادہ تر اس وجہ سے

قاطع برہان کی مخالفت کی وجہ

نام ورفش کا ویانی رکھا۔

یہاں دوچار مثالیں اُن الفاظ کی دینی مناسب معلوم ہوتی ہیں جن پر مرزا نے صاحبِ برہان کا
تخلیہ کیا ہے۔ مثلاً صاحبِ برہان نے عنبر لڑزاں کے معنی گیسوے رسول مقبول کے لکھے ہیں؛ اور پھر
کتاہے کہ اُسکو عنبر لڑزاں بھی کہتے ہیں۔ مرزا۔ صاحبِ برہان کی غلطی کا منشا یہ بتاتے ہیں کہ اُسے
نظامی کا یہ شعر دیکھا ہے جو نعت میں ہے ”دوبے کزاں عنبر لڑزاں دہی پگر بدو عالم دہی ارزاں دہی“
پس عنبر لڑزاں میں استعارہ کو اصلی نعت قرار دیا اور دوسرے مصرع میں ارزاں کے موقع اور محل
کو بالکل نہیں سمجھا اور آنحضرت کی زلف عنبر بوجہ دونو جہان کے بدلے میں بھی ارزاں ہو اُسکا نام عنبر لڑزاں
رکھ دیا یا مثلاً برہان میں لکھا ہے ”قافلہ شد بمعنی قافلہ رفت یعنی قافلہ سالار رفت کہ گناہ از فوت شد
بمعنیر باشد“ اول تو قافلہ شد کو ایک نعت قرار دینا ہی بے معنی ہے پھر اُسکے معنی قافلہ سالار رفت کہنا
اور قافلہ سالار کے جانے سے وفات سرور کائنات مراد لینا غلط درغلط اور خطہ درخطہ ہے مرزا غلطی کا منشا
مولانا نظامی کے اس شعر کو بتاتے ہیں ”قافلہ شد واپسی ماہیں“ اے کس مایوسی ماہیں؟
یہ شعر مخزنِ اسرار کی مناجات میں واقع ہوا ہے مگر مرزا نے سو سے اسکو جامی کی طرف منسوب کیا ہے شعر کا
مطلب یہ ہے کہ ہمارے دوست اور رفیق اور ساتھی سب چل دیے اب تیرے سوا کوئی ہمارا یا رہہ دگا نہیں
ہے یا مثلاً صاحبِ برہان لکھتا ہے کہ ”شش ضرب نتیجہ خوب کنایہ از گوہر دوزر باشد و کنایہ از شک
و کنایہ از شکر و عمل و اقسام میوہ ہا ہم بہت و مختلف ضرب ہم بنظر آمد کہ شش نتیجہ خوب باشد“ مرزا نے
جو اُسکا خاکا اڑایا ہے وہ طول طویل ہے خلاصہ یہ ہے کہ اس مرکب اور بے سم جملہ کو نعت قرار دینا
صاحبِ برہان ہی کا کام ہے اور اس طرح کے صد ہا الفاظ ہیں جن پر مرزا نے کڑی
ماہی اور اور طرح حکمی

نے سونے و پیسے کا ہوا ہمیشہ کے لئے مرزا کے واسطے مقرر کر دیا۔ جو نواب کلب علی خاں مرحوم نے بھی بدستور مرزا کے اخیر دم تک جاری رکھا۔ اور غدر سے تین برس بعد جب مرزا ہر ایک الزام سے بری ثابت ہوئے سرکاری نشین بھی جاری ہو گئی۔

جب نواب یوسف علی خاں کا انتقال ہو گیا اور مرزا انوریت کے لئے رام پور گئے چند روز بعد نواب کلب علی خاں مرحوم کا نواب فطنت گورنر سے ملنے کو بریلی جانا ہوا انکی روانگی کے وقت مرزا بھی موجود تھے چلتے وقت نواب صاحب نے معمولی طور پر مرزا صاحب سے کہا ”خدا کے سپرد“ مرزا نے کہا حضرت خدا نے تو مجھے آپکے سپرد کیا ہے آپ پھر اٹنا مجھ کو خدا کے سپرد کرتے ہیں“

جب مرزا دستین کو ختم کر چکے، اور اب بھی تنہائی اور شائے کا وہی عالم رہا، اس وقت سوا اسکے اور کیا چارہ تھا کہ دوات اور قلم کو مونس اور رفیق سمجھیں، اور کچھ لکھ پڑھ کر اپنا غم غلط کریں۔ اور دل سہلائیں۔ مرزا پاس اس وقت سواے برہان قاطع اور دساتیر کے کوئی کتاب موجود نہ تھی۔ برہان کو اٹھا کر سرسری نظر سے دیکھنا شروع کیا۔ پہلی ہی نگاہ میں کچھ بے ربطیاں سی معلوم ہوئیں۔ پھر زیادہ غور سے دیکھا تو اکثر لغات کی تعریف غلط پائی۔ ایک ایک لفظ متعدد فصلوں میں مختلف صورتوں سے لکھا دیکھا۔ شعرا نے جو الفاظ بطور مجاز و کنایہ کے استعمال کئے ہیں ان کا ذکر بطور مستقل لغات کے دیکھا۔ طریقہ بیان اکثر بھونڈا اور اصول لغت نگاری کے خلاف پایا۔ بہت سے لغات کی ایسی تفسیر بھی دیکھی جسکے معنی بالکل سمجھ میں نہ آئے۔ مرزا نے یادداشت کے طور پر جو مقام قابل اعتراض نظر آئے انکو ضبط کرنا شروع کیا۔ شدہ شدہ وہ ایک کتاب بن گئی۔ جسکا نام قاطع برہان رکھا گیا، اور ۱۲۶۶ء میں چھپ کر شائع ہو گئی۔ پھر مرزا نے ۱۲۶۸ء میں باضائف دیگر مضامین و فوائد اسکو دوسری بار چھپوایا اور اسکا

ہو گئے تھے۔ شہر کے تمام مسلمان عمامہ جو مرزا کے دوست اور عزیز تھے۔ اپنی اپنی حالت میں گرفتار تھے۔ اسکے سوا گھر میں جس قدر بی بی کے پاس زیور یا کوئی اور قیمتی چیز تھی؛ جب شہر لٹنے لگا۔ تو وہ دوسری جگہ گاڑنے والے کے لئے بھیج دیا؛ جہاں سے فتح محمد سپاہ نے کھود کر سب نکال لیا۔ مگر مرزا نے اس تنگی و عسرت کی حالت میں بھی اپنے متعدد نوکروں میں سے کسی کو جواب نہیں دیا، اور جو حالت آ پڑا اور اُنکے متعلقین پر خوش و ناخوش گذری انہیں نوکر بھی برابر شریک رہے۔ نوکروں کے علاوہ جن لوگوں کے ساتھ مرزا امن کے زمانے میں ہمیشہ سلوک کرتے تھے وہ اس حالت میں بھی مرزا کو ستاتے تھے اور چار ناچار اُنکی بھی مرزا کو خیر یعنی پڑتی تھی۔ مرزا لکھتے ہیں کہ ”اس ناداری کے زمانے میں جس قدر کپڑا، اوڑھنا، اور بھونگا گھر میں تھا سب بیچ بیچ کر کھا گیا گویا اور لوگ روٹی کھاتے تھے اور میں کپڑا کھاتا تھا، اسکے بعد کتاب کو اس طرح ختم کرتے ہیں کہ ”اس بار نیچے اطفال یعنی کتاب دستنبو کے لکھنے میں کب تک خامہ فرسائی کی جائے؟ جو حالت کہ اس وقت درپیش ہے ظاہر ہے؛ کہ آسکا انجام یا موت ہے، یا بھیک مانگنا۔ پہلی صورت میں یقیناً پائسا نا تمام رہنے والی ہے، اور دوسری صورت میں نتیجہ اسکے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟ کہ کسی دکان سے دھکا کرے گئے، اور کسی دروازے سے کوڑی پسیا کھڑل گیا۔ پس اپنی ذلت و رسوائی کے سوا اب انہیں لکھنے کو کچھ باقی نہیں رہا۔ قدیم نیشن اگر بل بھی گئی تو بھی کام چلتا نظر نہیں آتا، اور یہی تو تو کام ہی تمام ہے۔ مشکل یہ ہے کہ دونو صورتوں میں۔ چونکہ اس شہر کی آب و ہوا اب خستہ دلوں کو اس آتی معلوم نہیں ہوتی۔ ضرور شہر چھوڑنا اور کسی اور بستی میں جا کر بسنا کرنا پڑے گا، اندر کے بعد دو برس تک مرزا کا یہی حال رہا۔ مگر دو برس بعد نواب دوست علی خاں مرحوم تھیں رام پور

اگرچہ فتح دہلی کے بعد ہمارا ج پٹیا لہ کی طرف سے حکیم محمود خاں مرحوم اور ان کے ہمسایوں کے مکان پر۔
 جیسے ایک مرزا بھی تھے۔ حفاظت کے لئے پہرہ بیٹھ گیا تھا؛ اس لئے وہ فتنہ سپاہیوں کی
 لوٹ کھسوٹ سے محفوظ رہے؛ مگر پھر بھی انکو طرح طرح کی کلفتیں اٹھانی پڑیں۔ مرزا کے چھوٹے
 بھائی جو تین برس کی عمر میں دیوانے ہو گئے تھے، اور اخیر دم تک اسی حالت میں رہے؛ جب مرزا نے
 دہلی میں سکونت اختیار کی تو انکو بھی اپنے ساتھ یہیں لے آئے تھے۔ مرزا کے مکان سے انکا مکان
 تقریباً دو ہزار قدم کے فاصلے پر تھا۔ ایک دربان اور ایک کنیز کہ دونوں عمر رسیدہ تھے۔ ان کے پاس رہتے
 تھے۔ جب دہلی فتح ہو گئی، اور شہر اہل دہلی سے خالی ہو گیا، اور رستے بند ہو گئے؛ اُس وقت
 مرزا بھائی کی طرف سے سخت پریشان رہنے لگے۔ بھائی کے کھانے پینے سونے مرنے اور جینے
 کی مطلق خبر نہ تھی۔ ایک روز یہ خبر آئی کہ مرزا یوسف کے مکان میں بھی کچھ سپاہی گھس آئے تھے،
 اور جو کچھ اسباب ملا۔ لے گئے۔ پھر ایک دن وہی بڑھا دربان جو مرزا یوسف کی ڈیوڑھی پر رہتا تھا
 یہ خبر لایا کہ پانچ روز سخت تپ میں مبتلا رہ کر آج آدھی رات گزرے مرزا یوسف کا انتقال ہو گیا۔
 اُس وقت زکفن کے لئے کپڑا بازار میں مل سکتا تھا؛ نہ غسل اور گورکن کا کیس پاتا تھا؛ نہ شہر سے
 قبرستان تک جانا ممکن تھا؛ مگر مرزا کے ہمسایوں نے انکی بڑی مدد کی۔ پٹیا لہ کی فوج کے ایک
 سپاہی کو۔ جو حفاظت کے لئے تعینات تھا۔ اور مرزا کے دوا دیوں کو ساتھ لیا؛ اور مرزا جنا
 کے ہاں سے دو سفید چادریں لیکر مرزا یوسف کے مکان پر پہنچے۔ اور بعد غسل اور تھنیر و نکفن
 کے مسجد کے صحن میں۔ جو مکان کے قریب تھی۔ دفن کر دیا۔ مرزا نے دستبنوں میں اس مقام پر
 یہ اشعار لکھے ہیں۔

مگر افسوس ہے کہ مرزا کی وفات کے بعد دونوں تھوڑے تھوڑے فاصلے سے جوان عمر میں فوت ہو گئے۔

[زین العابدین خاں عارف سے مرزا صاحب کو غایت درجے کا تعلق تھا۔ کچھ تو قرابت کے

سبب، اور زیادہ تر اس وجہ سے کہ وہ نہایت خوش فکر اور معنی یاب طبیعت رکھتے تھے، اور

باوجود پُرگوئی کے نہایت خوش گوشت تھے؛ انکو حد سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ اسی لئے جبہ جوان عمر

میں فوت ہوئے تو مرزا اور انکی بی بی پر سخت حادثہ گذرا۔ مرزا نے اُنکے مرنے پر ایک غل بطور توجہ

کے لکھی ہے جو نہایت بلیغ اور دردناک ہے۔ چنانچہ اُنکے چند شعریں اس مقام پر نقل کرتے ہیں۔

لازم تھا کہ دیکھو برا نہ سا کوئی دن اور تنہا گئے کیوں؟ اب ہو تنہا کوئی دن اور

اُسے ہو گل اور آج ہی کہتے ہو کہ جاؤں مانا کہ نہیں آج سے اچھا کوئی دن اور

جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو لینگے کیا خوب! قیامت کا ہے گوا کوئی دن اور

ہاں اے غلب پیر جواں تھا ابھی عارف کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرنا کوئی دن اور

تم ماؤ شب چارو ہم تھے مرے گھر کے پھر کیوں نہ رہا گھر کا وہ نقشا کوئی دن اور

تم ایسے کہاں کے تھے کھرے داد و ستد کرتا ملک الموت تھا اُنکا کوئی دن اور

جُتھے تھیں نفرت سی تیرے لڑائی بچوں کا بھی دیکھا نہ تماشا کوئی دن اور

گذری نہ بہر حال یہ مدت خوش و ناخوش؟ کرنا تھا جواں مرگ! گذار کوئی دن اور

ناداں ہو جو کہتے ہو کہ کیوں جیتے جو غالب! قسمت میں ہے مرنے کی تنہا کوئی دن اور

[غدر کے زمانے میں مرزا دلی سے بلکہ گھر سے بھی باہر نہیں نکلے۔ جو میں بغاوت کا قندہ اٹھا

آنکھوں نے گھر کا دروازہ بند کر لیا، اور گوشہ تنہائی میں غدر کے حالات لکھنے شروع کئے۔

ہو رہا تھا۔ اُتناے گفتگو میں ایک صاحب نے فیضی کی بہت تعریف کی۔ مرزا نے کہا ”فیضی کو جیسا لوگ سمجھتے ہیں ویسا نہیں ہے“ اس پر بات بڑھی۔ اُس شخص نے کہا فیضی جب پہلی ہی بار اکبر کے روبرو گیا تھا۔ اُسے ڈھائی سو شعر کا قصیدہ اُسی وقت ارتجالاً لکھ کر پڑھا تھا۔ مرزا بوسے ”اب بھی اللہ کے بندے ایسے موجود ہیں کہ دو چار سو نہیں تو دو چار شعر ہر موقع پر بدلتے کہہ سکتے ہیں“ حنا نے جیب میں سے ایک چکنی ڈلی نکال کر ہتیلی پر رکھی اور مرزا سے درخواست کی کہ اس ڈلی پر کچھ لکھنا ہو۔ مرزا نے گیارہ شعر کا قطعہ اُسی وقت موزوں کر کے پڑھ دیا۔ جو کہ اُنکے دیوانِ رنجیت میں موجود ہے۔ اور جس کا پہلا شعر یہ ہے۔

ہے جو صاحب کے کتب دست پہ چکنی ڈلی زیب دیتا ہے اسے جس قدر اچھا کیسے

مرزا صاحب کے اولاد کچھ نہ تھی۔ ابتدا میں سات بچے پے درپے ہوئے؛ مگر کوئی زندہ نہیں رہا۔ اس لئے ایک مدت سے وہ اور آنکی بی بی تنہا زندگی بسر کرتے تھے۔ مگر عرصے چند سال پہلے جبکہ آنکی بی بی کے بھانجے زین العابدین خاں عارف کا انتقال ہو گیا، اور اُنکے دو نوجے ایک باقر علیاں اور دوسرے حسین علیاں صغیر سن رہ گئے۔ تو مرزا اور آنکی بی بی نے چھوٹے لڑکے حسین علیاں کو جو اُس وقت بہت کم عمر تھا اپنے سایہ عاطفت میں لے لیا۔ مرزا حسین علیاں کو حقیقی اولاد سے بھی کچھ بڑھ کر عزیز رکھتے تھے اور کبھی اُنکے سے ادھل نہیں ہونے دیتے تھے اور حد سے زیادہ نافرمانی کرنے دیتے تھے۔

جب زین العابدین خاں کی والدہ کا انتقال ہو گیا تو حسین علیاں کے بڑے بھائی باقر علیاں کو بھی مرزا نے اپنی سرپرستی میں لے لیا۔ یہ دونوں خوش فکر اور اہل اور نیکو اور نہایت شریف مزاج تھے

ماہ بست و ہشت شبہ ناپیدار، و نامش بعنوان بے نشانی در مہر نیم روز آشکار۔ ماند،

استماع میں۔ جبکہ شیخ ابراہیم ذوق کا انتقال ہو گیا۔ بادشاہ کے اشعار کی اصلاح بھی مرزا سے متعلق ہو گئی تھی۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ مرزا اس کام کو بادلِ ناخواستہ سرانجام کرتے تھے۔

ناظر حسین مرزا مرحوم کہتے تھے کہ ایک روز میں اور مرزا صاحب دیوان عام میں بیٹھے تھے کہ چوبدار آیا اور کہا کہ حضور نے غزلیں مانگی ہیں۔ مرزا نے کہا ذرا ٹھیر جاؤ؛ اور اپنے آدمی سے کہا کہ پالکی میں

کچھ کاغذ و مال میں بندے ہوئے رکھے ہیں وہ لے آؤ، وہ فوراً لے آیا۔ مرزا نے چو اسکو کھولا تو اس سے آٹھ نو پرچے۔ جن پر ایک ایک نو دو مصرع لکھا ہوا تھا؛ نکالے۔ اور اسی وقت

دواتِ قلم منگو کر ان مصرعوں پر غزلیں لکھنی شروع کیں؛ اور وہیں بیٹھے بیٹھے آٹھ یا نو غزلیں تمام و کمال لکھ کر چوبدار کے حوالے کیں۔ ناظر مرحوم کہتے تھے کہ ان تمام غزلوں کے لکھنے میں ان کو

اس سے زیادہ دیر نہیں لگی کہ ایک شائق استاد چند غزلیں مرتب کیں اصلاح دیکر درست کر دے جب چوبدار غزلیں لیکر چلا گیا تو مجھے کہا کہ حضور کی کبھی کبھی کی فرمائشوں سے لُج مدت کے بعد

سبکدوشی ہوتی ہے اگرچہ مرزا صاحب جو کچھ اپنی طرز خاص میں لکھتے تھے۔ نظم ہر یا نثر۔ اسکو بڑی کاوش اور بانگاہی سے سرانجام کرتے تھے؛ چنانچہ خود انھوں نے جا بجا اسکی تصریح کی ہے؛ مگر جب کبھی

اپنی خاص روش پر چلنے کی ضرورت نہوتی تھی اس وقت ان کو فکر پر زیادہ زور دانا نہیں پڑتا تھا۔

استماع میں۔ جبکہ نواب ضیاء الدین احمد خاں مرحوم کلکتے گئے ہوئے ہیں۔ مولوی محمد عالم مرحوم

نے جو کلکتے کے ایک دیرینہ سال فاضل تھے۔ نواب صاحب سے بیان کیا کہ جس زمانے میں مرزا صاحب یہاں آئے ہوئے تھے۔ ایک مجلس میں۔ جہاں مرزا بھی موجود تھے، اور میں بھی حاضر تھا۔ شعر کا ذکر

حیات
اصلاح
اشعار
چوبدار

سبکدوشی

اور مرزا ان تمام مطالب کو اپنی طرز خاص کی فارسی نثر میں بیان کریں۔ اور کتاب دو حصوں پر تقسیم کی جائے۔ پہلے حصے میں کچھ مختصر حال ابتداء آفرینش سے صاحبقران تیمور گورکان تک، اور کسی قدر مفصل حالات تیمور سے نصیر الدین ہمایوں کے اخیر زمانے تک بیان کئے جائیں۔ اور دوسرے حصے میں جلال الدین اکبر بادشاہ سے لیکر سراج الدین بہادر شاہ کے زمانے تک تمام واقعات منسلک کے ساتھ درج کئے جائیں۔ مرزا نے تمام کتاب کا نام پر توستان اور اسکے پہلے حصے کا نام مہر نیروز اور دوسرے حصے کا نام ماہ نیم ماہ تجویز کیا تھا۔ ان کو اپنی دو ترکیبوں پر ناز تھا؛ ایک ماہ نیم ماہ اور دوسرے رستخیز بیجا۔ مرزا کہتے تھے کہ چودھویں رات کے چاند کو ماہ چارودہ اور ماہ دو ہفتہ تو پہلے لوگوں نے اکثر باندھا ہے؛ مگر جہاں تک مجھے معلوم ہے ماہ نیم ماہ کسی نے نہیں باندھا۔ یہ ترکیب خاص میری تراشی ہوئی ہے۔ مگر افسوس ہے کہ دوسرا حصہ یعنی ماہ نیم ماہ بالکل سنیں بکھا گیا۔ مہر نیروز ختم ہونے کے بعد مرزا نے ذرا آرام لینے کے لئے چند روز توقف کیا تھا اور ارادہ تھا کہ جلد دوسرا حصہ شروع کریں کہ اتنے میں غدر ہو گیا اور اس حصے کا صرف نام ہی نام رہ گیا۔

حیدرآباد سے ایک صاحب نے مرزا سے ماہ نیم ماہ کو طلب کیا تھا اسکے جواب میں لکھتے ہیں "ماہ نیم ماہ اسمیت کہ مستحق اندازد۔ جوں از سر نوشت گردن نتوان پیچید سرگذشت باز گویم ہر گاہ یک نیم از پر توستان انجام یافت، و مہر نیروز نام یافت، نختے درنگ درزیدہ شد؛ تا نفس راست کردہ آید۔ ناگاہ کار فرما را روز فرد رفت، و روزگار سر آمد؛ و دولت دیر یث ترکمانان فرا چار یث سپری گشت۔ ماہ نیم ماہ بچوں

۴۴ رستخیز بے جا غدر کی تاریخ کا مادہ ہے۔ اس میں رستخیز کے اعداد یعنی ۱۲۷۷ میں سے جا کے عدد یعنی (۴) کا استخراج کیا ہے ۱۲

بہرہ اہل جہاں چوں نہاں درد و غم ست
 بہرہ من ز جہاں بیشتر آمد گوئی
 خستن و بہتن من جد غمشیت - برو
 بر من اینہا ز قصت او قد آمد گوئی
 ہنرم را نتواں کرد چہ خستن صانع
 خشکی غازدہ روئے ہنر آمد گوئی
 چرخ یک مرد گر انما یہ بزرغاں خواہد
 یوسف از قید زلیخا پد آمد گوئی
 ہمدماں! دردلم از ویدہ نہانید ہمہ
 غالب غنزدہ راج در دانید ہمہ
 بشد احمد کہ در عیش و نشاطید ہمہ
 شد اشکر کہ باشوکت و شانید ہمہ
 من بخون خفتہ و بینم ہمہ بینید ہمہ
 در میاں ضابطہ مہر و وفائے بودست
 من جگر خستہ و داغ ہمہ دانید ہمہ
 روزے از مہر گفتیہ فلانی چوں ست
 من بریم کہ ہر آئینہ برآیند ہمہ
 چارہ گر نتواں کرد دعائے کافی ست
 بارے از لطف بگوئید چہاں دید ہمہ
 ہفت بندست کہ در بند رقم ساختہ ام
 دل اگر نیست حسد او نہ زیارتید ہمہ
 بنویسید و بر بسینید و بخوانید ہمہ

آں نہ باشم کہ ہر نیم زمین یاد آرید

دارم امید کہ در نیم سخن یاد آرید

۱۲۶۶ھ میں مرحوم ابو ظفر سراج الدین بہادر شاہ نے مرزا کو خطابِ نجم الدولہ و دبیر الملک نظام جنگ

اور چچہ پارسچے کا خلعت مع تین رقوم جواہر یعنی جویہ و سرپیچ و حائل مردارید کے - دربار عام میں حرمت

فرمایا اور خاندانِ تیمور کی تاریخ نویسی کی خدمت پر بشاہرہ پچاس روپیہ ماہوار کے مامور کیا۔ اور یہ قرار پایا

کہ احترام الدولہ حکیم حسن اللہ خاں مرحوم مختلف تاریخوں سے مضامین انقطاع کر کے مرزا کے حوالہ کیا کریں

وہ
چشمہ

جامعہ
تعارف

یہ ترکیب بند مرزا کی عمدہ ترین حالتِ فطرتوں میں سے ہے اس واسطے اس کے مختلف بندوں میں سے
کچھ کچھ شعر بیاں نقل کئے جاتے ہیں

ابتداء
اول

خواہم از بند بر زنداں سخن آغاز کنم
بہ نوائے کہ ز مضرب چکاند خواب
چوں سرایم سخن انصاف ز مجرم خواہم
یار ویرینہ! قدم رنجہ مفرما کا نیجا
اہل زنداں بسر و چشم خودم جادو
ہلہ دزدان گرفتار! وفا نیست بشہر
غم دل پر وہ دری کردہ فغاں ساز کنم
خویش تن را بہ سخن ز مرید پر داز کنم
چوں نویسم غزل اندیشہ ز غما گزیم
اں نہ گنج کہ تو در کوپی وین باز کنم
تا بدیں صبر نشینی چہ قدر ناز کنم
خویش تن را بہ شمشاد دم و ہر از کنم

پاسانماں بہم آیت کہ من مے ایم
ہر کہ دیدے بہ رخویش سپاسم گھنٹے
جادو نشناسم و زانبوہ شامی ترسم
بہر و جسادہ تسلیم درشتی نکند
ہاں عزیزاں کہ دریں کلبہ اقامت دایہ
تا بہ دروازہ زنداں پئے اور دن من
چوں سخن سنجی و فرزاگی کہین منست
اچھ فرو است حسام امروز در آگہ گوئی
خیر ملتدم بہر امید کہ من مے ایم
راحمم از دور نمایند کہ من مے ایم
سخت گیرندہ چرائید کہ من مے ایم
بخت خود را بستائید کہ من مے ایم
قدے ریخہ ناسید کہ من مے ایم
بہر از من بر بایسد کہ من مے ایم

آفتاب از جہت قبلہ بر آگہ گوئی
شب و روز یکہ مرا بود سراسر آگہ گوئی
دل و دستے کہ مرا بود فروماند ز کار

ابتداء
اول

ابتداء
پہلوا

نواب مصطفیٰ خاں مرحوم نے اُس زمانے میں مرزا کے ساتھ دوستی کا حق پورا پورا ادا کیا۔
اپیل میں جو کچھ صرف ہوا وہ اپنے پاس سے صرف کیا اور تین مہینے تک برابر انکی غمخواری اور ہر طرح کی
خبر گیری میں مصروف رہے۔ چنانچہ اُسی ترکیب بند میں نواب مرحوم کی نسبت کہتے ہیں۔

خود چراغوں غورم از غم کہ غمخواری من رحمت حق بہ لباس بشر آمد گوئی
خواجہ ہست دریں شہر کز از پرش و پایہ خویش تنم در غم نہ آمد گوئی
مصطفیٰ خاں۔ کہ دریں واقعہ غمخوار ہست

گر بمرم چہ غم از مرگ۔ عنداد اہل ہست

جب مرزا قید سے چھوٹ کر آئے تو میاں کاٹلے صاحب کے مکان میں آکر رہتے تھے۔
ایک روز میاں کے پاس بیٹھے تھے؛ کسی نے اگر قید سے چھوٹنے کی مبارکباد دی۔ مرزا نے کہا
”کون بھڑو ا قید سے چھوٹا ہے؟ پہلے گورے کی قید میں تھا اب کالے کی قید میں ہوں“

مرزا نے قید میں ایک فارسی ترکیب بند اپنے حسبِ حال لکھ کر دوستوں کو بھیجا تھا۔ اس نظم
میں کُل سات بند اور ہر بند میں بارہ بارہ شعر ہیں۔ مرزا کے عزیزوں اور دوستوں نے کلیات فارسی
میں اس نظم کو چھینے نہیں دیا تھا؛ مگر مرزا صاحب نے مرنے سے کسی قدر پہلے اپنی جدید نظم کا ایک
مجموعہ موسوم بہ سپر چھین شائع کیا تھا؛ اُس میں اس ترکیب بند کو بھی شامل کر دیا تھا۔ لیکن چھین
کی زیادہ اشاعت نہیں ہوئی؛ اس لئے یہ ترکیب بند بہت کم لوگوں کی نظر سے گزرا ہے۔ چونکہ

۱۔ حضرت محمد نصیر الدین عت میاں کالے صاحب بہادر شاہ مرحوم کے بیٹے اور مولانا خزاں الدین قدس سرہ کے چوتے تھے۔
مرزا عت تک ان کے مکان میں رہے ہیں۔ وہ مرزا سے نہایت محبت رکھتے تھے اور انھیں کی تقریب سے طبع میں
تعلق پیدا ہوا تھا ۱۲

میری خاکساری اور آزادہ روی سے اسکو مطلع کیا؛ یہاں تک کہ اُس نے خود بخود میری رہائی کی رپورٹ بھیج دی۔ اگرچہ میں۔ اس وجہ سے کہ ہر کام کو خدا کی طرف سے سمجھتا ہوں اور خدا سے لڑا نہیں جاسکتا۔ جو کچھ گزرا اسکے تنگ سے آزاد اور جو کچھ گزرنے والا ہے اسپر راضی ہوں۔ مگر آزاد کرنا اتنی عبودیت کے خلاف نہیں ہے۔ میری یہ آرزو ہے کہ اب دنیا میں نہ رہوں؛ اور اگر رہوں تو ہندوستان میں ہوں روم ہے، مصر ہے، ایران ہے، بغداد ہے؛ یہ جی جانے دو خود کعبہ آزادوں کی جاے پناہ اور استاذہ رحمۃ اللعالمین ولد ادوں کی تکیہ گاہ ہے۔ دیکھیے وہ وقت کب آئیگا کہ دراندگی کی قید سے جو اس گزری ہوئی قید سے زیادہ جانفرا ہے نجات پاؤں اور بغیر اسکے کہ کوئی منزل مقصود قرار دوں سبھی نکل جاؤں۔ یہ ہے جو کچھ کہ مجھ پر گزرا اور یہ ہے جسکا میں آرزو مند ہوں۔“

یہ واقعہ مرزا صاحب پر نہایت شاق گذرا تھا۔ اگرچہ منجملہ چھ مہینے کے تین مہینے جو انکو قید خانے میں گزرے ان کو کسی طرح کی تکلیف نہیں ہوئی؛ وہ بالکل قید خانے میں اسی آرام سے رہے جیسے گھر پر رہتے تھے۔ کھانا اور کپڑا اور تمام ضروریات حسبِ دلخواہ گھر سے انکو پہنچتی تھیں۔ انکے دوست ان سے ملنے جاتے تھے۔ اور وہ صرف بطور نظر بندوں کے چیلانے کے ایک علیحدہ کمرے میں رہتے تھے۔ مگر چونکہ اسوقت تک شہر کے شرفا و اعیان کے ساتھ کبھی اس قسم کا سلوک مرزا نے نہیں دیکھا تھا اس لیے وہ اسکو ایک بڑی بے آبروئی کی بات سمجھتے تھے۔ چنانچہ جو ترکیب بند انھوں نے قید خانے میں لکھا تھا اُس میں کہتے ہیں

بہرِ آزارِ عزم از قیدِ فرنگم نبرد
طعنِ اجاب کم از زخمِ حنہ نگم نبرد

رازِ دانا غمِ رسوائی جاوید بلاست
جو رِ اعدا رو داند دل بہ رہائی۔ لیکن

سے اتر کر اس انتظار میں ٹھیرے رہے کہ دستور کے موافق صاحب سکرٹری انکے لینے کو آئینگے جب بہت دیر ہو گئی ، اور صاحب کو معلوم ہوا کہ اس سبب سے نہیں آئے ؛ وہ خود باہر چلے آئے اور مرزا سے کہا کہ جب آپ دربار گورنری میں تشریف لاؤ گے تو آپ کا اسی طرح استقبال کیا جائیگا لیکن اس وقت آپ نوکری کے لئے آئے ہیں اس موقع پر وہ برتاؤ نہیں ہو سکتا۔ مرزا صاحب نے کہا گورنمنٹ کی ملازمت کا ارادہ اس لئے کیا ہے کہ اغراض کچھ زیادہ ہونہ اس لئے کہ موجودہ اغراض میں بھی فرق آئے۔ صاحب نے کہا ہم قاعدے سے مجبور ہیں۔ مرزا صاحب نے کہا جگہوں کی خدمت سے معاف رکھا جائے ؛ اور یہ لکھر چلے آئے۔

مرزا کو شطرنج اور چوہ سر کھیلنے کی بہت عادت تھی۔ اور چوہ سرب کبھی کھیلتے تھے برائے نام کچھ بازی بد کر کھیلا کرتے تھے۔ اسی چوہ سر کی بدولت ۱۲۶۲ھ ہجری میں مرزا پر ایک سخت ناگوار واقعہ گذرا۔ مرزا نے خود اس واقعہ کو ایک فارسی خط میں مختصر طور پر بیان کیا ہے جس کا ترجمہ ہم اس مقام پر لکھتے ہیں ”کو تو ال دشمن تھا اور مجھ پر ٹٹ نا واقف ؛ فتنہ گھات میں تھا اور ستارہ گردش میں۔“ باوجود مجھ پر ٹٹ کو تو ال کا حاکم ہے ؛ میرے بایں وہ کو تو ال کا محکوم بن گیا اور میری قید کا حکم صادر کر دیا۔ سشن بج۔ باوجودیکہ میرا دوست تھا اور ہمیشہ مجھ سے دوستی اور مہربانی کے برتاؤ کرتا تھا اور اکثر صحبتوں میں بے تکلفانہ ملتا تھا۔ اُس نے بھی اغراض اور تغافل اختیار کیا۔ صدر میں اپیل کیا گیا مگر کسی نے نہ سنا اور وہی حکم بحال رہا۔ پھر معلوم نہیں کیا باعث ہوا کہ جب ادھی میاؤ گذر گئی تو مجھ پر ٹٹ کو رجم آیا اور صدر میں میری رہائی کی رپورٹ کی اور دمان سے حکم رہائی کا آگیا اور حکام صدر نے اسی رپورٹ بھیجنے پر اسکی بہت تعریف کی۔ سنا ہے کہ رجم دل حاکموں نے مجھ پر ٹٹ کو بہت نفرت کی اور

کروں کہ میں تو آپ کو کتے سے بھی بدتر سمجھتا ہوں؛ تو سخت مشکل واقع ہوگی۔ میں تو اپنی نسبت کمونگا اور آپ ممکن ہے کہ اپنی نسبت سمجھ جائیں۔ سب حاضرین یہ لطیفہ سنکر ہنسنے لگے۔ مرزا کا مطلب صرف اس قدر بیان کرنا تھا کہ آپ کو مخاطب کے لئے تو عموماً بولا ہی جاتا ہے؛ اگر مکالمہ کے لئے بھی اسکا استعمال ہوگا تو بعض مواقع پر التباس واقع ہوگا۔ اس مطلب کو انھوں نے اس لطیف پیرایے میں بیان کیا۔ مگر یہ فقط ایک لطیفہ اہل صحبت کے خوش کرنے کے لئے تھا۔ ورنہ اہل دہلی بھی اکثر بجائے اپنے تئیں کے آپ کو بولتے ہیں؛ اس میں کچھ اہل لکھنؤ کی خصوصیت نہیں ہے۔

ازبان کے متعلق مرزا کا اسی قسم کا ایک اور لطیفہ مشہور ہے۔ دلی میں رتھہ کو بعضے مونٹ اور بعضے مذکر بولتے ہیں کسی نے مرزا صاحب سے پوچھا کہ حضرت! رتھہ مونٹ ہے یا مذکر؟ آپ نے کہا بھیتا! جب رتھہ میں عورتیں بیٹھی ہوں تو مونٹ کہو اور جب مرد بیٹھیں تو مذکر سمجھو۔

اتذکرۃ آبجیات میں لکھا ہے کہ ۱۸۵۷ء میں۔ جبکہ دہلی کالج نئے اصول پر قائم کیا گیا۔ مسٹر ٹامسن سکریٹری گورنمنٹ ہند۔ جو آخر کو اضلاع شمال و مغرب میں نقصٹ گورنر ہو گئے تھے۔ مدرسین کے امتحان کے لئے دلی میں آئے۔ اور چاہا کہ جس طرح سورہ پیہ یا ہوار کا ایک عربی مدرس کالج میں مقرر ہے؛ اسی طرح ایک فارسی کا مدرس مقرر کیا جائے۔ لوگوں نے مرزا اور مولانا اور مولوی اماں بخش کا ذکر کیا۔ سب کے پہلے مرزا صاحب کو بلا یا گیا۔ مرزا بالکل میں سوار ہو کر صفا سکریٹری کے ڈیرے پر پہنچے۔ صاحب کو اطلاع ہوئی؛ انھوں نے فوراً بلا لیا۔ مگر یہ بالکل

لطیفہ

ازبان

انکی تقریب کی گئی۔ مرزا سے اُس پریشانی کے عالم میں قصیدہ تو سرانجام نہیں ہو سکا؛ مگر ایک مرثیہ صنعتِ تعطیل میں۔ جو انکے مسودات میں موجود ہے۔ نائبِ سلطنت کے سامنے پیش کرنے کے لئے لکھی تھی۔ لیکن مرزا صاحب نے ملاقات سے پہلے دو شرطیں ایسی پیش کیں جو منظور نہ ہوئیں؛ ایک یہ کہ نائبِ میری تعلیم دیں، دوسرے نذر سے مجھے معاف رکھا جائے۔ اسی وجہ سے مرزا۔ بغیر اسکے کہ روشن الدولہ سے ملیں اور وہ شریعت پیش کریں۔ وہاں سے کلکتے کو روانہ ہو گئے۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ کلکتے سے واپس آنے کے بعد انہوں نے ایک قصیدہ دلی سے نصیر الدین حیدر کی شان میں لکھ کر ایک دوسرے کے توسط سے گزرا تا تھا۔ اور اُس پر پانچ ہزار روپے بطور صلے کے ملنے کا حکم ہوا تھا۔ شیخ امام بخش ناسخ نے مرزا کو لکھا کہ پانچ ہزار ملے تھے؛ تین ہزار روشن الدولہ کھا گئے؛ اور دو ہزار متوسط کو دیکر کما کر ایسے سے جو مناسب سمجھو مرزا کو بھیج دو۔ مرزا صاحب نے یہ سنکر پھر کچھ تحریک کی۔ مگر تین دن بعد یہ خبر پہنچی کہ نصیر الدین مر گئے۔ پھر واجد علی شاہ کے زمانے میں مرزا نے سلسلہ جنابانی کی؛ اور پانسو روپیہ سالانہ ہیشہ کے لئے وہاں سے مقرر ہو گئے۔ لیکن عرن دو برس گزرے تھے کہ ریاست ضبط ہو گئی؛ اور وہ دفتر کا دُور ہو گیا۔

الکھنؤ کی ایک صحبت میں۔ جب کہ مرزا وہاں موجود تھے۔ ایک روز الکھنؤ اور دلی کی زبان پر گفتگو ہو رہی تھی۔ ایک صاحب نے مرزا سے کہا کہ جس موقع پر اہلِ دہلی اپنے تئیں بولتے ہیں وہاں اہلِ لکھنؤ آپ کو بولتے ہیں؛ آپ کی رائے میں نصیح آپ کو ہے یا اپنے تئیں؛ مرزا نے کہا۔ نصیح تو یہی معلوم ہوتا ہے جو آپ بولتے ہیں؛ مگر ہمیں وقت یہ ہے کہ مثلاً آپ میری نسبت یہ فرمائیں کہ میں آپ کو فرشتہ خصائل جانتا ہوں، اور میں اُسکے جواب میں اپنی نسبت یہ عرض

ایک از من ہزار بار یہ است	از من ہجرت من چہ ہزار بہ است
من کتب خاک واد سپہ بلند	خاک را کے رسد بچرخ کست
وصف او حد چون بنے بنود	مہر در خورد روز نے بنود
مرجا ساز خوش بیانی او	حبذا شور نکستہ دانی او
نظمش آب حیات را ماند	در روانی فرات را ماند
بشر او نقش بال طاووس است	اتخاب صرح وقاموس است
پادشاہے کہ در تلم و حرف	کردہ ایجا و نکستہ ہاے شگرف
خامہ ہندوی پاری دانش	ہندیاں سر بخط فرماش
ایں رقمما کہ رخت کلک خیال	بود سطح ز نامہ اعمال
از من نار سائے سپہاں	معذرت نامہ است زری یاراں
بوکہ آید ز عذر خواہی ما	رسم بر ما و بیگناہی ما
آشتی نامہ و داد پیام	ختم شد و السلام والا کرام

جب مرزا نے دلی سے کلکتے جانے کا ارادہ کیا تھا اسوقت راہ میں ٹھیرنے کا قصد نہ تھا۔ مگر چونکہ لکھنؤ کے بعض ذی اقتدار لوگ مدت سے چاہتے تھے کہ مرزا ایک بار لکھنؤ آئیں؛ اس لیے کانپور پہنچ کر انکو خیال آیا کہ لکھنؤ بھی دیکھتے چلیے۔ اس زمانے میں نصیر الدین حیدر فرمانروا اور روشن الدین نائب السلطنہ تھے۔ اہل لکھنؤ نے مرزا کی عمدہ بطور پر مدارات کی اور روشن الدولہ کے ہاں بنوں نشانی

کہ چہاں از خرمیہ بچیم سر؟
 دل دہر کز اسیر برگردم؟
 دامن از کف کنم چگونہ را
 خاصہ روح و روان معنی را
 آنکہ از سر فرازی قلمش
 طرز زانندیشہ آفریدہ است
 پشت معنی قوی ز پہلویش
 طرز ز تحسیر را نوی ازوے
 فتنہ گفتگوے اینانم
 آں کہ طے کردہ این موافق را
 لیک با انیمہ کہ این دارم
 دل و جانم فداے اجابست
 میثوم خویش را بصلح دلیل
 تانساند ز من دگر گلہ
 گفتن آئین ہوشیاری نیست
 گر چہ ایرائیش نخواہم گفت
 آں بجا دو دمی بد ہر سہم
 زان نو آئیں صفیر برگردم
 طالب و عرفی و نظیری را
 آں ظہوری جہان معنی را
 آسمان ساست پرچم شش
 در تن لفظ جاں میدہ است
 خامہ را فرہی ز بازویش
 صفحہ از تنگ مانوی ازوے
 مست لائے بیوے اینانم
 چہ شناسد قاتل و واقف را
 گنج معنی در آستین دارم
 شوق وقف رضاے اجابست
 می سرایم نواے برج قاتل
 رسد از پیروان وے صلہ
 لیک دانستن اختیار نیست
 سعدی ثنائیش نخواہم گفت

من و ایسان من کزان ترسم	نہ ز آوینزش بیاں ترسم
بزباں ماند ایس حکایت باز	کہ پس از من بیا لہاسے دراز
چندر دوز آرمیدہ بود ایس جا	کہ سیغہ رسیدہ بود ایس جا
ز جمتے داد و در او خویش گرفت	با بزرگاں ستیزہ پیش گرفت
بیحیائے دہر زہ گوئیے بود	شوخ چشمے و زشت خوئیے بود
ہم غرابا تیانہ ہوئیے دشت	ہم سیغہانہ گفتگوئیے دشت
تنگ دہلی و سرزمینش بود	برگ دنیا نہ سازد زینش بود
خون دہسلی بود بگردن من	آوازاں دم کہ بعد رفتن من
بر دل انجمن گراں باشم	تا بوم رنج دوستاں باشم
آوخ از من کہ من چیاں بروم	شاہ گردند کز میاں بروم
دژم آیم نژند بر گردم	خستہ دستمند بر گردم
شوق را غرودہ و فائز سد	بود اعسم کس از شما زسد

کہ خرامت خلاف قافہ است	دوستاں را اگر ز من گلہ است
ساختہ فروراد لیل ہمہ	می زویم از پے قتل ہمہ
گام بر جادہ و گردوہ	توازیں حلقہ چوں بدر زدہ
ہاں بگوئید حبۃ اللہ	اے تماشا یان زلف نگاہ

آتشِ عنم بجانِ وادِ نروده	برقِ جیلاقی بجایِ زرده
در بیا بانِ یاسِ تشنه	از گدازِ غشسِ تبابِ و تبی
سدرِ برگرِ دکارِ وادِ قشا	نسبِ بلوفا فی محیطِ بلا
از عنمِ دهرِ زهرِ و باخت	در دمنده جگرِ گداخته
همه بر خویشِ پشتِ پازده	در آگاهیه قشا زده
که بد بخیارِ رسیده ام آه	چپِ بلا با کشیده ام آه
تیره شیمایِ و خشمِ بینید	پرسیده روزِ غمِ تبم بینید
عنمِ محبِ انِ بخشنِ نگرید	اندره دُورِ سی و وطنِ نگرید
من و جانِ آندریں که جانِ بلیم	نه حمیسِ ناله و غمناں بلیم
غمتِ بد خوئے کرده است مرا	پوچِ چوں سوئے کرده است مرا
کنزِ زبانِ سخنِ سراسر است مرا	ذوقِ شعری و سخنِ کجاست مرا
نوحه بر خویش و بنیوائی خویش	دارم آرس زهره لائی خویش
حسرتِ کار و بارِ بخویشتم	گردشِ روزگارِ بخویشتم
من چنان تاں خنیں!! درینِ درین	باسنِ این خشمِ دکیں!! درینِ درین
رحمِ اگر نیتِ خود چراست ستم	بعنه ریاں کجا رواست ستم

رزمِ فخرِ زمانِ دیکته دانان!

بنده ام بنده محمد بابا!

اے سخن پرورانِ کلکتہ
 ہریکے صدر بزمِ بارگے
 ہریکے پیش تازِ قافلہ
 اے بہ شغل و کالت آمادہ
 اے شگرفانِ عالم انصاف
 اب سخن را طراز جاں دادہ
 عطرِ مرغِ گیتی افشاں
 اے گرامیِ فتنانِ بحیثہ گو
 اے رنیاںِ این سوادِ عظیم
 ہنچو من آر سیدہٗ این شہر
 اسد اللہ بختِ برگشتہ
 گرچہ ناخواندہ میہمانِ شہاست
 بہ قظلم رسیدہ است اینجا
 آر میدان و مید روزے چار
 کارِ اجاب ساختنِ سمست
 آں ردہ و رسمِ کار سازی کو
 کیستم؟ دل شکستہ غمزدہ
 وے زباں اورانِ کلکتہ
 شمعِ خلوت سراے کارگے
 ہریکے کتھا اے مرحلہ
 دادِ عشقوارے جہاں دادہ
 بسفارت رسیدہ از اطراف
 صحنہ را سازِ گلستاں دادہ
 پہلوانانِ پسایِ داناں
 نذر دریا کشتانِ عمدہ جو
 وے فراہم شدہ دہشتِ اقلیم
 بہر کارے رسیدہٗ این شہر
 در حنم و پیچِ عجب سرگشتہ
 بے سخن - ریزہ چینِ خوانِ شہاست
 بامید آر سیدہٗ است اینجا
 خستہ را بہ سایہ دیوار
 میسماں را تو افقِ سمست
 شیوہٗ میسماں نوازی کو
 بیدلے خستہ ستم زدہ

کلکتے کے قیام کے زمانے میں کچھ لوگوں نے مرزا کے کلام پر اعتراض کیے تھے اور اپنے اعتراضوں پر قلیل کا قول سدا پیش کیا تھا۔ مگر مرزا ہندوستان کے فارسی گو شاعروں میں خسرو کے سوا کسی کو نہیں مانتے تھے۔ چنانچہ وہ ایک خط میں لکھتے ہیں ”اہل ہند میں سواے خسرو دہلوی کے کوئی مسلم الثبوت نہیں؛ میاں فیضی کی بی بی کہیں کیسے بھٹیک تکل جاتی ہے“ اسی لیے وہ قلیل و واقف وغیرہ کو کچھ چیز نہیں سمجھتے تھے۔ انھوں نے قلیل کا نام سنکر ناک نچوں چڑھائی اور کہا کہ میں دلوئی سنگھ فرید آباد کے کھتری کے قول کو نہیں مانتا اور اہل زبان کے سوا کسی کے قول کو قابل استناد نہیں سمجھتا۔ اور اپنے کلام کی سند میں اہل زبان کے اقوال پیش کیے۔ اس پر معترضین میں زیادہ جوش و خروش پیدا ہوا اور مرزا پر اعتراضوں کی بوچھاڑ پڑنے لگی۔ اگرچہ مرزا کے طرفدار بھی کلکتے میں بہت تھے مگر چونکہ مرزا اعتراض اور مخالفت سے بہت جربز ہوتے تھے۔ ان کے گھبراوینے کو ایک معترض بھی کافی تھا۔ انھوں نے تنگ آکر ایک مثنوی موسوم بہ یادِ محالفت۔ جس میں اپنی غریب الوطنی کا ذکر اور اہل کلکتہ کی نامہربانی کی شکایت اور ان کے اعتراضات اور اپنے جواب نہایت عمدگی اور صفائی اور درآئینہ طریقے سے بیان کیے ہیں۔ لکھی۔ یہاں اُس مثنوی کے کچھ کچھ اشعار مختلف مقامات سے نقل کیے جاتے ہیں۔

وے میسے اومان ناورہن
خوش نشینان ایں سبا و شکر

اے تاشایانِ بزمِ سخن
اے گرانایگانِ عالمِ حرف

مرزا قلیل فرمایا: اسلام لانے سے پہلے اُن کا نام دلوئی سنگھ تھا اور وہ فرید آباد ضلع دہلی کے کھتری تھے۔ مسلمان ہونے کے بعد کھنڈو چلے گئے تھے جہاں اُن کی نہایت قدر ہوئی ۱۲

گورنمنٹ سے۔ جو لارڈ لیک کے سکرٹری رہ چکے تھے، اور انھیں کے روبرو جاگیروں اور پنشنوں کی سندیں لوگوں کو ملی تھیں؛ مرزا کے معاملے کی بابت استفسار کیا۔ انھوں نے مرزا کے دعوے کو غلط بتایا اور جس طرح اور جس قدر پنشن فیروز پور سے ملنی قرار پائی تھی اسکی مفصل کیفیت۔ جو مرزا کے دعوے کے بالکل برخلاف تھی۔ گورنمنٹ میں بھیج دی۔ جب یہاں سے مرزا کو مایوسی ہوئی تو انھوں نے ولایت میں اپیل کیا؛ مگر وہاں بھی کچھ نہ ہوا۔

مرزا جہاں نے گورنمنٹ ہند سے پانچ درخواستیں کی تھیں؛ ایک تو یہی کہ انکے خیال کے موافق جو مقدار پنشن کی سکرٹری نے مقرر کی ہے وہ آئندہ پوری ملا کرے۔ دوسری یہ کہ اب تک جس قدر کم پنشن ملتی رہی ہے اسکی اصلاحات ابتدا سے آج تک ریاست فیروز پور سے دلوانی جائے۔ چونکہ پہلی درخواست نامنظور ہوئی تھی (اس لیے دوسری درخواست کیونکر منظور ہوتی)۔ تیسری درخواست یہ تھی کہ کل پنشن میں جو حصہ میرا قرار پائے وہ اور شرکا سے علیحدہ کر دیا جائے۔ چوتھی یہ کہ پنشن فیروز پور سے خزانہ سرکار میں منتقل ہو جائے؛ تاکہ رئیس فیروز پور سے مانگنی نہ پڑے۔ (یہ دونوں درخواستیں منظور ہو گئیں اور انکے موافق اخیر تک علیحدہ کر دیا) پانچویں درخواست خطاب اور خلعت کی تھی۔ جہاں تک معلوم ہے کوئی خطاب گورنمنٹ سے مرزا کو نہیں ملا۔ لیکن گورنمنٹ ہند اور لوکل گورنمنٹ سے ان کو خانصاحب بسیار مہربان دوستاں لکھا جاتا تھا۔ اور جب کبھی دلی میں ویراے یا لفٹنٹ گورنر کا دربار ہوتا تھا تو انکو بھی مثل دیگر رؤساء و عہدہ شہر کے بلایا جاتا تھا۔ اور سات پارچہ کا خلعت مع جینہ و سرتیج و مالائے مروارید کے انکو برابر ملتا رہا۔ اور تمام لوکل حکام اور افسرانے رئیس زادوں کی طرح ملتے رہے۔

عالم شباب اور خانہ داری کی ضرورتیں بہت بڑھ گئیں اور گھر میں جو کچھ آنا تھا وہ بھی چند روز میں سب خرچ ہو گیا، لاچار فکر معاش دانگیڑ ہوئی۔ اول مرزا کو غلط یا صحیح یہ خیال پیدا ہوا کہ فیروز پور سے بس قدر منشن ہمارے خاندان کے لیے گورنمنٹ نے مقرر کرائی تھی اس قدر ہکو نہیں ملتی۔ ضرورتوں نے سخت تنگ کر رکھا تھا، ادھر قرضوں ہوں کے تقاضے سے ناک میں دم آگیا تھا، ادھر چھوٹے بھائی کو جنون ہو گیا، مرزا جیسے آزاد منشا آدمی کے لیے یہ وقت نہایت سخت تھا، اس کشمکش میں انکو اسکے سوا اور کچھ نہ سوچا کہ کلکتے پہونچکر سوپریم گورنمنٹ میں منشن کی بابت استعائنہ پیش کریں۔ چنانچہ مرزا اس حالت کی نسبت ایک خط میں لکھتے ہیں دو ہنگامہ دیوانگی برادر ایک طرف، وغوغوغامی وام خواہاں یک سو، آشتو بے پدید آمد کہ نفس راہ لب، و نگاہ روز نہ چشم فراموش رہد، و گیتی بدیں روشنی روشن در نظر تیرہ و تار شد۔ بابے از سخن دوختہ، و چشمے از خوش فرستہ، ہماں جہاں شکستگی، و عالم عالم خستگی با خود گرفتہ، و از بیدار روزگار نالاں، و سینہ بر دم تیغ مالاں، کلکتہ رسیدم۔“

غرض کہ مرزا کی عمر کچھ کم چالیس برس کی تھی جبکہ وہ لکھنؤ ہوتے ہوئے کلکتے پہنچے۔ کلکتے میں انکو نے انکی بہت خاطر و مدارات کی اور ان کو کامیابی کی امید دلائی۔ اسٹرلنگ صاحب سکرٹری گورنمنٹ ہند نے جلی مرح میں مرزا کا فارسی قصیدہ انکے کلیات میں موجود ہے، وعدہ با کہ تمہارا حق ضرور تمکو ملے گا۔ کول برگ صاحب جو اس وقت دلی میں رزیدنٹ تھے انہوں نے دلی ہی میں مرزا سے عہدہ رپورٹ کرنے کا اقرار کر لیا تھا۔ ان امیدوں کے دھوکے میں یہ پورے دو برس کلکتے میں رہے، مگر آخر کار نتیجہ ناکامی کے سوا کچھ نہوا۔ گورنمنٹ نے سر جان مسلیم

دلی میں آنکے قیام کا زمانہ قریب پچاس برس کے معلوم ہوتا ہے۔ اس تمام مدت میں انھوں نے غالباً یہاں کوئی مکان اپنے لئے نہیں خریدا۔ ہمیشہ کرائے کے مکانوں میں رہا کیے۔ یا ایک مدت تک میاں کالے صاحب کے مکان میں بغیر کرائے کے رہے تھے۔ جب ایک مکان سے جی اگلیا یا اسے چھوڑ کر دوسرا مکان لے لیا۔ مگر قاسم جان کی گلی یا حبش خاں کے پھاٹک یا اس کے قریب جو اس کے سوا کسی اور ضلع میں جا کر نہیں رہے۔ سب سے اخیر مکان جس میں ان کا انتقال ہوا حکیم محمود خاں مرحوم کے دیوانخانے کے مقتل مسجد کے عقب میں تھا جسکی نسبت وہ کہتے ہیں۔

مسجد کے زیر سایہ اک گھر بنا لیا ہے یہ بندہ کیسہ ہمسایہ خدا ہے

جس طرح مرزا نے تمام عمر رہنے کے لیے مکان نہیں خریدا اسی طرح مطالعے کے لیے بھی۔ باوجودیکہ ساری عمر تصنیف کے شغل میں گزری۔ کبھی کوئی کتاب نہیں خریدی۔ الا ماشاء اللہ۔ ایک شخص کا یہی پیشہ تھا کہ کتاب فروشوں کی دکان سے لوگوں کو کرائے کی کتابیں لا دیا کرتا تھا، مرزا صاحب بھی ہمیشہ اسی سے کرائے پر کتابیں منگواتے تھے اور مطالعے کے بعد واپس کر دیتے تھے۔

ظاہر مرزا نے کوئی لمبا سفر کلکتے کے سوا نہیں کیا۔ اسی سفر کی آمد و رفت میں وہ چند ماہ لکھنؤ اور بنارس میں بھی پھڑے تھے۔ کلکتے جانے کا سبب یہ تھا کہ جب مرزا کے چچا نصر اللہ بیگ خاں نے وفات پائی تھی اس وقت مرزا کی عمر نو برس کی تھی اور ان کے بھائی کی عمر سات برس کی تھی۔ نصر اللہ بیگ خاں کی وفات کے بعد ان کے متعلقوں اور وارثوں کے لیے۔ جن میں مرزا اور ان کے بھائی بھی شریک تھے۔ جو نیشن گورنمنٹ نے ریاست فیروز پور جبرکہ پر حملہ کر دی تھی تنہا مرزا صغیر سن رہے جو کچھ وہاں سے ملتا رہا پاتے رہے۔ جب سن تیز کو پہنچے اور شادی بھی ہو گئی۔

لیا

مطالعہ

کلکتہ

اور بارہ دکاندار درمیان تھے۔ باری بڑی حویلی وہ ہے کہ بواب لکھی چند سیڑھیاں مولے لی ہیں
 اسی کے دروازے کی سلین بارہ دوی پر میری نشست تھی۔ اور پاس اُسکے ایک کشیا والی حویلی
 اور بیلہ شاہ کے تکیے کے پاس دوسری حویلی، اور کالے محل سے لگی ہوئی ایک اور حویلی، اور اُس سے
 آٹے بڑھار ایک کمرہ، کوہ لہریوں والا مشہور تھا۔ اور ایک کمرہ، کوہ کشمیر والا کہلاتا تھا۔ اس
 کمرے کے ایک کونے پر پٹنگ آڑا تھا، اور راجہ بیدان سنگھ سے پٹنگ لڑا کرتے تھے۔ وہ محل
 آٹ ایک سپاہی تھا، وہاں کا پیشہ مست رہتا تھا اور وہ کمرہوں کا کرایہ لگا کر تیج کر داتا تھا۔ وہاں
 تو سنو تو سی! تھا راجہ دارا بست کچھ پیدا کر لیا۔ علاقے مول لیے تھے اور زمیندار اپنا کر لیا تھا۔ تو
 یاد ہزار روپے کی سرکاری مالگہ لڑی کرتا تھا۔ آیا وہ سب کارخانے تھا، ہاتھ اُنہیں
 مال اندر دے تفصیل ملے، کچھ لکھو... اس خط کے مضمون سے معلوم ہوتا ہے کہ مرزا کے نانا کی
 آواز سے میں ایک خاصہ سرکار تھی جسکی بدولت اُنکے ملازم اور متوسلین دس دس بارہ ہزار کے
 مالدار بن گئے تھے۔ اور مرزا کا بچپن اور غنوان شباب بڑے اعلیٰ تلوں میں بسر ہوا تھا۔
 اہل دینی میں سے جن لوگوں نے مرزا کو جوانی میں دیکھا تھا ان سے سنا گیا ہے کہ غنوان شباب
 میں وہ شہر کے نہایت حسین و خوش رو لوگوں میں شمار کیے جاتے تھے۔ اور بڑھاپے میں بھی۔ جبکہ
 راقم نے پہلی ہی بار اُن کو دیکھا ہے۔ حسانت اور خوبصورتی کے آثار اُن کے چہرے اور قد و قامت
 اور ڈیل ڈول سے نمایاں طور پر نظر آتے تھے۔ مگر اخیر عمر میں قلب خوراک اور امراض دائمی کے
 سبب وہ نہایت نحیف و زار و زار ہو گئے تھے۔ لیکن چونکہ ہاڑ بہت چکلا قد کشیدہ اور ہاتھ پانوں بڑے
 تھے اس حالت میں بھی وہ ایک نو دار و تورانی معلوم ہوتے تھے۔

۱۶

اچونکہ مرزا کے چچا کا رشتہ نواب فخر الدولہ کے خاندان میں ہو چکا تھا اور اس لئے اُن کے خاندان سے ایک نوع کا تعلق پیدا ہو گیا تھا؛ مرزا کی شادی نواب فخر الدولہ کے چھوٹے بھائی مرزا آہی بخش خان معروف کے ہاں قرار پائی۔ اور جیسا کہ مرزا نے ایک رقعہ میں اشارہ کیا ہے۔ تیرہ برس کی عمر میں ۱۰۰۰ رجب ۱۲۳۰ ہجری۔ کو اُن کا عقد ہو گیا۔ اس تقریب سے اُن کی آمد و رفت دہلی میں زیادہ ہو گئی۔ اور آخر کار یہیں سکونت اختیار کر لی اور اخیر عمر تک دہلی ہی میں رہے۔

مرزا کے نانا کی جاگہ پر مرزا نے

مرزا کے نانا کی جاگیر میں متحدہ دیہات اور آگرہ شہر میں بہت بڑی املاک تھیں۔ وہ منشی شیونرائے
رئیس آگرہ کو ایک خط میں لکھتے ہیں "میں کیا جانتا تھا کہ تم کون ہو۔ جب یہ جانا کہ تم ناظر بنی دھر کے
پوتے ہو تو معلوم ہوا کہ میرے فرزند و لبند ہو۔ اب تم کو مشفق و مکرّم لکھوں تو گنگار۔ تلکو ہمارے
خاندان اور اپنے خاندان کی آمیزش کا حال کیا معلوم؟ مجھے سنو! تمہارے پردادا عہدِ نجف خاں
میں میرے نانا صاحب مرحوم خواجہ غلام حسین خاں کے رفیق تھے۔ جب میرے نانا نے نوکری
ترک کی، اور گھر بیٹھے، تو تمہارے پردادائے بھی مکرکھو لدی اور پھر کہیں نوکری نہ کی۔ یہ باتیں میرے
ہوش سے پہلے کی ہیں۔ مگر جب میں جوان ہوا تو میں نے یہ دیکھا کہ منشی بنی دھر خاں صاحب کے
ساتھ ہیں؛ اور انھوں نے جو کیتھم گانا اپنی جاگیر کا سرکار میں دعویٰ کیا ہے تو بنی دھر اس امر
کے متصرّم ہیں؛ اور وکالت اور مختاری کرتے ہیں۔ میں اور وہ ہم عمر تھے۔ شاید منشی بنی دھر
مجھے ایک دو برس بڑے ہوں یا چھوٹے ہوں۔ اُنیں "میں" برس کی میری عمر اور ایسی ہی عمر
اُن کی؛ یا ہم شطرنج اور اختلاط اور محبت؛ آدمی آدمی رات گزر جاتی تھی؛ چونکہ گھر اُن کا بہت دور
نہ تھا اس واسطے جب چاہتے تھے چلے جاتے۔ بس ہمارے اور اُن کے مکان میں چھپیا رہی کا گھر

نمبر پنجم بجاں در ہزار و سبت و دہشت ظہور خسرو سعدی پیشکش صد و پنجاہ

ملا عبد الصمد علاوہ فارسی زبان کے جو اسکی مادری زبان اور اسکی قوم کی مذہبی زبان تھی۔ عربی زبان کا بھی۔ جیسا کہ مرزا نے لکھا ہے۔ بہت بڑا فاضل تھا۔ اگرچہ مرزا کو اسکی صحبت بہت کم میسر آئی؛ مگر مرزا جیسے جو ہر قابل کو صغیرین میں ایسے شفیق، کامل، اور جامع اللسانین استاد کا بل جانا اُن نوادر اتفاقات میں سے تھا جو بہت کم واقع ہوتے ہیں۔ اگرچہ مرزا کو اُس سے زیادہ مستفید ہونے کا موقع نہیں ملا؛ مگر اسکی فیض صحبت نے کم سے کم وہ ملکہ ضرور مرزا میں پیدا کر دیا تھا جسکی نسبت کہا گیا ہے کہ ”اگر حاصل شود خواندہ و ناخواندہ برابریست؛ و اگر حاصل نشود ہم خواندہ و ناخواندہ برابر“ معلوم ہوتا ہے کہ مرزا کی حُسنِ قابلیت اور حُسنِ استعداد نے ملا عبد الصمد کے دل پر گہرا نقش بٹھا دیا تھا کہ یہاں سے چلے جانے کے بعد بھی وہ مدت تک مرزا کو نہیں بھولا۔ نواب مصطفیٰ خاں مرحوم کہتے تھے کہ ملا کے ایک خط میں جو اُس نے مرزا کو کسی دوسرے ملک سے بھیجا تھا یہ فقرہ لکھا تھا ”اے عزیز چہ کسی؟ کہ با ایں ہمہ آزاد ہیا گاہ گاہ بخاطر مے گزری“، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ دؤر برس کے قلیل عرصے میں وہ مرزا کو سکھا سکتا تھا اُس میں ہرگز معنیاتیہ نہ کیا ہو گا اور جیسا کہ قاطع یرہان اور درفش کاویانی کے دیکھنے سے ظاہر ہوتا ہے اُس نے تمام فارسی زبان کے مقدم اُصول اور گہراور پارسیوں کے مذہبی خیالات اور اسرار جنگو فارسی زبان کے سمجھنے میں بہت بڑا دخل ہے اور پارسی و سنسکرت کا متحدہ الاصل ہونا اور اسی قسم کی اور ضروری باتیں مرزا کے دل میں بوجہ اوتنے تہ نشین کر دی تھیں۔

عبدالصمد رکھا گیا ؛ غالباً اگرے میں سیا حانہ وارد ہوا ؛ جو کہ دو برس تک مرزا پاس اول لکڑے میں اور پھر دلی میں مقیم رہا ؛ میرزا نے اُس سے فارسی زبان میں کسی قدر بصیرت پیدا کی ۔ اگر کچھ بھی کبھی مرزا کی زبان سے یہ بھی سنا گیا ہے کہ ”مجھ کو مبداء قیاض کے سوا کسی سے تلمذ نہیں ہے ؛ اور عبدالصمد محض ایک فرضی نام ہے ۔ چونکہ مجھ کو لوگ بے استاد کہتے تھے اُن کا منہ بند کرنے کو میں نے ایک فرضی استاد گھڑ لیا ہے “ مگر اس میں شک نہیں کہ عبدالصمد فی الواقع ایک پارسی نژاد آدمی تھا اور مرزا نے اُس سے کم و بیش فارسی زبان سیکھی تھی ۔ چنانچہ مرزا نے جابجا اُسکے تلمذ پر اپنی تحریروں میں فخر کیا ہے اور اُسکو بلفظ پیٹمبار جو پارسیوں کے ہاں نہایت تعظیم کا لفظ ہے یاد کیا ہے ۔ لیکن جیسا کہ مرزا نے اپنی بعض تحریروں میں تصریح کی ہے ۔ مرزا کی چوڑا برس کی عمر تھی جب عبدالصمد اُن کے مکان پر وارد ہوا ہے اور کل دو برس اُس نے وہاں قیام کیا ۔ پس جب یہ خیال کیا جاتا ہے کہ مرزا کو کس عمر میں اُسکی صحبت میسر آئی ، اور کس قدر قلیل مدت اُسکی صحبت میں گزری ؛ تو عبدالصمد اور اُسکی تعلیم کا عدم وجود برابر ہو جاتا ہے ۔ اس لیے مرزا کا یہ کہنا کچھ غلط نہیں ہے کہ مجھ کو مبداء قیاض کے سوا کسی سے تلمذ نہیں ہے ۔

ایک جگہ مرزا نے مبداء قیاض سے مستفید ہونے کا مضمون نہایت عمدگی سے باندھا ہے اور وہ شعر یہ ہے

انچہ در مبداء قیاض بود آن من ست گل جدا ناشدہ از شاخ بدامان من ست

ایک اور مقام پر اس سے بھی عمدہ طریقے سے یہ مطلب ادا کیا ہے ۔ وہ کہتے ہیں

باخذ فیض ز مبداء خرد نم از اسلاف کہ بودہ ام قدرے دیر تر در اں درگاہ

فن آبا سے ماکشا ورزیست مرزباں زادہ سمر قندیم
 ورز معنی سخن گزار دہ خود چہ گویم تاحپہ و چنہ ریم
 فیض حق را کیسہ شاگردیم عقل کل را ہیستہ فرزندیم
 ہم یہ تابش بہ برق ہمنقسیم ہم یہ بخشش بہ ابرمانندیم
 بہ تلاشے کہ ہست فیروزیم بوحاشے کہ نیست خرسندیم
 ہمسہ بر خویشین ہمنے کریم ہمسہ بر روزگار می خندیم

قطبہ

ساقی! چو من پشنگی و افزایسیم دانی کہ اہل گوہرم ازدودہ جمست
 میراث جم کہنے بود اکنوں بن سپار زیں پس رسد بہشت کہ میراث آدمست

رباعی

غالب بہ گرز دودہ زاد ششم ناں رو بھقای دم تیخت دم
 چوں رفت پہبیدی ز دم چنگ لشعر شد تیر شکستہ نیاگاں تسلیم

مرزا غالب مع اپنے چھوٹے بھائی کے بہن شعور تک آگرے ہی میں رہے؛ اگرچہ سائت برس
 کی عمر سے وہ دہلی میں آنے جانے لگے تھے لیکن شادی کے بعد تک انکی مستقل سکونت آگرے ہی میں
 رہی اور شیخ معظم جو اس زمانے میں آگرے کے نامی معلموں میں سے تھے ان سے تعلیم پاتے رہے۔ اسکے
 بعد ایک شخص پارسى نژاد جسکا نام آتش پرستی کے زمانے میں ہر طرف تھا اور بعد مسلمان ہونے کے

ہم چنگ از سایہ کے باب کا نام ہے ۱۱ * زاد تم از سایہ کے دادا اور چنگ کے باب کا نام ہے

ایک کے لشکر میں شامل ہوئے، تو انھوں نے مرزا غالب کے چچا نصر اللہ بیک خان کو اس سے
 بے موصوف کی ہمشیر منسوب تھیں۔ سرکاری فوج میں بعدہ رسالہ داری ملازم کر دیا۔ ان کی ذات اور
 متخواہ میں دو پگنے یعنی سونگ اور سونسا۔ جو فوج اگر وہ میں واقع ہیں۔ سرکار سے ان کے نام پر مقرر
 ہو گئے۔ جب تک وہ زندہ رہے دونوں پگنے ان کے نامزد رہے؛ اور ان کی وفات کے بعد ان کے وارث

اور متعلقوں کی پیشین سرکار نے فیروز پور جھڑکی کی ریاست سے مقرر کر دیں جس میں سے سات سو پست
 سالانہ مرزا کو آخر اپریل ۱۸۵۷ء تک برابر ملتا رہا۔ گنج دہلی کے بعد تین برس تک قلعے کے تعلقات کے
 سبب یہ پیش بند رہی۔ آخر جب مرزا کی ہر طرح سے بریت ہو گئی تو پیش پھر جاری ہو گئی؛ اور تین برس کی
 واصلات بھی سرکار نے عنایت کی۔ جب تک پیش بند رہی مرزا کے دوستوں کو نہایت تعلق خاطر رہا۔
 اکثر لوگ پیش کا حال دریافت کرنے کو خط بھیجتے تھے۔ ایک دفعہ میر ہمدی نے اسی مضمون کا خط بھیجا
 تھا؛ اس کے جواب میں مرزا صاحب لکھتے ہیں ”میاں بے رزق جیسے کا وہب مجھ کو لگایا ہے؛ اس طرح سے
 خاطر جمع رکھنا۔ رمضان کا مہینہ روزے کھا کھا کر کاٹا؛ خدا نازاق ہے؛ کچھ اور کھانے کو نہ ملا تو غم تو ہے“
 مرزا نے اپنے علو خاندان پر جابجا فارسی اشعار میں فخر کیا ہے چونکہ ان میں سے بعض اشعار لطفت
 سے خالی نہیں اس لیے اس مقام پر نقل کیے جاتے ہیں۔ قطعہ

لا جسم در نسب فرہ مندیم

پسترگان قوم پیو ندیم

در تمامی زمانہ چن ندیم

غالب از خاک پاک تو را نیسم

ترک زادیم و دوزخ را دہم

ایکیم از جماعۃ اتراک

آجے چاند کو ادبیک کامل اور بزرگ کو کہتے ہیں پس ایک کے سنی ماہ تمام دوزخ کے

تمام عمر سسرال میں بسر کی؛ اور اُن کی اولاد نے بھی وہیں پرورش پائی۔ مرزا عبداللہ بیگ خاں کے دو بیٹے ہوئے؛ ایک مرزا اسد اللہ خاں؛ اور دوسرے میرزا یوسف خاں۔ جو ایام شباب میں عینون ہو گئے تھے اور اُسی حالت میں شہنشاہ میں انتقال کیا۔

مرزا کے والد عبداللہ بیگ خاں۔ جیسا کہ مرزا نے خود ایک خط میں لکھا ہے۔ اول لکھنؤ میں جا کر نواب اصفت الدولہ کے ہاں نوکر ہوئے؛ اور چند روز بعد وہاں سے حیدرآباد پہنچے؛ اور سرکارِ صفی میں تین سو سوار کی جمیت سے کئی برس تک ملازم رہے۔ مگر وہ نوکری ایک خانہ جنگی کے بکھیرے میں جاتی رہی؛ اور وہ واپس آگے میں چلے آئے۔ یہاں آکر انہوں نے اور کا قصد کیا۔ راجہ پنجا در سنگھ نے ابھی اُنکو کوئی خاطر خواہ نوکری نہیں دی تھی کہ اتفاق سے انھیں دنوں میں ایک گودھی کے زینداران سے پھر گئے۔ جو فوج اُس گودھی پر سرکوبی کے لیے بھیجی گئی اُسکے ساتھ مرزا عبداللہ بیگ خاں کو بھی بھیجا گیا تھا۔ وہاں پہنچتے ہی اُن کے گولی لگی اور وہیں اُنکا انتقال ہو گیا؛ اور راج گدھ میں دفن ہوئے۔ راجہ پنجا در سنگھ رئیس اور نے دو گانوسیر حاصل اور کسی قدر روزینہ مرزا مرحوم کے دو نو لڑکوں کی پرورش کے واسطے مقرر کر دیا؛ جو ایک مدتِ دراز تک جاری رہا۔ مرزا کے والد کی وفات کے بعد اُنکے چچا نصر اللہ بیگ خاں نے اُنکو پرورش کیا۔

جب سرکارِ انگریزی کی عملداری ہندوستان میں اچھی طرح قائم ہو گئی، اور نواب فخر اللہ احمد شاہ خاں

مہر مرزا نے جو قصیدہ راجہ شیرو حیان سنگھ کی طرح میں لکھا ہے، میں لکھتے ہیں

در پُنبائی شدہ ام چاکر حضورؐ رنگیں سن ملازم و دریں غلیفہ خوارؐ و دامِ گُوشِ حلقہ بڑچاہہ پشت سالؐ اکنوں کہ غمِ نصرت و رسالؐ سچ شمارؐ
باز شنیہ رازِ زامیان بارگاہ۔ باز شنیہ تھنہ زپیلان آں دیا رت۔ کانی بود مشاہدہ شاہِ غرورِ نصرت۔ در خاکِ راج گدھ پر ہم را بود مرزا ۱۲

اور سلجوقی خاندان میں ایک زبردست سلطنت کی بنیاد قائم ہو گئی۔ کئی سو برس وہ تمام ایران و توران و شام و روم (یعنی ایشیائے کوچک) پر حکمراں رہے۔ آخر ایک مدت کے بعد سلجوقیوں کی سلطنت کا خاتمہ ہوا، اور سلجوق کی اولاد جابجا منتشر و پراگندہ ہو گئی۔ انہیں میں سے ترسم خاں نام ایک میرزا دے نے سمرقند میں بودوباش اختیار کر لی تھی۔ مرزا کے دادا جو شاہ عالم کے زمانے میں سمرقند سے ہندوستان میں آئے وہ اسی ترسم خاں کی اولاد میں تھے۔ مرزا ہرنیروز کے دیباچے میں لکھتے ہیں ”ازد اسپان این قافلہ نیاسے من کہ در قلمرو ماوراء النہر سمرقند شہر مسقط الرأس دے بود۔ چوں سل کہ از بالا بیستی آید از سمرقند بند آمد،“ اور درفش کاویانی میں اس طرح لکھا ہے ”بالجملہ سلجوقیاں بعد از ولایت دولت و برہم خوردن ہنگامہ سلطنت در اقلیم وسیع الفضای ماوراء النہر پراگندہ شدند۔ از اس حلیہ سلطان ترسم خاں کہ از تخمہ اویم سمرقند را بہر اقامت گزید۔ تا در عہد سلطنت شاہ عالم نیاسے من سمرقند بند آمد“ مرزا کے دادا کی زبان بالکل ترکی تھی، اور ہندوستان کی زبان بہت کم سمجھتے تھے۔ اس زمانے میں ذوالفقار الدولہ مرزا بخت خاں شاہ عالم کے دربار میں دخل کئی رکھتے تھے۔ بخت خاں نے مرزا کے دادا کو سلطنت کی حیثیت کے موافق ایک عمدہ منصب دلوا دیا اور پہا سو کا سیر حاصل پر گنہ ذات اور رسالے کی تنخواہ میں مقرر کر دیا۔ انکے کئی بیٹے تھے جن میں سے دو کے نام معلوم ہیں؛ ایک مرزا کے باپ عبد اللہ بیگ خاں عرف میرزا دولہا اور دوسرے نصر اللہ بیگ خاں۔ عبد اللہ بیگ خاں کی شادی خواجہ غلام حسین خاں کمیدان کی بیٹی سے ہوئی تھی؛ جو کہ سرکار میرٹھ کے ایک معزز فوجی افسر اور عمائد شہر آگرہ میں سے تھے۔ مرزا عبد اللہ بیگ خاں نے بطور خانہ داماد کے اپنی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

آغاز کتاب

میرزا اسد اللہ خان غالب المعروف بہ میرزا نوشہ، مخاطب بہ نجم الدولہ دہلیہ الملک اسد اللہ خان بہادر نظام جنگ، المتخلص بہ غالب در فارسی نو اسد در ریختہ؛ شب ہشتم ماہ رجب سال ۱۲۸۷ ہجری کو شہر آگرہ میں پیدا ہوئے۔ مرزا کے خاندان اور اصل و گوہر کا حال۔ جیسا کہ انھوں نے اپنی تحریروں میں جا بجا ظاہر کیا ہے۔ یہ ہے کہ ان کے آباؤ اجداد ایک قوم کے ترک تھے؛ اور ان کا سلسلہ نسب اپنے فریدوں تک پہنچتا ہے۔ جب کیانی تمام ایران و توران پر مسلط ہو گئے، اور تورانیوں کا جاہ و جلال دنیا سے رخصت ہو گیا؛ تو ایک مدت دراز تک تور کی نسل ملک و دولت سے بے نصیب رہی۔ مگر تلوار کبھی ہاتھ سے نہ چھوٹی؛ کیونکہ ترکوں میں قدیم سے یہ قاعدہ چلا آتا تھا کہ باپ کے متروکہ میں سے بیٹے کو تلوار کے سوا اور کچھ نہ ملتا تھا؛ اور کل مال و اسباب اور گھربا بیٹی کے حصے میں آتا تھا۔ بارہ ایک مدت کے بعد اسلام کے عہد میں اسی تلوار کی بدولت ترکوں کے بخت بختہ نے پھر کر دٹ بدلی؛

دل مردہ سو سائے کے لیے کچھ کم ضروری نہیں ہے۔ اسکے سوا ہر قوم میں عموماً، اور گری ہوئی قوموں میں خصوصاً، ایسے عالی فطرت انسان شاذ و نادر پیدا ہوتے ہیں جنکی ذات سے (اگرچہ قوم کو براہِ راست کوئی معتد بہ فائدہ نہ پہنچا ہو) لیکن کسی علم یا صنعت یا طریقہ پر کوئی حقیقی اضافہ کم و بیش ظہور میں آیا ہو، اور سلف کے ذخیرے میں کچھ نیا سرمایہ شامل ہوا ہو۔ ایسے لوگوں کی لائف پر غور کرنا، اُنکے دیکس میں چھان بین کرنی، اور اُنکے نوادرات و افکار سے مستفید ہونا، قوم کے اُن فرائض میں سے ہے جن سے غافل رہنا قوم کے لیے نہایت افسوس کی بات ہے۔ جیسا کہ خود مرزا ایک جگہ لکھتے ہیں ”حیف کہ ابنائے روزگار حسنِ گفتار، مرا نشناختند۔ مرا خود دل بر آناں می سوزد کہ کامیاب شناسائی فرہ ایزدی گشتند، و انیس نہایشمای نظر فردر کہ در نظم و شریکار بر بردہ ام۔ سرگراں گذشتند۔“

جو لوگ شعر کی سمجھ اور اس کا عمدہ مذاق رکھتے ہیں؛ ان کو بغیر اسکے کہ تمام کلیات پر نظر ڈالنے کی ضرورت ہو۔ مرزا کا ہر قسم کا عمدہ کلام ایک جگہ جمع کیا ہوا بل جا میگا۔ دوسرے جو لوگ مرزا کا کلام اچھی طرح نہیں سمجھ سکتے وہ۔ بسبب اسکے کہ ہر شکل شعری فقرے کے معنی حل کر دیے گئے ہیں۔ مرزا کے خیالات سے بخوبی واقفیت حاصل کر سکیں گے۔ اور دونوں طبقوں کو معلوم ہو جائیگا کہ مرزا نے قوتِ تخیل اور ملکۂ شاعری کس درجے کا پایا تھا؛ اور کس خوبی اور لطافت سے وہ نہایت نازک اور دقیق خیالات کو اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں ادا کرنے کی قدرت رکھتے تھے۔

الغرض یہ رسالہ دو حصوں پر تقسیم کیا گیا ہے؛ پہلے حصے میں مرزا کی زندگی کے واقعات۔ جہاں تک کہ معلوم ہو سکے۔ اور ان کے اخلاق و عادات و خیالات کا بیان ہے۔ انہیں حالات کے عین میں ان کی خاص خاص نظمیں یا اشعار جو کسی واقعے سے علاقہ رکھتے ہیں، اور ان کے لطائف و نوادر جن سے مرزا کی طبیعت کا اصلی جوہر اور ان کی تمیز و تخیل کی قوت نہایت واضح طور پر ظاہر ہوتی ہے۔ اپنے اپنے موقع پر ذکر کیے گئے ہیں۔ دوسرے حصے میں مرزا کے تمام کلام نظم و نثر اردو اور فارسی کا انتخاب؛ اور ہر قسم پر جدا جدا اور آخر میں مرزا کے کسی قدر کلام کا موازنہ ایران کے بعض مسلم الشہوت استادوں کو کلام کے ساتھ کیا گیا ہے؛ خاص کتاب پر ایک مختصر ریویو مرزا کی تمام لائف اور ان کی طرزِ شاعری و انشا پردازی پر لکھا گیا ہے؛ جسکو ساری کتاب کا لب لباب سمجھنا چاہیے۔

اگرچہ مرزا کی لائف۔ جیسا کہ ہم آئندہ کسی موقع پر بیان کر نیگے۔ اُن فائدوں سے خالی نہیں ہے جو ایک بائوگرافی سے حاصل ہونے چاہئیں، لیکن اگر ان فائدوں سے قطع نظر کیا جائے تو بھی ایک ایسی زندگی کا بیان جس میں ایک خاص قسم کی زندہ دلی اور شگفتگی کے سوا کچھ نہ ہو۔ ہماری پڑمردہ اور

کلام کی حقیقت سے اہل وطن کو خبردار کیا جاتا۔ مگر یہ طریقہ جس قدر مصنف کے حق میں دشوار گزار تھا اسی قدر پبلک کے لیے خاصکر اس زمانے میں غیر مفید بھی تھا؛ اگر ہم اس دشوار گزار منزل کے طے کرنے میں کامیاب بھی ہو جاتے تو ہماری وہی مثل ہوتی کہ دوسری اپنی جان سے گئی اور کھانیہ لوگوں کو کچھ فائدہ آیا۔ ناچار ہم نے بجائے طریقہ مذکور کے جو حالت موجودہ میں باوجود دشوار ہونے کے غیر مفید بھی ہے اس موقع پر ایک ایسا طریقہ اختیار کیا ہے جو ہمارے لیے سہل تر اور پبلک کے لیے مفید تر معلوم ہوتا ہے۔

ہم نے دوسرے حصے میں مرزا کے تمام کلام کو چار قسموں پر تقسیم کیا ہے؛ نظم اردو، نثر اردو، نظم فارسی اور نثر فارسی۔ اور اسی ترتیب سے ہر قسم کا تھوڑا تھوڑا انتخاب چار جدا جدا فصلوں میں درج کیا ہے۔ ہر قسم پر اقل کچھ مختصر برکاس کیے ہیں۔ پھر اس قسم کا انتخاب لکھا گیا ہے۔ اور جو اشعار یا فقرے شیعہ طلبہ کے پس منظر میں آئی جا بجا شرح بھی کر دی گئی ہے۔ اور کہیں کہیں محاسن کلام کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے۔ اور آخر میں خاصکر ان لوگوں کے لئے جو فارسی لٹریچر کا صحیح مذاق رکھتے ہیں۔ نمونے کے طور پر مرزا کے کسی قدر فارسی کلام کا موازنہ ایران کے مسلم الثبوت استادوں کے کلام کے ساتھ کر کے دکھایا ہے کہ مرزا نے فارسی لٹریچر میں کس درجے تک کمال ہم پہنچایا تھا۔

مذکورہ بالا انتخاب سے ہماری یہ مراد نہیں ہے کہ مرزا کے کلام میں جس قدر بلند اور پاکیزہ خیالات تھے وہ سب لے لئے گئے ہیں؛ اور جو ان سے پست درجے کے خیالات تھے وہ چھوڑ دیے گئے ہیں؛ نہیں۔ بلکہ یہ مطلب ہے کہ اس رسالے کی مبادی اور وسعت کے موافق تا بقدر ہر ایک صنف میں سے کم و بیش ایسا کلام لے لیا گیا ہے جو اس زمانے کے لوگوں کے مذاق سے بیگانہ اور ان کی فہم سے بعید تر نہ ہو؛ اور جو اس کے مولف کی نظر میں بھی بوجہ حسن الوجہ انتخاب کے قابل ہو۔

اس انتخاب سے جسکو مرزا کے تمام کلام کا نمونہ سمجھنا چاہیے کئی فائدے تصور کیے گئے ہیں۔ ایک یہ کہ

اکثر معصر ادا می ہر وی کو اُسپر ترجیح دیتے تھے ؛ مگر کچھ بہت عرصہ نہ گزرا تھا کہ سعدی کا نام اور اُسکا کلام اطرافِ عالم میں منتشر ہو گیا ؛ اور ادا می کا کلام صرف تذکروں میں باقی رہ گیا۔ تشکیسیر کے قلم سے انکو ایک ایکٹرس سے زیادہ رتبہ نہیں دیا گیا، مگر آج اُسی تشکیسیر کے در کس بائبل کے ہم پلہ سمجھے جاتے ہیں۔ خود مرزا بھی اپنے کلام کی نسبت ایسا ہی خیال رکھتے تھے۔ چنانچہ ایک فارسی غزل میں فرماتے ہیں :-

تا زدیو انم کہ سرست سخن خواہ شدن ؛ ایں غی از قحطِ خریداری کہن خواہ شدن
گو کہم را در عدم افوج قبولے بودہ است شہرتِ شعرم بہ گیتی بعد من خواہ شدن

اگرچہ اس لحاظ سے کہ ایشیائی شاعری کا مذاق یورپین سولریشن میں روز بروز جذب ہوتا جاتا ہے اور فارسی لٹریچر ہندوستان سے ایسا رخصت ہوا ہے کہ بظاہر اُسکے مراجعت کرنے کی توقع نہیں رہی۔ یہ امید رکھتی تو فضول ہے کہ مرزا کی فارسی نظم و نثر آت یا آئندہ زمانے میں مقبولِ خاص و عام ہوگی ؛ لیکن جو تُو بر تُو پر دے مرزا کی شاعری اور نکتہ پردازی پر انکی زندگی میں پڑے رہنے اور جواب تک مرفوع نہیں ہوے ؛ کیا عجیب ہے کہ ہماری یا ہمارے بعد کسی دوسرے شخص کی کوشش سے رفع ہو جائیں۔ مرزا کو بحیثیت شاعری پہلے سے روشناس کرنے اور انکی شاعری کا پایہ لوگوں کی نظر میں جلوہ گر کرنے کا عمدہ طریقہ یہ تھا کہ اُنکے اصنافِ کلام میں سے ایک معتد بہ حقہ نقل کیا جاتا، ہر صنف میں جو باتیں مرزا کی خصہ صیات سے ہیں وہ بیان کی جاتیں، جو کلام نقل کیا جاتا اُسکی لفظی و معنوی خوبیاں، تراکیب، اور باریکیاں ظاہر کی جاتیں، شعرا کے جس طبقے میں مرزا کو جگہ دینی چاہیے اُس طبقے کے شاعروں کے کلام سے مرزا کے کلام کا موازنہ کیا جاتا، اُنکی غزل سے مرزا کی غزل کو، قصیدے سے قصیدے کو، اور اسی طرح ہر صنف سے اُسی صنف کو ٹکرایا جاتا، اور اس طرح مرزا کے پایہ شاعری اور اُنکے

جمع کی گئی ہیں؛ اور جو تھوڑی سی توجہ سے مرتب ہو سکتی ہیں۔ انکواب زیادہ حالات منظر میں رکھنا مناسب نہیں
میں نے ان مٹھوں کو کھولا اور ان یادداشتوں کے مرتب کرنے کا ارادہ کیا؛ مگر ان کے دیکھنے سے
معلوم ہوا کہ مرزا کی تصنیفات پر پھر ایک نظر ڈالنے کی ضرورت ہوگی؛ اور اسکے سوا کچھ اور کتابیں بھی
درکار ہونگی۔ میں نے دلی کے بعض بزرگوں اور دوستوں کو لکھا اور انھوں نے مہربانی فرما کر میری
تمام مطلوبہ کتابیں اور جس قدر مرزا کے حالات انکو معلوم ہو سکے لکھ کر میرے پاس بھیج دیے؛ اور
اس طرح مرزا کی لائف جہاں تک کہ اسکی تکمیل ہو سکتی تھی مکمل کی گئی۔

میں اوپر لکھ چکا ہوں کہ مرزا کی لائف میں کوئی منوۃ بالشان واقعہ انکی شاعری و انشا پردازی
کے سوا نظر نہیں آتا۔ لہذا جس قدر واقعات انکی لائف کے متعلق اس کتاب میں مذکور ہیں انکو غنمی اور
استطراوی سمجھنا چاہیے۔ اصل مقصود اس کتاب کے لکھنے سے شاعری کے اس عجیب و غریب نلکہ کا
لوگوں پر ظاہر کرنا ہے جو خدا تعالیٰ نے مرزا کی فطرت میں ودیعت کیا تھا؛ اور جو کبھی نظم و نثر کے پیرائے
میں، کبھی ظرافت اور بزدلہنخی کے روپ میں، کبھی عشق بازی اور رند مشربی کے لباس میں، اور
کبھی تصوف اور حُب الہییت کی صورت میں ظہور کرتا تھا۔ پس جو ذکر ان چاروں باتوں سے علاوہ نہیں
رکھتا اسکو کتاب کے موضوع سے خارج سمجھنا چاہیے۔

لطریری دنیا میں بہت سے صاحب کمال ایسے گزرے ہیں جنکے زمانے میں انکی قدر و منزلت کا پورا
پورا اندازہ نہیں کیا گیا؛ مگر آخر کار ان کا کمال ظاہر ہوئے بغیر نہیں رہا۔ سعدی کے زمانے میں اسکے

۴ یعنی نواب سعید الدین احمد خاں خلعت الصدق نواب ضیاء الدین احمد خاں مرحوم اور سید اکبر مرزا و سید مظفر مرزا بابر نواب
حسام الدین حمید رخاں مرحوم اور میر محمد حسین مجروح اور لالہ بیاری لال شتاق ۱۱

آئی لیکر دوست کی خریداری کو مسر کے بازار میں آئی تھی۔ سچ یہ ہے کہ مرزا کی قدر جیسی کہ چاہیے یا جلال الدین
اکبر کرتا؛ یا جہانگیر و شاہ جہاں؛ مگر جس قدر اس اخیر دور میں اُنکو مانا گیا اُسکو بھی نہایت مغتنم سمجھنا چاہیے۔
یہی نفٹ بیاں ہم زمانے کے ہمتوں یہ دیکھا تو تھی یہ بھی قیمت زیادہ
اگرچہ مرزا کی تمام لائف میں کوئی بڑا کام اُنکی شاعری اور انشا پر دہلی کے سوا نظر نہیں آتا۔ مگر صرف
اسی ایک کام نے اُنکی لائف کو دار الحکومت کے اخیر دور کا ایک نمونہ نشان واقعہ بنا دیا ہے اور میرا خیال ہے
کہ اس ملک میں مرزا پر فارسی نظم و نثر کا خاتمہ ہو گیا ہے؛ اور اردو نظم و نثر پر بھی اُنکا کچھ کم احسان نہیں ہے؛
اسی لیے کبھی کبھی مجھکو اس بات کا خیال آتا تھا کہ مرزا کی زندگی کے عام حالات جس قدر کہ معتبر ذریعوں سے
معلوم ہو سکیں اور اُنکی شاعری و انشا پر دہلی کے متعلق جو امور کہ احاطہ بیان میں آسکیں اور انسانی ناں
کی نعم سے بالاتر ہوں؛ اُنکو اپنے سلیقے کے موافق تقلید کر دوں۔

پچھلے برسوں میں جبکہ میں دہلی میں مقیم تھا۔ بعض اصحاب کی تحریک سے اس خیال کو اور زیادہ تقویت
دہی۔ میں نے مرزا کی تصنیفات کو دوستوں سے مستعار لیکر جمع کیا؛ اور جس قدر اُس میں اُنکے حالات
اور اخلاق و عادات کا سہرا ملایا اُنکو تقلید کیا؛ اور جو باتیں اپنے ذہن میں محفوظ تھیں یا دوستوں کی زبانی
معلوم ہوئیں۔ اُنکو بھی غلط تحریر میں لایا۔ مگر ابھی ترتیب مضامین کی نوبت نہ پہنچی تھی کہ اُنور کاموں میں
مصرف ہو گیا؛ اور کئی برس تک تمام یادداشتیں کاغذ کے ٹکٹوں میں بندھی ہوئی رکھی رہیں۔

ان دنوں میں دوستوں کا پتہ تقاضا اور بہت سخت تقاضا ہوا اور باوجودیکہ میں ایک نہایت اہم
اور ضروری کام میں مصروف تھا۔ دوستوں کے تقاضے نے یہاں تک مجبور کیا کہ اُس ضروری کام کو
چند روز کے لیے ملتوی کرنا پڑا؛ اور یہ خیال کیا گیا کہ جو یادداشتیں مرزا کی لائف کے متعلق بڑی کوشش سے

کیونکہ جس سانچے میں وہ ڈھلے تھے وہ سانچا بدل گیا؛ اور جس ہوا میں انھوں نے نشوونما پائی تھی وہ ہوا پلٹ گئی۔

زمانہ دگرگوںہ آئیں نہاد شد آں مرغ کو بیغہ ز تریں نہاد

علی الخصوص مرزا اسد اللہ خاں غالب جنگی عظمت و شان اس سے بالاتر تھی کہ انکو بارہویں یا تیرہویں صدی ہجری کے شاعروں یا انشا پردازوں میں شمار کیا جائے۔

مرزا نے اپنی کتاب ”پہر نیروز“ میں ایک موقع پر بہادر شاہ کی طرف خطاب کر کے یہ ظاہر کیا ہے کہ ”شاہجہاں کے عہد میں کلیم شاعر کو سیم و زر میں تو لاگیا تھا؛ مگر میں صرف اس قدر چاہتا ہوں کہ اور کچھ نہیں تو میرا کلام ہی ایک دفعہ کلیم کے کلام کے ساتھ تول لیا جائے“ اس مضمون کو جو لوگ مرزا کے رُتبے سے واقف نہیں ہیں شاید خود ستانی اور تعلی پر محمول کر نیگیے؛ مگر ہمارے نزدیک مرزا نے اس میں کچھ بھی مبالت نہیں کیا؛ بلکہ بالکل وہی کہا ہے جو ان کے زمانے کے اہل نظر اور اہل تہذیب انکی نسبت اسے رکھتے تھے۔

اگرچہ زمانے نے اپنی بساط کے موافق مرزا کی کچھ کم قدر نہیں کی؛ اُن کا تمام کلام؛ اردو، فارسی، نظم، اور نثر انکے جیتے ہی جی اطراف ہندوستان میں پھیل گیا تھا؛ انکے ماننے والے اور مدح و ثنا خواں ملک کے ہر گوشے میں پائے جاتے تھے اور اب تک پائے جاتے ہیں؛ مدحیہ قصائد پر انکو کم و بیش صلے اور خلعت و انعام بھی ملتے رہے؛ مرحوم بہادر شاہ نے بھی اپنی حیثیت کے موافق انکی خاصی قدر کی؛ ریاست رامپور سے انکے لیے اخیر دم تک معقول وظیفہ جاری رہا؛ یہ سب کچھ ہوا؛ مگر جب مرزا کے اس اعلیٰ مرتبے کا جو شاعری و انشا پردازی میں فی الواقع انھوں نے حاصل کیا تھا۔ ٹھیک اندازہ کیا جاتا ہے تو ناچار یہ کہنا پڑتا ہے کہ زمانے کی یہ تمام قدر دانی زیادہ سے زیادہ اُس پیر زل کی سی قدر دانی تھی جو ایک ثنوت کی

۱
 عسکر محمد حیدر
 جلد (۳) (۷) = ۱۰۰/۱۰۰
 ۱۰۰/۱۰۰

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دیباچہ

تیرہویں صدی ہجری میں جبکہ مسلمانوں کا تشریل درجہ غایت کو پہنچ چکا تھا اور انکی دولت باعزت اور حکومت کے
 ساتھ علم و فضل اور کمالات بھی رخصت ہو چکے تھے؛ حسن اتفاق سے دار الخلافہ دہلی میں چند اہل کمال ایسے
 جمع ہو گئے تھے جنکی صحبتیں اور جلسے عہد اکبری و شاہجہانی کی صحبتوں اور جلسوں کو یاد دلاتی تھیں؛ انہیں
 سے بعض کی نسبت مرزا غالب مرعوم فرماتے ہیں

ہند را خوش نفسانند سخنور کہ بود باد در خلوت شان مشک فشان از دم شان

مومن و تیر و شہبائی و علوی و انکاد حسرتی اشرف و آزرده بود اعظم شان

اگرچہ جس زمانے میں کہ پہلی ہی بار راقم کا دلی جانا ہوا اس باغ میں پت جھڑ شروع ہو گئی تھی کچھ لوگ
 دلی سے باہر چلے گئے تھے اور کچھ دنیا سے رخصت ہو چکے تھے؛ مگر جو باقی تھے اور جنکے دیکھنے کا مجھ کو ہریشہ فخر
 رہیگا وہ بھی ایسے تھے کہ نہ صرف دلی سے بلکہ ہندوستان کی خاک سے پھر کوئی دیا اٹھتا نظر نہیں آتا؛

عالمی نام آور نام و نشانم پیرس * ہجرت اسم للہ و عیالہ



شعبہ انجمن اولیاء الملک خاں از شیرخان با نظام خاں المتخلص بہ عالم مرحوم

یادگارِ غالب

یعنی

جنابِ اسد اللہ خان متخلص غالب دہلوی کی زندگی کے حالات

اور

انکی اقسامِ نظم و نثر اردو و فارسی کا انتخاب ہر ایک قسم پر جدا گانہ یکاں

مرتبہ

خاکسار الطاف حسین حالی بانی پتی

۱۸۹۷ء

محمد رحمت اللہ رحمہ اللہ کے

نامی پریس کالمبوری میں چھپی

حسب مطالبہ رجسٹری کرائی گئی

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۲۱۰-۳۲۹	نثر فارسی کا انتخاب۔	۲۹۶-۲۲۶	مرزا کی رباعیات فارسی۔
۳۱۱-۳۱۳	نثر فارسی کا مقابلہ ظہوری کی	۲۹۶-۳۲۲	مرزا کے قصائد فارسی پر بیاں
	نثر کے ساتھ		اور ان کے نمونے
	شیخ علی حزیں اور مرزا کی	۳۲۳-۳۲۵	قطعات فارسی۔
۳۱۴-۳۱۵	نثر کا مقابلہ		مرزا کے ترکیب بند کا نظیری کے
	مرزا اور ابوالفضل کی نثر	۳۲۶-۳۲۷	ترکیب بند سے مقابلہ
۳۱۶-۳۱۹	کا مقابلہ	۳۲۷-۳۲۸	مرزا کی فارسی شہنوی کا نمونہ۔
۳۲۰-۳۲۸	خاتمہ۔	۳۲۸-۳۲۹	نثر فارسی پر بیاں رک۔

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۹۰	مرزا کا سابقہ استعداد۔	۹۰	سخن فہموں کی قدر۔
۹۱-۹۳	مرزا کے دیوانِ ریختہ اور انکی	۹۱-۹۳	اپنے عجز کا اقرار۔
۹۳-۹۶	اردو شاعری پر ریویو	۹۳-۹۶	ہجو نہ لکھنا۔
۹۶-۹۸	دیوانِ ریختہ کا انتخاب	۹۶-۹۸	خانگی تعلقات۔
۹۸-۹۹	غزلیات۔	۹۸-۹۹	موت کی آرزو۔
۹۹	قطعات۔	۹۹	اخیر عمر کی حالت۔
۱۰۰-۱۰۱	رباعیات۔	۱۰۰-۱۰۱	مرض الموت کی حالت۔
۱۰۰	نثر اردو پر ریویو اور اسکا	۱۰۰	تاریخ وفات۔
۱۰۱-۱۰۲	انتخاب	۱۰۱-۱۰۲	جنازے کی نماز۔
۱۰۲-۱۰۳	نظم و نثر فارسی پر ریوارک۔	۱۰۲-۱۰۳	شاگردوں کی کثرت۔
۱۰۳-۱۰۴	غزل فارسی پر ریوارک۔	۱۰۳-۱۰۴	سید غلام علی بھٹائی و حشت۔
۱۰۴-۱۰۵	غزلیات فارسی کا انتخاب۔	۱۰۴-۱۰۵	نواب ضیاء الدین احمد خاں۔
۱۰۵-۱۰۶	مرزا کی غزل کا نظریہ کی غزل	۱۰۵-۱۰۶	نواب محمد مصطفیٰ خاں۔
۱۰۶	سے مقابلہ	دوسرا حصہ	
۱۰۶	مرزا کی غزل کا نظوری کی غزل	مرزا کے کلام پر ریویو اور اسکا انتخاب	
۱۰۶	سے مقابلہ	۱۰۶	تمت۔

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۶۸	خودداری۔	۵۸	عروض۔
۶۹	خوفاک۔	۵۹	بخوم۔
۷۱-۶۹	آموں کی رغبت۔	"	تصوؤں۔
۷۲-۷۱	ناؤ نوش کی عبادت۔	"	تاریخ و سیاق و مساحت سے
۷۸-۷۲	مذہب۔	"	اجنبیت
۷۹-۷۸	سلامتی طبع۔	"	خوشحالی۔
۸۲-۷۹	مسئلہ امتناع نظیر خاتم النبیین۔	۵۹	انداز شعر خوانی۔
۸۳-۸۲	داود سخن۔	۶۱-۶۲	اخلاق و عادات و خیالات و
۸۳	انصاف۔	۶۲	اخلاق
۸۴-۸۳	تقریظ لکھنے کا ڈھنگ۔	۶۲-۶۳	مروت۔
۸۴	تقریظ دیوان تفتہ۔	۶۴	فراخ خوشگلی۔
۸۶-۸۴	تقریظ تصحیح آئین الہیری۔	۶۵	حافظہ۔
۸۶-۸۶	محققانہ نظر۔	۶۶-۶۵	شعر فہمی۔
۸۸-۸۶	حق پسندی۔	۶۶	سخن سنجی
۹۰-۸۸	راست گفتاری۔	۶۸-۶۶	کتاب فہمی
۹۰	ما قدر دانی کی شکایت۔		حسن بیان اور طرافت و شوخی۔

فہرست مضامین یادگار غالب



صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۲۸ تا ۲۹	لازمت سرکاری سے انکار۔	۸ تا ۸	بیباپہ
۲۹ - ۳۳	قید ہونے کا واقعہ۔	پہلا حصہ	
۳۳ - ۳۵	قلمہ کا تعلق۔	مرزا کی ہمت	
۳۵	خدمت اصلاح اشعار پادشاہ۔	۹	ریخ ولادت۔
۳۵ - ۳۶	...	۹ - ۱۰	مانران۔
۳۶ - ۳۷	...	۱۰	...
۳۷ - ۳۸	...	۱۱	...
۳۸ - ۳۹	...	۱۲	...
۳۹ - ۴۰	...	۱۳	...
۴۰ - ۴۱	...	۱۴	...
۴۱ - ۴۲	...	۱۵	...
۴۲ - ۴۳	...	۱۶	...
۴۳ - ۴۴	...	۱۷	...
۴۴ - ۴۵	...	۱۸	...
۴۵ - ۴۶	...	۱۹	...
۴۶ - ۴۷	...	۲۰	...
۴۷ - ۴۸	...	۲۱	...
۴۸ - ۴۹	...	۲۲	...
۴۹ - ۵۰	...	۲۳	...
۵۰ - ۵۱	...	۲۴	...
۵۱ - ۵۲	...	۲۵	...
۵۲ - ۵۳	...	۲۶	...
۵۳ - ۵۴	...	۲۷	...
۵۴ - ۵۵	...	۲۸	...
۵۵ - ۵۶	...	۲۹	...
۵۶ - ۵۷	...	۳۰	...
۵۷ - ۵۸	...	۳۱	...
۵۸ - ۵۹	...	۳۲	...
۵۹ - ۶۰	...	۳۳	...
۶۰ - ۶۱	...	۳۴	...
۶۱ - ۶۲	...	۳۵	...
۶۲ - ۶۳	...	۳۶	...
۶۳ - ۶۴	...	۳۷	...
۶۴ - ۶۵	...	۳۸	...
۶۵ - ۶۶	...	۳۹	...
۶۶ - ۶۷	...	۴۰	...
۶۷ - ۶۸	...	۴۱	...
۶۸ - ۶۹	...	۴۲	...
۶۹ - ۷۰	...	۴۳	...
۷۰ - ۷۱	...	۴۴	...
۷۱ - ۷۲	...	۴۵	...
۷۲ - ۷۳	...	۴۶	...
۷۳ - ۷۴	...	۴۷	...
۷۴ - ۷۵	...	۴۸	...
۷۵ - ۷۶	...	۴۹	...
۷۶ - ۷۷	...	۵۰	...
۷۷ - ۷۸	...	۵۱	...
۷۸ - ۷۹	...	۵۲	...
۷۹ - ۸۰	...	۵۳	...
۸۰ - ۸۱	...	۵۴	...
۸۱ - ۸۲	...	۵۵	...
۸۲ - ۸۳	...	۵۶	...
۸۳ - ۸۴	...	۵۷	...
۸۴ - ۸۵	...	۵۸	...
۸۵ - ۸۶	...	۵۹	...
۸۶ - ۸۷	...	۶۰	...
۸۷ - ۸۸	...	۶۱	...
۸۸ - ۸۹	...	۶۲	...
۸۹ - ۹۰	...	۶۳	...
۹۰ - ۹۱	...	۶۴	...
۹۱ - ۹۲	...	۶۵	...
۹۲ - ۹۳	...	۶۶	...
۹۳ - ۹۴	...	۶۷	...
۹۴ - ۹۵	...	۶۸	...
۹۵ - ۹۶	...	۶۹	...
۹۶ - ۹۷	...	۷۰	...
۹۷ - ۹۸	...	۷۱	...
۹۸ - ۹۹	...	۷۲	...
۹۹ - ۱۰۰	...	۷۳	...

یادگارِ غالب

یعنی

امیرِ اسد اللہ خان تنخواہیج غالب دہلوی کی زندگی کے حالات

اور

ای اقسامِ نظم و نثر اردو و فارسی کا انتخاب ہر ایک شہر پرچہ گانہ یارکس

مرتبہ

خاکسارِ لطافت حسین حالی یابی پتی

۱۸۹۶ء

مہینہ انتہی بعد کے

نامی پریس کلچر میں چھپی

مب شاہد رجسٹر فی لوانی

حیدر
عظیم
از ۱۳۱۰
خندہ

